اطرافِ اقبالؒ

ملک حسن اختر
ایم اے

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس سوئیوالان دہلی ۶

بار اوّل ـــــــ جولائی ۱۹۷۶ء

تعداد ـــــــ دو سَو ۲۰۰

زیر نگرانی ـــــــ اعتقاد حسین صدیقی

طباعت ـــــــ محمد وسعلی لیتھو پریس دہلی ۶

قیمت ـــــــ بیس روپے ۲۰/-

ناشر:- اعتقاد پبلشنگ ہاؤس۔ سوئیوالان۔ دہلی ۶

امّی اور ابّا کے نام

جن کے فیضانِ نظر نے
مجھے اس قابل بنایا

ترتیب

پیش لفظ

اقبال بہت بڑا شاعر ہے اور اس کی بڑائی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اردو ادب کو تقریباً ہر پہلو سے متاثر کیا ہے۔ اقبال کے مخالف بھی اس کے اثر سے بچ نہیں سکے اور ان کے انکار میں بھی اقرار کا پہلو موجود ہے۔ اقبال کی شہرت کا آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہوا اور یہ اس وقت سے برابر بڑھتی رہی ہے۔ اس وقت جب کہ اس صدی کا تین چوتھائی حصہ گزرنے کو ہے۔ اس کی شہرت کا خورشید پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ ہی گزرا ہے کہ اردو ناول کے سخت گیر نقاد ڈاکٹر احسن فاروقی نے ناول نگاروں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اقبال کو روشنی کا مینار سمجھ کر اپنے سفر کا آغاز کریں اور اس کی بتائی ہوئی راہ کو اپنائیں۔

اقبال لان جائی نس کے تعمیر کردہ رفعت کے مینار پر جلوہ گر ہے۔ لان جائی نس نے عظیم ادب کی پہچان یہ بتائی تھی کہ وہ مسرت پہنچائے اور سب کو مسرت پہنچانے کا۔ عظیم ادب ہر زمانے کے ذہین قاری کے لیے مسرت کا باعث ہوتا ہے اور وہ اسے پڑھ کر وجد میں آجاتا ہے۔ اقبال کی شاعری عظمت کے اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ اس میں بے شمار امکانات پوشیدہ ہیں۔ اس کے اندر یہ

نادیدہ پھول ہیں جن کو آئندہ زمانے کے قاری اپنے دامن کی زینت بنائیں گے۔ یہ پھول کھلتے رہیں گے اور اقبال کی شاعری خزاں ناآشنا رہے گی۔ اس میں پوشیدہ نغمے ہمیشہ روح کی غذا بنتے رہیں گے۔

ہم نے اقبال کی شاعری کو ایک مخصوص زاویہ نظر سے دیکھا ہے اور آئندہ زمانہ کا نقاد ان کو اپنے عصری تقاضوں کی روشنی میں دیکھے گا مگر اس میں پوشیدہ لازوال مسرت سے حظ اٹھائے بغیر نہ رہ سکے گا۔ اقبال ہمیں کبھی دھوکا نہیں دیتے۔ ماضی اور حال میں وہ انسان کا سہارا رہے ہیں اور مستقبل میں بھی وہ انسانیت کو اس کی حقیقی منزل سے آشنا کرتے رہیں گے۔ عظیم ادب بڑا پہلودار ہوتا ہے اس میں ہر زمانے کی جدت وندرت کے انداز موجود ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری پر قلم اٹھانے کی گنجائش ہر وقت موجود رہتی ہے اور اسی لئے اقبال کے فکر و فن پر بہت سی کتابیں موجود ہونے کے باوجود میں نے ایک اور کتاب پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ اس کتاب میں سترہ عنوانات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور اس طرح امید ہے کہ اقبال کی شاعری اور زندگی کے اہم پہلو نظر آجائیں گے۔ پانچ مضامین اقبال کی نظموں کے مطالعہ کے لئے وقف کئے گئے ہیں تاکہ طلباء کے لئے کتاب زیادہ مفید ثابت ہو سکے۔ آخر میں اقبال کے متعلق مشاہیر کے اقوال بھی ایک الگ باب میں نقل کر دیئے گئے ہیں۔ کتاب کے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہوں گا۔ عطر وہ نہیں جس کی تعریف عطار کرے بلکہ وہ ہے جو اپنی خوشبو سے پہچانا جائے۔

ہو سکتا ہے اس کتاب کی اشاعت ابھی کچھ دیر اور التوا میں پڑی رہتی مگر

چودھری بشیر احمد ڈائرکٹر مکتبہ میری لائبریری کی اقبال پسندی مجھے اکساتی رہی کہ کتاب کو جلد از جلد مکمل کروں۔ اس لیے ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ میں سید عبدالباقی صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ وہ ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔

اساتذہ کرام ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر وحید قریشی کا شکر گذار ہوں کہ وہ مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔

مجھے افسوس ہے کہ اپنے دوست محمد خان اشرف کی تنقیدی آرا سے محروم رہا۔ کیونکہ وہ اس کتاب کی تالیف کے دوران ایک حادثے کا شکار ہو کر شکن بستر بنے رہے۔

سلیم بیتاب اور ریاض احمد ریاض کا شکریہ ادا کئے بغیر چارہ نہیں اگرچہ وہ تمام کوشش کے باوجود اس کتاب کے لئے کوئی موزوں نام تجویز نہ کر سکے۔ اور یہ کام مجھے ہی کرنا پڑا۔

ملک حسن اختر

یکم اکتوبر ۱۹۶۹ء

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

(اقبالؔ)

مختصر حالاتِ زندگی

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزلخواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا (فیض)

علامہ اقبالؔ کے مستند حالاتِ زندگی کسی ایک کتاب میں نہیں ملتے اس لئے طلبہ کی سہولت کے لئے ان کے مختصر حالاتِ زندگی اس کتاب میں شامل کئے جا رہے ہیں۔ ان کا نام شیخ محمد اقبال اور اقبال تخلص تھا۔ وہ ایک کشمیری گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جس نے پندرھویں صدی عیسوی میں اسلام قبول کیا تھا اس سے پہلے ان کے آبا و اجداد برہمن تھے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو برہمن زادہ کہہ کر پکارتے

ہیں وہ

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی ‏ ‏ ‏ ‏ برہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریز است

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند ‏ ‏ ‏ ‏ جز برہمن پسرے محرم اسرار کجاست

میں اصل کا خاص سومناتی ‏ ‏ ‏ ‏ آبا مرے لاتی و مناتی!

اقبالؒ کے والد کا نام شیخ نور محمد عرف نتھو ولد شیخ محمد رفیق تھا۔ وہ سیالکوٹ میں کپڑے کی ٹوپیاں اور کلاہ بنانے کا کاروبار کرتے تھے۔ اقبال سیالکوٹ میں ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے[1]۔ پانچ چھ برس کی عمر میں آپ کو مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ سوا نو برس کی عمر میں اسکول میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۳ء میں سوا انیس برس کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت میٹرک کا سینٹر سیالکوٹ میں نہیں تھا۔ اس لئے آپ امتحان دینے کے لئے گجرات گئے۔ وہاں کے سول سرجن خان بہادر عطا محمد صاحب نے ان کو دیکھا تو پسند فرمایا اور اپنی لڑکی کی شادی ان سے کر دی۔ اس بیوی سے ان کے دو بچے ہوئے ایک معراج بیگم اور دوسرے آفتاب اقبال، میٹرک کے بعد وہ سکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے۔ اس وقت اس کالج میں مولانا میر حسن بھی استاد تھے۔ جنہوں نے اقبال کو بہت متاثر کیا۔ ایف اے کرنے کے

---

[1] اقبال درون خانہ کے مصنف خالد نظیر صوفی نے میونسپلٹی کے ریکارڈ سے علامہ کی یہ تاریخ پیدائش دریافت کی ہے اور یہی درست ہے تفصیل کیلئے ان کی کتاب کے ۵۳ تا ۱۶۳ صفحات ملاحظہ کریں۔

بعد انھوں نے بی اے کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ۱۸۹۷ء میں بی اے کا امتحان درجہ دوم میں پاس کیا اور ایم۔ اے (فلسفہ) میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت یہاں پروفیسر آرنلڈ فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ اقبال ان کے علم و دانش سے بہت متاثر ہوئے اور آرنلڈ کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم ہو گئے۔ چنانچہ جب آرنلڈ انگلستان روانہ ہوئے تو اسی تعلق خاطر نے ان سے "نالۂ فراق" جیسی نظم لکھوائی۔ اقبال نے ۱۸۹۹ء میں[1] ایم اے کا امتحان تیسرے درجے میں پاس کیا مگر واحد کامیاب امیدوار کی حیثیت سے طلائی تمغہ انھیں ہی ملا۔[2] اس سے پہلے وہ بی اے کے طالب علم تھے تو شاعری کا آغاز اور ایک مشاعرے میں ارشد گورگانی سے اس شعر پر داد بھی حاصل کی تھی۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اس کے بعد انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں نظمیں پڑھنا شروع کیں جن سے ان کی شہرت کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کی پہلی نظم جو انجمن کے جلسہ ۱۸۹۹ء میں پڑھی گئی وہ "نالۂ یتیم" ہے۔ شروع شروع میں علامہ داغ دہلوی کو اپنا کلام اصلاح کے لئے بھجوایا کرتے تھے مگر بہت جلد داغ نے لکھا کہ اب انھیں اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔

ایم اے کرنے کے بعد علامہ اقبال ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو اورینٹل کالج میں میکلوڈ

---

[1] اس وقت ایم اے کا نصاب ایک سال کا تھا۔ معلوم نہیں ۱۸۹۸ء میں علامہ نے امتحان دیا یا نہیں۔

[2] ادب کا کلاسیکی مطالعہ از ڈاکٹر وحید قریشی صفحہ ۳۲۔

عربک ریڈر مقرر ہوئے۔ اس عہدہ پر وہ ۱۹۰۳ء تک کام کرتے رہے مگر اس دوران میں رخصت لے کر تھوڑی تھوڑی مدت کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور اور اسلامیہ کالج لاہور میں استاد کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ اورینٹل کالج کی ملازمت چھوڑنے کے بعد وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے مگر ۱۹۰۵ء میں تین سال کی تعلیمی رخصت لے کر انگلستان روانہ ہو گئے۔ لیکن رخصت ختم ہونے پر وہاں سے استعفیٰ بھیج دیا۔

یورپ کے دوران قیام میں اقبال نے ارادہ کیا کہ وہ شاعری کو ترک کر دیں مگر سر عبدالقادر کے کہنے اور پروفیسر آرنلڈ کی تائید سے وہ اس خیال سے باز رہے یہاں انھوں نے کیمبرج میں تعلیم پائی اور فلسفہ اخلاق کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۷ء[1] میں جرمنی کی ایک یونیورسٹی میونک نے ان کی کتاب "ایران میں فلسفۂ الٰہیات کا ارتقا The development of meta physics in Persia" پر ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دی۔ لندن میں انھوں نے قانون کا امتحان پاس کیا اور کچھ عرصہ پولیٹیکل سائنس اور معاشیات کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو وہ لاہور میں واپس آ گئے اور ۱۹۰۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے عارضی پروفیسر مقرر ہوئے مگر ساتھ ہی بطور ایڈوکیٹ بھی کام کرتے رہے۔ ان کی خاطر ہائی کورٹ کے ججوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ ان سے متعلق مقدمے پچھلے پہر سنا کریں تاکہ وہ کالج میں بھی اپنے فرائض

---

[1] اب تک ۱۹۰۸ء مشہور تھا مگر روزگار فقیر جلد دوم میں فقیر وحیدالدین نے ڈگری کا عکس شائع کر دیا ہے جس پر ۱۹۰۷ء درج ہے۔

ادا کر سکیں۔ ۱۹۱۱ء تک وہ گورنمنٹ کالج میں کام کرتے رہے اس کے بعد انھوں نے یہ نوکری چھوڑ دی۔ آپ کے نوکر علی بخش کا بیان ہے کہ جس دن وہ استعفی دے کر آئے میں نے پوچھا شیخ صاحب آپ نے نوکری کیوں چھوڑ دی تو کہنے لگے علی بخش! انگریز کی ملازمت میں بڑی مشکلیں ہیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ میرے دل میں کچھ باتیں ہیں جنہیں میں لوگوں تک پہونچانا چاہتا ہوں مگر انگریز کا نوکر رہ کر انھیں کھلم کھلا نہیں کہہ سکتا۔ اب میں بالکل آزاد ہوں جو چاہوں کروں اور جو چاہوں کہوں۔ شاید یہ پھانس جو مدت سے میرے دل میں کھٹکتی ہے نکل جائے "۔ لہ

سرکاری ملازمت ترک کرنے کے بعد آپ بیرسٹری کرتے رہے لیکن اس کام سے بھی کافی آمدنی ہو سکتی تھی مگر وہ اس طرف پوری توجہ نہ دیتے تھے۔ ایک بار انھیں پٹنہ میں عدالت کے سامنے ایک متنازعہ لفظ کے بارے میں رائے دینے کے لئے بلایا گیا اور ایک ہزار روپیہ روزانہ فیس طے کی گئی۔ ان سے کہا گیا کہ وہ کیس کا مطالعہ کرنے کے لئے دو ماہ تک قیام کر سکتے ہیں۔ لیکن انھوں نے خیال کیا کہ صرف روپیہ کی خاطر ان کا ٹھہرنا دیانت داری کے خلاف ہوگا کیونکہ وہ عدالت میں پیش ہونے کے لئے تیار تھے چنانچہ دوسرے ہی دن وہ اپنا بیان دے کر لاہور روانہ ہو گئے۔ لہ
اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے وکالت کے فرائض کی ادائیگی میں بھی کس قدر ایماندار تھے۔ ۱۹۲۲ء میں ان کو ادبی خدمات کی وجہ سے سر کا خطاب

لہ سیرت اقبال از محمد طاہر فاروقی صفحہ ۳۲

لہ The poet of The East By A. Ammeyugy, Page 24.

دیا گیا۔ اس پر بعض حلقوں نے بڑی نکتہ چینی کی مگر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انھوں نے کبھی اس کی خواہش نہ کی تھی اور وہ اس کے بعد بھی پہلے کی طرح آزادی کے علمبردار رہے اور یہ خطاب قبول کرنے کے لئے انھوں نے یہ شرط عائد کر دی کہ ان کے استاد علامہ میر حسن کو بھی شمس العلماء کا خطاب دیا جائے۔

اگرچہ علامہ شروع ہی سے ہندوستان کی سیاست میں دلچسپی لیتے رہے ہیں مگر ۱۹۲۶ء کے بعد آپ نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا اور اسی سال پنجاب مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہو گئے۔ علامہ نے اسمبلی میں مسلمانوں اور غریبوں کے لئے بڑا کام کیا۔ ۱۹۲۷ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی آئندہ آئینی اصلاحات کے لئے سائمن کمیشن کا اعلان کیا تو اس میں کوئی ہندوستانی ممبر نہ تھا۔ کیونکہ وزیر ہند کی رائے میں ہندوستان میں فرقہ وارانہ اختلافات کی وجہ سے ایسا ممکن نہ تھا اگرچہ اس معاملے میں حکومت برطانیہ حق بجانب تھی مگر کانگرس نے کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا۔ مگر علامہ اقبال نے اعلان کیا کہ "کمیشن کا بائیکاٹ کرنے سے مسلمان تباہ ہو جائیں گے"[۱] اسی زمانے میں قائد اعظم نے مسلمان نشستوں کی اسمبلیوں میں تحفظ کے ساتھ مخلوط انتخاب کے طریقہ کو منظور کر لیا تو مسلم لیگ دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک کے صدر محمد علی جناح اور سکریٹری ڈاکٹر کچلو تھے اور دوسری کے سر محمد شفیع صدر اور علامہ اقبال سکریٹری تھے۔ کیونکہ علامہ اقبال اور سر محمد شفیع جداگانہ طریقہ انتخاب ہی چاہتے تھے۔ کانگرس نے اگرچہ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ

---

[۱] پیسہ اخبار۔ ۱۵ ر دسمبر ۱۹۲۷ء

کیا تھا مگر اس نے آئینی تجاویز کے لئے نہرو کمیٹی بنا دی جس نے نہرو رپورٹ تیار کی جس کے بعض حصوں سے قائداعظم کو اختلاف تھا۔ قائداعظم کی تمام تر کوششوں کے باوجود نہرو رپورٹ میں ان کی ترمیمات شامل نہ کی گئیں۔ تو وہ کانگرس سے بہت بدظن ہوئے۔ اس وقت علامہ اقبال اور دوسرے حضرات کی کوشش سے ۱۹۲۹ء میں ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی۔ اس کے صدر آغا خاں تھے اور اس میں علامہ اقبال، سر محمد شفیع، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مفتی کفایت اللہ سر ابراہیم رحمت اللہ، سر عبدالقادر، اسمبلیوں کے ممبر اور بہت سے دوسرے اصحاب شریک ہوئے اور متفقہ طور ایک قرارداد منظور کی گئی جس کو بنیاد بنا کر بعد میں قائداعظم نے اپنے چودہ نکات مرتب کئے۔ اس کے بعد دونوں مسلم لیگیں پھر ایک ہو گئیں اور سنہ ۱۹۳۰ء کے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے لئے علامہ اقبال کو صدر منتخب کیا گیا۔ یہ اجلاس الہ آباد میں منعقد ہوا اور اسی تاریخی اجلاس میں علامہ نے پاکستان کا تصور پیش کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا۔

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خوداختیاری حاصل کرے یا باہر رہ کر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔"

سنہ ۱۹۳۱ء میں علامہ اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان گئے اور واپسی پر فلسطین میں مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کی جس میں مسلمانان ہند

کے نمائندے کی حیثیت سے مدعو تھے۔ ۱۹۳۲ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کی صدارت کے لئے دوبارہ علامہ اقبال کو چنا گیا۔ اور اس کانفرنس میں مسلمانوں کے حقوق و مطالبات کے متعلق قرار دادیں منظور کی گئیں۔ علامہ اقبال نے اپنی صدارتی تقریر میں کانگرس اور حکومت برطانیہ دونوں کو ہدف تنقید بنایا اور کہا کہ مسلمانوں کو حکومت پر اعتماد کی پالیسی ترک کر دینی چاہئے۔ ۱۹۳۲ء کے اواخر میں علامہ تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان تشریف لے گئے۔ اور واپسی پر پیرس آئے جہاں انھوں نے برگساں سے ملاقات کی۔ اس کے بعد آپ ہسپانیہ آئے جہاں انھوں نے میڈرڈ یونیورسٹی میں "عالم اسلام کا ذہنی ارتقا" کے موضوع پر لیکچر دیا اور یہیں اپنی مشہور نظم "مسجد قرطبہ" بھی کہی۔ یہاں سے اٹلی ہوتے ہوئے علامہ واپس ہندوستان آگئے۔ ۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ افغانستان کی دعوت پر افغانستان تشریف لے گئے۔ یہاں سے وہ قندھار اور غزنی بھی گئے۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک مسلم لیگ زندگی سے محروم رہی اور قائد اعظم ملک سے باہر چلے گئے۔ اس دوران میں مسلم کانفرنس ہی مسلمانوں کی نمائندگی کرتی رہی جس کے صدر علامہ اقبال تھے۔ ۱۹۳۵ء میں وہ پنجاب مسلم لیگ کے صدر چنے گئے اس وقت قائد اعظم آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر تھے اور ہندوستان واپس آچکے تھے۔ اس کے بعد علامہ کی صحت بہت زیادہ خراب رہنے لگی۔ جس کی وجہ سے ان کا عملی سیاست میں حصہ کم ہوتا چلا گیا مگر بستر علالت پر بھی وہ مسلمانوں کی بہتری کے خیال سے غافل نہ ہوئے اور اپنے خطوط میں قائد اعظم کو مفید مشورے دیتے رہے۔ وہ اپنے ایک خط میں جو ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو لکھا گیا۔ قائد اعظم کو مشورہ دیتے ہیں کہ مسلم لیگ کو عام مسلمانوں کی جماعت بنانا

چاہیئے۔

"لیگ کو بالآخر یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ آیا وہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے اونچے طبقے کی نمائندہ بن کر رہے گی یا ایسے عام مسلمانوں کی جماعت بنے گی جنہوں نے ابھی تک معقول وجہ کی بنا پر اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ شخصی طور پر میں یقین کرتا ہوں کہ وہ سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی بہتری کے لیئے کوشاں نہ ہو۔ عوام کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی"

اپنے ایک اور خط میں قائدِ اعظم کی قائدانہ صلاحیتوں کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"آج ہندوستان میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کی ذات سے مسلمان قوم اس طوفانِ بلا میں صحیح و محفوظ رہنمائی کی توقع رکھ سکتی ہے جو شمال مغربی ہندوستان بلکہ شاید پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے۔"

اور قائدِ اعظم بھی ان کی خدمات کے معترف تھے چنانچہ وہ لیٹرز ٹو جناح کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ مسلم لیگ کا بڑا کارنامہ تھا کہ اس کی قیادت کو مسلم اکثریت اور اقلیت کے صوبوں نے تسلیم کر لیا تھا۔ سر محمد اقبال نے لیگ کو اس منزل تک پہونچانے میں بہت ہی نمایاں حصّہ لیا تھا۔ اگرچہ ان کا یہ کارنامہ عوام کے سامنے اس وقت نہ آسکا تھا"

اور اپنے پیغامِ تعزیت میں لکھتے ہیں۔

"میرے لیے انکی حیثیت ایک دوست، رہنما اور فلسفی کی تھی مسلم لیگ پر انتہائی مصیبت کے وقت بھی وہ ایک مضبوط ستون کی طرح اپنی جگہ جمے رہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی ان کے قدم نہ ڈگمگائے۔"

آخری عمر میں ریاست بھوپال سے ان کا وظیفہ مقرر ہو گیا تھا جو ان کی وفات کے بعد ان کے بچوں کے نام منتقل ہو گیا۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اس مرد قلندر نے اس جہانِ فانی کو خیرباد کہا اور اللہ کے ابدی دربار میں حاضر ہو گیا۔ رحلت کے وقت ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور ان کا یہ شعر ان پر پوری طرح صادق آرہا تھا۔

نشانِ مردِ مومن باتو گویم

چوں مرگ آید تبسم برلب اوست [1]

راجہ حسن اختر کا بیان ہے کہ اقبال نے وفات سے دس منٹ قبل حسب ذیل قطعہ پڑھ کر آخری وقت کے آجانے کا اعلان کیا تھا۔

سرودِ [2] رفتہ باز آید نہ آید نسیمے از حجاز آید نہ آید

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید نہ آید

مگر "اقبال۔ درون خانہ" کے مصنف نے اس واقعہ کو ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب کے حوالے سے غلط قرار دیا ہے جو آخری وقت علامہ کے پاس تھے اسی کتاب میں اس بات کی بھی تردید کی گئی ہے کہ علامہ اقبال شراب پیتے تھے یا طوائفوں کے ہاں جاتے تھے۔ یہ بات یوں بھی غلط معلوم ہوتی ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری اس بات کی غماز ہے کہ انہیں ان باتوں

---

[1] سیرتِ اقبال از محمد طاہر فاروقی ص۱۵۱۔

[2] سرود کی بجائے اصل میں سرور ہے (ملاحظہ ہو......)

سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کے والدین مذہب پرست تھے اس لئے ان کے زیرِ سایہ تربیت پانے والا بچہ شراب اور طوائف کا رسیا نہیں ہو سکتا پھر ان کو استاد بھی ایسے ہی ملے۔ لہٰذا شراب، اور طوائف سے ان کا تعلق انہیں بدنام کرنے کے لئے گھڑا گیا ہے۔

عبدالمجید سالک نے ذکرِ اقبال میں لکھا ہے کہ والدہ جاوید وکٹوریہ گرلز اسکول کی طالبہ تھیں۔ درونِ خانہ کے مصنف نے اس بات کو بھی غلط قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ والدہ جاوید گھر پر صرف قرآن اور معمولی اردو پڑھی ہوئی تھیں، اور صحیح طرح لکھ بھی نہ سکتی تھیں۔ ان سے جاوید اقبال اور منیرہ بانو پیدا ہوئے۔ جب اقبال انگلستان سے واپس آئے تو ان کا نکاح والدہ جاوید سے ہو گیا مگر علامہ ان سے بدظن ہو گئے اس لئے رخصتی نہ ہو سکی اور علامہ نے تیسری شادی لدھیانے میں کر لی۔ بعد ازاں شکوک رفع ہو گئے تو والدہ جاوید بھی علامہ کے گھر آ گئیں۔ لدھیانے والی بیگم کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی اور وہ بے اولاد ۱۹۲۳ء میں چل بسیں۔ علامہ کو ان کی وفات کا بے حد کھو دیا۔ والدہ جاوید بھی علامہ کی زندگی میں ہی ۱۹۳۵ء میں انتقال کر گئیں۔

تصانیف:

علم الاقتصاد (اردو ۱۹۰۳ء) ۲۔ ایران میں فلسفہ الٰہیات کا ارتقاء (انگریزی اشاعت ۱۹۰۸ء) ۳۔ ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر (انگریزی) ۴۔ اسرارِ خودی (فارسی اشاعت ۱۹۱۵ء) ۵۔ رموزِ بے خودی (فارسی۔ اشاعت ۱۹۱۸ء) ۶۔ بانگِ درا (اردو۔ اشاعت ۱۹۲۴ء) ۷۔ پیامِ مشرق (فارسی۔ اشاعت ۱۹۲۲ء) ۸۔ زبورِ عجم فارسی اشاعت ۱۹۲۷ء ۹۔ جاوید نامہ (فارسی) اشاعت ۱۹۳۲ء ۱۰۔ چھ خطبات اسلامی الہیات کی تشکیلِ جدید (انگریزی) ۱۱۔ بالِ جبریل (اردو اشاعت ۱۹۳۵ء) ۱۲۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق مع مسافر فارسی اشاعت ۱۹۳۶ء ۱۳۔ ضربِ کلیم

اردو اشاعت سنہ ۱۹۳۶ء ۱۴- ارمغانِ حجاز (فارسی - اردو) اشاعت سنہ ۱۹۳۸ء ۱۵- تاریخِ عالم (جرمن - غیر مطبوعہ) ۱۶- تاریخ ہند (اردو سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء میں مڈل جماعتوں میں پڑھائی جاتی تھی) ان کے علاوہ مضامینِ اقبال، حرفِ اقبال، خطباتِ اقبال، سپیچز اینڈ سٹیٹمنٹس آف اقبال اور خطوطِ اقبال کے مختلف مجموعے بھی شائع کیے گئے ہیں۔

علامہ اقبال میرے نزدیک ہندوستان کے ہی نہیں بلکہ دنیا کے عظیم ترین شاعر ہیں۔ ان جیسا فلسفیانہ تفکر، پیرایۂ اظہار اور مذہبی جوش شاید ہی کسی اور شاعر میں ہو۔ وہ بجا طور پر اسلامی دنیا کے قومی شاعر کہلانے کے مستحق ہیں مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ آج انہیں ایک مخصوص علاقے سے متعلق کیا جا رہا ہے جب کہ وہ علاقائیت کے ہمیشہ دشمن رہے ہیں۔ پاکستان میں یومِ اقبال کی سرکاری تعطیل صرف پنجاب میں ہوتی ہے۔ جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اقبال پورے پاکستان کے نہیں بلکہ صرف پنجاب کے شاعر ہیں۔ قائدِ اعظم نے ان کے وجود کو اتنا قیمتی جانا تھا کہ وہ اسلامی ریاست اور اقبال کی تصانیف میں سے مؤخر الذکر کو زیادہ قیمتی سمجھتے تھے۔[1] افسوس اس بات کا ہے کہ جن کو قائدِ اعظم نے عزیز جانا ہم نے ان کو نظر انداز کر دیا اور شاید اسی لیے آج ہمارا حال ابتر ہے۔

اقبال ایک عظیم شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اقبال نے عمل کی تعلیم دی مگر خود بے عملی کا شکار رہے، ایک بہت بڑے مغالطے میں مبتلا ہیں یا پھر جان بوجھ کر اقبال کی شخصیت کو گھٹانے کی کوشش کر رہے

---

[1] اقبال از عطیہ ص ۳

ہیں۔ علامہ کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ انھوں نے زندگی کی عملی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا اور جب ضرورت محسوس کی تو سیاست کے خارزار میں اتر گئے۔ شاید یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ شاعر عملی آدمی نہیں ہو سکتا وہ تو خواب کے جزیروں کا باسی ہوتا ہے۔ مگر علامہ کی ذات میں خدا نے خواب دیکھنے والی اور عمل کرنے والی دونوں قوتوں کو یک جا کر دیا تھا انھوں نے خود اس طرف اشارہ کیا ہے[1]

"میں دو شخصیتوں کا مجموعہ ہوں۔ ظاہری شخصیت کاروباری عملی ہے اور باطنی شخصیت خواب دیکھنے والے فلسفی اور صوفی کی ہے۔"

اقبال کو مسلمانانِ عالم سے عموماً اور ہندی مسلمانوں سے خصوصاً بڑی دلچسپی تھی یہی وجہ ہے کہ وہ ان کی آزادی کا خواب دیکھتے رہے اور ان کے علیحدہ وطن (پاکستان) کا تصور پیش کیا جس کی تعبیر ۱۹۴۷ء میں ہو گئی۔ وہ بڑے دوربین تھے اور ان کی پیشین گوئیاں) درست ثابت ہوئی ہیں۔ انھوں نے قائدِ اعظم کی ذات میں مسلمانوں کا حقیقی لیڈر دریافت کیا اور انھیں خط لکھ کر مجبور کیا کہ وہ مسلمانوں کی باگ ڈور کو سنبھالیں کیونکہ علامہ کی نظر میں ان کے سوا کوئی اور اسلامیانِ ہند کی کشتی کو کنارے پر نہیں لے جا سکتا تھا۔

علامہ اقبال باوجود اس کے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور انھوں نے یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی تھی سادہ لباس استعمال کرتے تھے اور سادگی سے رہتے تھے جس نے انھیں پہلے نہ دیکھا ہو انھیں پہلی بار دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال یہی ہیں۔ وہ راست گفتار تھے اور مذہب سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ عشقِ رسول سے سرشار تھے اور خدا کے وجود کو محسوس کرتے تھے۔ ایک بار ممتاز حسن صاحب

---

[1] اقبال از عطیہ ص۲

نے ان سے سوال کیا۔

"حیرت ہے کہ آپ اتنے بڑے مفکر اور فلسفی ہیں پھر آپ کے لئے کیس طرح ممکن ہے کہ خدا کے وجود پر عقلی دلیل لانے کی بجائے خوش اعتقادی کے ساتھ ذکر کریں" علامہ نے جواب دیا۔

"خدا کے متعلق پوچھتے ہو؟ میں نے اسے دیکھا ہے"

پھر مسکرائے اور تھوڑے توقف کے بعد مزید فرمایا "انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب وہ خدا کو محسوس Experience کر سکتا ہے لیکن یہ لمحے کم نصیب ہوتے ہیں"۔ پھر کہا "بہت ہی کم" اس پر ممتاز حسن صاحب نے دریافت کیا "کیا ہر شخص کے لئے خدا کا مشاہدہ ممکن ہے"۔؟ علامہ نے جواب دیا "یہ دروازہ کسی پر بند نہیں ہے۔ لیکن جو شخص اس مشاہدے کا طالب ہو اسے صبر اور انتظار کرنا چاہئے"[1]

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مرتبہ کس قدر بلند تھا اور انھوں نے کتنے روحانی منازل طے کر لئے تھے۔ انھوں نے عطیہ کے نام ایک خط میں اپنے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا تھا۔ وہ بھی حرف بحرف پورے ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں[2]

"اگر کبھی میری روح کے عمیق ترین خیالات پبلک پر ظاہر ہو جائیں اگر وہ باتیں جو میرے دل میں پوشیدہ ہیں کبھی سامنے آ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ دنیا میرے انتقال کے بعد ایک نہ ایک دن بالضرور میری پرستش کرے گی۔ وہ میری کوتاہیوں کو بھلا دے گی۔ اور آنسوؤں کی شکل

---

[1] روزگار فقیر از فقیر وحید الدین صفحہ ۹۰ [2] اقبال از عطیہ

میں خراجِ تحسین ادا کرے گی"

یہ خط ۷ار جولائی ۱۹۰۹ء کو لکھا گیا ۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک علامہ کے دل میں پوشیدہ باتیں پوری طرح ظاہر نہ ہو پائی تھیں ۔ بعدازاں ان کی شاعری کے ذریعہ ان کی روح کے عمیق ترین خیالات لوگوں پر ظاہر ہوتے اور دنیا نے ان کی پرستش شروع کر دی۔ ان کی وفات کے بعد سے اب تک بے شمار کتابیں ان پر تحریر ہوئی ہیں اور ہر سال یومِ اقبال پر ملک کے اخبارات و رسائل خصوصی نمبر شائع کر رہے ہیں ۔ ان کو عظیم لوگوں اور عوام دونوں نے خراجِ تحسین پیش کیا ہے اس کی ایک ہلکی سی جھلک آپ کو "زبانِ خلق" کے عنوان کے تحت نظر آئے گی ۔

شاعرِ رنگیں نوا

جمیل تر ہے گل و لالہ فیض سے اسکے
نگاہِ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادو

اقبال کے متعلق اب بھی یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ وہ فلسفی ہے یا شاعر؟ بعض لوگ اس کی حکمت کے قائل ہیں اور اس کی شاعری کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے اور دوسرے اسے شاعر قرار دے کر اس کے فلسفۂ زندگی کی نفی کرنا چاہتے ہیں۔ اکثر لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ فلسفی کو شعر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور شاعر فلسفے کی دنیا کا اہل نہیں ہے۔ فلسفہ اور شعر میں یہ مخاصمت افلاطون کے زیر اثر پیدا ہوئی۔ افلاطون نے اعلان کیا۔

"فلسفہ اور شاعری میں ازلی بیر ہے"

اور یہ کہہ کر شاعری سے منہ موڑ لیا۔ خود اقبال نے لوگوں کے ذہن سے یہ خیال نکالنے کے

لے قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ بعد میں آنے والوں نے خود افلاطون کی تحریروں میں شاعری کا سراغ لگایا اور اسے شاعر اور فنکار قرار دیا۔ سڈنی نے کہا کہ افلاطون اس لئے شاعر کہلانے کا مستحق ہے کہ اسکے ہاں شاعری کا سب سے بڑا وصف "ایجاد" پایا جاتا ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تنقیدی نظریے از ملک حسن اختر)

لئے کہ شاعر فلسفی اور مصلح نہیں ہو سکتا، اس بات پر بڑا زور دیا کہ انھیں صرف شاعر سمجھ کر ان کی بات کو طاق نسیاں کی زینت نہ بنایا جائے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے محرم درونِ خانہ ہونے اور اپنی قلندری کا بار بار ذکر کیا ہے۔

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

من اے میرِ امم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

مگر یہ سب اس لئے کہا گیا ہے کہ لوگ ان کی نوائے پریشاں کو شاعری سمجھ کر نظر انداز نہ کر دیں ورنہ ان کے نزدیک تو فلسفہ اور شعر کی حقیقت ایک ہی ہے۔ دونوں کا راز حرفِ تمنا میں پوشیدہ ہے۔ جسے روبرو نہیں کہا جا سکتا ہے۔

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں رُوبرو

فلسفہ اور شعر میں دشمنی نہیں ہے بلکہ دونوں میں "حرفِ تمنا" کی قدر مشترک موجود ہے۔ دونوں حق ہیں فرق صرف یہ ہے کہ ایک سوز سے عاری ہے اور دوسرا سوز کا دامن پکڑ کر چلتا ہے۔

حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر می گردد چوں سوز از دل گرفت

چنانچہ اقبال شاعری کے قدرداں ہیں اور یہ حقیقت لوگوں پر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ فلسفہ اور شاعری میں ازلی بیر نہیں بلکہ یہ ایک حقیقت کے دو روپ ہیں۔ وہ شاعر کو ملت کا دل سمجھتے ہیں۔ اسے دیدۂ بینائے قوم قرار دیتے ہیں۔ اس کے بغیر ملت مٹی کا انبار ہے۔ شاعر پیغمبری کا وارث ہے اور اس کا وجود ملت کی ترقی اور تعمیر کے لیے ناگزیر ہے۔

شاعر اندر سینۂ ملت چو دل   ملتے بے شاعرے انبارِ گل
شعر را مقصود اگر آدم گری ست   شاعری ہم وارثِ پیغمبری ست

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے فلسفۂ زندگی کو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ کیونکہ جب فلسفہ شاعری کے بطن سے جنم لیتا ہے تو وہ خشک اور بور نہیں رہتا بلکہ دلکش اور دلنواز بن جاتا ہے اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اقبال شاعری کی پری کو شیشے میں اتارنے میں کس طرح کامیاب ہوئے۔

نثر اور شاعری میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جہاں اول الذکر کا بنیادی مقصد معلومات فراہم کرنا ہے۔ وہاں ثانی الذکر کا اولین کام انتقال احساس ہے[1] نثر کی معلومات میں جذبے کی آمیزش ہو سکتی ہے مگر یہ اس کا اصل مقصد نہیں ہے۔ اور اسی طرح شاعری میں جذبہ معلومات کو اپنے دامن کی زینت بنا سکتا ہے مگر غلبہ

[1] خود اقبال انتقالِ جذبات کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

بخود نازم گدائے بے نیازم   تپم، سوزم، گدازم نے نوازم
ترا از نغمہ در آتش نشاندم   سکندر فطرتم آئینہ سازم

اسی کا رہتا ہے۔ اسی حقیقت کو محسوس کر کے ورڈزورتھ نے کہا تھا "شاعری شدید جذبات کا فطری اظہار ہے۔" مگر اس کے ساتھ اس نے یہ شرط بھی لگائی کہ شاعر نے مدتوں غور و فکر کیا ہو۔ بقول ندیم

جس بھی فن کار کا شاہکار ہو تم
اس نے صدیوں تمہیں سوچا ہو گا

شاعر پہلے کسی منظر، چیز یا خیال سے متاثر ہوتا ہے پھر اس جذبہ سے تخیل جنم لیتا ہے جو اس کو ایک مناسب صورت عطا کرتا ہے۔ اس صورت اور جذبہ میں جتنی زیادہ مطابقت اور ہم آہنگی ہو گی۔ اتنا ہی ابلاغِ احساس کامیاب ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعری میں اسلوب کو بڑی اہمیت ہے کیونکہ جذبہ کو صورت الفاظ ہی عطا کرتے ہیں بقول کولرج "بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب شاعری ہے۔" یوں تو ایک عام آدمی بھی مختلف اشیائ سے متاثر ہوتا ہے۔ مگر اس کے جذبات کا اظہار شاعری نہیں ہے۔ اس کے جذبات تو گالیوں کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کو زبان اور ادائے اظہار کے ذرائع سے مکمل واقفیت ضروری ہے۔ تاکہ اس کے جذبات ایک ایسی دل پذیر صورت اختیار کریں جو قاری کے تخیل کو حرکت میں لا کر اسے اتنا ہی متاثر کر دے جتنا کہ شاعر خود ہوا تھا۔ علامہ اقبال اُن کا موضوع ہے۔ وہ کوئی چیز ہو یا خیال۔ شدید طور پہ متاثر ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان کو ادائے اظہار کے طریقوں پر پوری قدرت ہے اس لئے وہ اسے بڑی حسین صورت عطا کرتے ہیں۔ جسے پڑھنے کے بعد ہم احساس کی اس دولت سے مالا مال ہو جاتے ہیں جو پہلے صرف شاعر کا حصہ تھی۔ وہ خود کہتے ہیں۔

زمن از شاعرِ رنگیں بیاں گو ۔۔۔ چہ سود از سوز اگر چوں لالہ کوری
نہ خود را می گدازی زآتشِ خویش ۔۔۔ نہ شام دردمندے بر فروزی!

مثال کے لئے میں ان کے دورِ اوّل کی ایک نظم "شوالہ" پیش کرتا ہوں۔ اس دور میں اقبال نظریۂ حبِّ وطن کے قائل تھے اور ان کے خیال میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے ایک ہو جانے میں ہی بہتری تھی۔ اس وقت وہ جغرافیائی حدود میں مقید افراد کو ایک قوم بنانا چاہتے تھے۔ اور اس پر ان کا پختہ یقین تھا۔ جب وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو نفاق اور دشمنی کی راہوں پر چلتے دیکھتے تو ان کے دردمند دل پر چوٹ لگتی اور وہ پکار اٹھتے

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے ۔۔۔ تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا ۔۔۔ جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا ۔۔۔ واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں ۔۔۔ بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی ۔۔۔ آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ ۔۔۔ دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے ۔۔۔ سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے

دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

یہ مختصر سی نظم شدتِ احساس اور اندازِ بیان کی مطابقت کا بہترین نمونہ ہے۔ نظم کا پہلا ہی مصرع ہمیں بتا دیتا ہے کہ اس میں برہمن سے خطاب کیا گیا ہے چنانچہ اس نظم میں ہندی کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ دیوتا، تیرتھ، منتر، میت، شکتی، شانتی، مکتی، دھرتی، باسی، بھگت، پیت جیسے الفاظ سے اقبالؔ نے وہ فضا پیدا کر دی ہے جو اس نظم کو کامیابی سے ہم کنار کرتی ہے۔ ان کے لہجے میں بھی تیزی کی بجائے شانتی پائی جاتی ہے۔ اقبالؔ نے اپنی تمام نظموں میں لہجے کا بڑا خیال رکھا ہے اگر شاعر موقع و محل کے مطابق اپنے لہجے میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا تو وہ ایک اچھا شاعر نہیں کہلا سکتا۔ نیا شوالہ میں ان کے لہجے میں دھیما پن اور نرمی ہے تو "شکوہ" میں بعض اوقات شکایت کی لے اتنی تیز ہو گئی ہے کہ اسے گستاخی پر محمول کیا جاتا ہے۔ خدا سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے اس طرح کے اشعار بھی کہے ہیں جن کی گرمیٔ کلام بعض طبائع پر گراں گذرتی ہے ؎

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں!

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

مگر لہجے کی گرمی اپنی تو اس نظم کی خوبی ہے اور شاعر اس تک ایک دم نہیں بلکہ آہستہ آہستہ پہونچتا ہے پھر شاعر نے اس تیزی اور تندی کے لئے جواز بھی پیدا کر لیا ہے۔ وہ یہاں اقبالؔ نہیں بلکہ مسلمان قوم کا نمائندہ ہے اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور موجودہ پستی نے اسے بری طرح متاثر کیا ہے۔ جب اس سے کچھ اور نہیں بن پڑتا تو وہ خدا سے شکایت کرنے لگتا ہے اس نے مسلمانوں کی پستی اور ذلّت کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔ جذبات کی اس شدّت کو اس سے بہتر صورت دینا ممکن نہ تھا تغزل کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان شعروں کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ جب جذبات کی یہ شدت اقبالؔ کا ساتھ چھوڑ گئی اور فکر نے اس پر غلبہ پا لیا تو شعریت کا عنصر بھی گم ہو گیا۔ ان کی اردو کتابوں میں ضربِ کلیم کی شاعری اسی نوعیت کی ہے یہاں افکار نے جذبات کو دبا لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کا شاعرانہ مرتبہ کم ہو گیا ہے مگر معلوماتی قیمت بہت زیادہ ہے۔ یہ درست ہے کہ وہاں بھی شعریت کی بجلی چمکتی ضرور ہے اور گاہے گاہے ہم اقبالؔ کو پھر اپنے اصلی رنگ میں دیکھ لیتے ہیں۔ مگر اکثر اشعار کا شاعرانہ مرتبہ بہت کم ہے۔ اس کے برعکس بانگِ درا میں جذبات کی شدت بعض اوقات قابو میں نہیں رہتی اور یوں ان کے فن کو نقصان پہنچاتی ہے۔ البتہ بالِ جبریل میں اقبالؔ کا جذبہ اور فکر ایک دوسرے سے یوں گھل مل گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں اور یہی ان کی شاعری کی معراج ہے شاید انھیں خود بھی اس کا احساس تھا کہ بانگِ درا میں ان کا نالہ خام ہے۔ اور اسے ابھی کچھ دیر اور سینے میں تھامنا ضروری ہے۔ تاکہ وہ پختہ ہو کر تاثیر سے مملو ہو جائے بانگِ درا کے حصہ سوم کی غزلیات میں ایک شعر ہے۔

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

مگر بالِ جبریل میں ان کو اپنی فغان کو دل کی بھٹی میں مزید پکانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

پیرِ حرم نے کہا سن کے مری روئداد
پختہ ہے تیری فغاں اب نہ اسے دل میں تھام

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ "شکوہ" کی سب سے بڑی خوبی اس کا لہجہ ہے اقبال نے اس نظم میں مسلمانوں کا نمائندہ بن کر خدا سے خطاب کیا ہے۔ وہ مسلمان جو کبھی ثریا پر تھے اور اب ان کو آسمان نے زمین پر دے مارا ہے اور جب عام مسلمانوں کا یہ عقیدہ بھی ہو کہ ان کی تقدیر خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ خود اس کو بنانے پر قادر نہیں تو تلخی کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ شروع میں انھوں نے اگرچہ یہ کہہ کر معذرت کر لی ہے کہ:

شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

اور

اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

مگر جوں جوں وہ آگے بڑھتے ہیں کلام میں گرمی بڑھتی جاتی ہے اور نظم کی تاثیر میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے[1] چنانچہ مذکورہ شعر اس نظم کے حسین ترین شعر ہیں موقع

[1] اقبال نے اپنی نظم "شکوہ" یورپ سے لوٹنے کے بعد ۱۹۰۹ء میں لکھی یورپ میں انھوں نے

(باقی ص ۲۲ پر)

وقع کے مطابق کون سا لہجہ اختیار کیا جائے۔ اس کا اقبال نے بڑا خیال رکھا ہے۔ بالِ جبریل کی نظم "ابلیس اور جبریل" میں ابلیس اور جبریل کے لہجے کا فرق بڑا واضح ہے۔ یہاں الفاظ کا انتخاب قابلِ داد ہے۔ اس نظم میں جبریل کی نیازمندی اور ابلیس کا ناز پوری طرح موجود ہے۔ جبریل کے لہجے میں نرمی اور دھیما پن موجود ہے۔ اس کی شکایت میں بھی تندی اور تیزی پیدا نہیں ہوتی۔ جبریل گلہ کرتا ہے۔

کھو دئیے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

اس شعر میں شکایت کی گرمی سے زیادہ افسوس کا عنصر زیادہ ہے۔ جبرئیل کو اس بات کا دکھ ہے کہ ابلیس نے مقاماتِ بلند کھو دیئے اور اس سے زیادہ دکھ اس بات کا ہے کہ خدا کی نظروں میں فرشتے ذلیل ہو گئے۔ اگر کسی جماعت میں سے ایک آدمی بُرا کام کرے تو پوری جماعت کے لئے شرمندگی کا باعث ہوتا ہے۔ اگر خاندان کا ایک فرد راہ راست سے بھٹک جائے تو دوسروں کی پیشانی پر بھی عرق انفعال کے قطرے نمودار ہو جاتے ہیں، ابلیس بھی فرشتوں کے خاندان کا ایک فرد تھا اور اسی لئے جبریل اس کے الفاظ کو فرشتوں کے لئے باعثِ ندامت سمجھتا ہے اس کے باوجود جبریل کی ذات سے جمال کا جو تصور وابستہ ہے وہ اس کے لہجے میں گرمی اور تیزی پیدا نہیں ہونے دیتا۔ بس ایک ہلکا سا درد ہے۔ جو احساس کے چراغ کو روشن کرتا ہے اس کے برعکس ابلیس جلال کا مظہر ہے اور اس کی فطرت کی تعمیر قاہری سے ہوئی

(بقیہ صفحہ ۳۱ کا) مغربیوں کی ترقی و عروج کے مناظر دیکھے اور جب برصغیر لوٹے تو اس کا موازنہ مسلمانوں کی پستی سے کیا۔ زخم چونکہ تازہ تھا اس لئے لہجے میں گرمی اور تیزی پیدا ہو گئی۔

ہے۔ وہ بیباکی اور آزادی بلکہ باغیانہ صفات کا حامل ہے وہ جبریل کو ایک معمولی سی ہستی سمجھتا ہے جو ہمیشہ دوسروں کی مرضی کی غلام ہوتی ہے اس لئے وہ اس ہلکی سی شکایت کا جواب بھی بڑے تند و تیز لہجے میں دیتا ہے۔ مگر اس کے لہجے میں کبھی ایک دم تندی اور تیزی پیدا نہیں ہوتی۔ اقبال اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ یہ تیزی آہستہ آہستہ بڑھے جیسا کہ عام طور پر گفتگو کے دوران ہوتا ہے اور جب ابلیس آخری شعر کہتا ہے تو اس کی انا پوری شدت سے نمایاں ہو جاتی ہے۔ ان اشعار میں ابلیس کی پوری شخصیت کا عکس موجود ہے۔ ابلیس جبریل کو یوں جواب دیتا ہے۔

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو!
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو؟
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو!

"میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح" کتنا گرم مصرع ہے اور سوائے ابلیس کے ایسے الفاظ اور کون کہہ سکتا ہے ایہا ابلیس کی انا پھیل کر محیط بے کراں

بن گئی ہے ۔ اسی طرح ان کی نظم "تسخیر فطرت" ہے اس میں انھوں نے میلادِ آدم اور انکارِ ابلیس کا قصہ بیان کیا ہے یہاں بھی شیطان کے انکار میں وہی انانیت موجود ہے اور اس کا لہجہ اس کی شخصیت کا عکاس ہے۔ "جبریل اور ابلیس" میں ابلیس نے اپنا مقابلہ جبریل سے کیا تھا۔ یہاں وہ اپنا مقابلہ خدا کی صفات سے کرتا ہے مگر لہجے کی تیزی برقرار ہے۔

نوریِ ناداں نیم سجدہ بہ آدم برم	او بہ نہاد است خاک من بہ نژاد آذرم
می تپد از سوزِ من خونِ رگِ کائنات	من بہ وجودِ صرصرم، من بہ غو تندرم
رابطۂ سالمات، ضابطۂ امہات	سوزم و سازم دہم آتش میناگرم
ساختہ خویش را در شکنم ریز ریز	تا ز غبارِ کہن، پیکرِ نو آورم
پیکرِ انجم ز تو، گردشِ انجم ز من	جاں بہ جہاں اندرم، زندگیِ مضمرم
تو بہ بدن جاں دہی شور بجاں من دہم	تو بہ سکوں رہ زنی، من بہ تپش رہبرم

مگر آدم جنت سے نکل کر خدا سے ہم کلام ہوتا ہے تو اس کے لہجے میں نمایاں فرق موجود ہے لہجے کی اس تبدیلی کو موثر بنانے کے لئے اقبال نظم کی بحر بدل دیتے ہیں تاکہ آدم کے لہجے میں شگفتگی پیدا ہو سکے ۔ آدم بڑے مزے سے کہتا ہے ۔

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن !

دل کوہ و دشت و صحرا بدمے گداز کردن !

ز قفس درے کشادن بہ فضائے گلستانے

رہ آسماں نوردن بہ ستارہ راز کردن !

اقبال کو لہجے کا کس قدر خیال رہتا تھا اس کا اندازہ اس خط سے لگایا جاسکتا۔

ہے جو خضرِ راہ کے سلسلے میں انھوں نے سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا۔

"خضرِ راہ" کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے، صحیح ہے مگر یہ نقص اس نظم کے لئے ضروری تھا۔ (کم از کم میرے خیال میں) جناب خضر کی پختہ کاری، ان کا تجربہ اور واقعات و حوادث عالم پر ان کی نظر۔ ان سب باتوں کے علاوہ ان کا اندازِ طبیعت جو سورہ کہف سے معلوم ہوتا ہے، اس بات کا متقضی تھا کہ جوش اور تخیل کو ان کے ارشادات میں کم دخل ہو۔ اس نظم کے بعض بند میں نے خود نکال دیئے اور محض اس وجہ سے کہ ان کا جوشِ بیان بہت بڑھا ہوا تھا اور جناب خضر کے اندازِ طبیعت سے موافقت نہ رکھتا تھا۔

کسی شخصیت یا کردار کے مزاج اور اندازِ طبیعت کے مطابق لہجے کا خیال ڈرامہ نگار کا پہلا فرض تھا۔ اقبال نے ڈرامے کے سب سے اہم عنصر۔ مکالمے۔ سے بڑا کام لیا ہے۔ اور مکالمے کی ادائیگی میں عمدگی پیدا کرنے کے لئے لہجے کا خاص خیال رکھا ہے۔ کیونکہ مکالمے کی اچھائی یا برائی کا انحصار لہجے پر ہی ہے۔ اقبال کی نظموں کا بیشتر حصہ مکالموں پر مشتمل ہے۔ کبھی شاعر انسانوں سے گفتگو کرتا ہے تو کبھی بے جان چیزوں سے۔ وہ خضر سے زندگی کے راز پوچھتا ہے حور سے شاعر کی طبیعت کا حال کہتا ہے۔ گل رنگیں کے سینے میں چھپا ہوا راز جاننا چاہتا ہے۔ ہمالہ سے ماضی کی داستان سنتا ہے، کبھی قبر سے مخاطب ہوتا ہے تو کبھی مسلمانوں کو زندگی کا پیغام سناتا ہے اور پھر انسان سے سرگوشی میں رازِ حیات کہہ دیتا ہے۔ غرض شاعر اپنی شاعری میں ہر چیز سے ہم کلام ہے۔ جاوید نامہ کا بیشتر حصہ مکالمے پر ہی مشتمل ہے۔ بلکہ اسے ہم ایک ادبی ڈرامہ کہہ سکتے ہیں۔ شاعر خود ہی دوسروں سے ہم کلام نہیں ہوتا بلکہ حیوانات اور پرندے اس کی شاعری میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں مردہ قبر سے ہم کلام ہے تو کہیں چیونٹی شاہیں سے متکلم ہے۔ غرضیکہ مکالمہ اس کی شاعری پر چھایا ہوا ہے۔

مکالمے کے علاوہ انھوں نے دوسرے ڈرامائی عناصر سے بھی کام لیا ہے خود کلامی اور منظر نگاری ان کی ڈرامائی شخصیت کا اظہار ہیں۔ مگر انھوں نے اس کے باوجود کوئی ایسا ڈرامہ نہیں لکھا جو سٹیج کیا جا سکے جاوید نامے کی تعمیر ڈرامائی عناصر سے ہوتی ہے مگر ہم اس کو سٹیج پر کھیل نہیں سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال ڈرامے کو خودی کا قاتل سمجھتے ہیں۔

حریم تیرا خودی غیر کی معاذ اللہ ‏ ‏ ‏ دوبارہ زندہ نہ کر کاروبار لات و منات

یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے ‏ ‏ ‏ رہا نہ تو تو نہ سوز خودی نہ ساز حیات

ان کے خیال میں ڈرامہ شخصیت کو مسخ کر دیتا ہے۔ مگر انھوں نے اپنی نظموں کو موثر بنانے کے لئے ڈرامے کے فن سے مدد ضرور لی ہے۔

اقبال فن کو جانکاہی اور مسلسل محنت کا ثمر سمجھتے ہیں چنانچہ انھوں نے اس بات پر ہمیشہ نظر رکھی کہ جو کچھ لکھیں وہ معیاری ہو اور جو معیاری نہ ہو اس کو قلم زد کر دیں۔ انھیں اپنے کلام کا جو حصہ بھی کم عیار نظر آیا اسے نظر انداز کر دیا انھوں نے کئی طویل نظمیں الگ ... میں شامل نہ کیں حالانکہ وہ ان نظموں کی وجہ سے عوام سے بے پناہ داد وصول کر چکے تھے۔ ان کا ایسا کلام "سرود رفتہ" کے نام سے مولانا غلام رسول مہر اور صادق علی دلاوری نے شائع کیا ہے۔ علامہ اقبال نے اس کلام کو فنی نقطہ نظر سے یا پھر اپنے خاص نظام فلسفہ کے مطابق نہ ہونے سے رد کر دیا یا اس کی وضاحت میں مہارت ثابت نہ ہو سکنے کی وجہ سے رد کر دیا۔ یہ علامہ اقبال ہی کا حوصلہ تھا کہ انھوں نے ایسے کلام کو جو مشہور و مقبول تھا اور جو ابتدا میں ان کی شہرت کا باعث ہوا نظر انداز کر دیا۔ ورنہ خالق کو اپنی ہر تخلیق سے پیار ہوتا ہے اور یہ تنقیدی صلاحیت کسی کسی میں ہوتی ہے کہ اپنے کلام میں سے اچھے اور برے کو الگ الگ کر سکے۔ ان نظموں میں سے کئی انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں

پڑھی گئیں اور بہت پسند کی گئی تھیں۔ "نالہ یتیم" علامہ اقبال نے ۲۵ فروری ۱۹۰۰ء میں پڑھی۔ انجمن کی روداد میں لکھا ہے۔

"شیخ محمد اقبال صاحب نے "نالہ یتیم" جو چھپا ہوا تھا، پڑھنا شروع کیا۔ اس کے ہر شعر پر تحسین و آفرین کے نعرے چاروں طرف سے بلند ہو رہے تھے اور سیکڑوں آنکھیں دریائے اشک بہا رہی تھیں۔ اس کے پڑھنے کے دوران تین سو روپے سے کچھ اوپر چندہ ہو گیا اور کل کاپیاں اس نظم کی اسی وقت فروخت ہو گئیں۔ نظم ایسی مقبول ہوئی کہ چار چار روپے کو ایک ایک کاپی بکی۔"

اسی طرح "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے" [1] اتنی مقبول ہوئی کہ اس کی ایک ایک کاپی دس دس روپے میں بکی۔ یہی نہیں علامہ اقبال نے بانگ درا کی بعض نظموں میں سے کئی بند نکال دئے۔ بعض کو خاصا بدل دیا اور بعض نئے اشعار کا اضافہ کیا۔ بعض اشعار میں اس طرح ترمیم کی کہ وہ فنی اعتبار سے بہتر ہو گئے۔ اس حک و اضافے کی فہرست "سرود رفتہ" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ "نیا شوالہ" ان کی مشہور نظم ہے۔ یہ نظم دو بندوں پر مشتمل ہے اس وقت پہلے بند میں چار شعر اور دوسرے بند میں پانچ شعر ہیں (یہ نظم پہلے درج کی جا چکی ہے) پہلے بند میں سے اقبال نے یہ شعر حذف کر دیا۔

کچھ فکر پھوٹ کی کر مالی ہے تو چمن کا   بوٹوں کو پھونک ڈالا اس بے خبری ہوا نے

پہلے بند میں اقبال نے برہمن سے شکایت کا لہجہ اختیار کیا اور اپنی مذہب سے بیزاری کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے بند میں وہ اسے نیا شوالہ بنانے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لیے یہ شعر پہلے بند کے چار شعروں کے لہجے اور انداز تخاطب سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس میں برہمن کو

[1] یہ نظم انجمن حمایت اسلام کے جلسے منعقدہ ۲۲ فروری ۱۹۰۲ء میں پڑھی گئی۔

کو مالی قرار دے کر اس سے کہا گیا کہ وہ چمن کی حفاظت کرے۔ یہ بات پہلے بند میں غیر ضروری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ زبان کے اعتبار سے یہ شعر دوسرے بند میں نہیں رکھا جا سکتا اور یہی اقبال نے کیا ہے۔ دوسرے بند میں سے نو شعر نکالے گئے ہیں پہلے اس میں چودہ شعر تھے یہ نو شعر بھی نظم کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے اندازہ کیجئے کہ پوری نظم جو انیس اشعار پر مشتمل تھی اس میں سے اقبال نے دس شعر (یعنی آدھے سے بھی زیادہ) حذف کر دیئے۔ مگر دیکھئے ان اشعار کے حذف کر دینے سے نظم کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے۔ دو شکوہ میں علامہ نے صرف ایک شعر میں ترمیم کی ہے۔ شعر کی پہلی صورت یوں تھی۔

پھر پتنگوں کو مذاقِ تپش اندوزی دے   برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

اور موجودہ صورت ہے۔

اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے   برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

پہلے مصرعے میں "پھر پتنگوں" کو بدل کر اس کی جگہ "اپنے پروانوں" میں جو انسیت ہے وہ "پھر پتنگوں" میں نہیں ہے یہاں خدا کو یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ تیری ہی شمع کے پروانے ہیں اس لئے ان کو ذوقِ خود افروزی عطا فرما۔ اسی طرح مذاقِ تپش اندوزی" کی جگہ ذوقِ خود افروزی" معنوی اعتبار سے بہتر ہے "گل رنگیں" کا پہلا بند یوں تھا۔

تو شناسائے فراموشِ حقیقۂ مشکل نہیں   واقفِ افسردگی ہائے طبیعتِ دل نہیں

زیبِ محفل ہے شریکِ شورشِ محفل نہیں   کیوں یہ تسکینِ خموشی زا مجھے حاصل نہیں

سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے

راز وہ کیا ہے تیرے سینے میں جو مستور ہے

اسے علامہ مرحوم نے بدل کر اس طرح کر دیا۔

اے گُلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں ‏ تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں
کیوں یہ تسکین خموشی زا مجھے حاصل نہیں ‏ زیبِ محفل ہے شریکِ شورشِ محفل نہیں

اس چمن میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

پہلے شعر کا دوسرا مصرع علامہ اقبال نے بدل دیا جس سے شعر زیادہ پر تاثیر ہو گیا ہے "اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں" میں جو حسن ہے وہ متروکہ مصرع میں نہیں ہے پہلے مصرع سے "نہیں" کا لفظ نہ ہو تو مصرع فارسی زبان کا بن جاتا ہے مگر موجودہ مصرع میں صرف ایک فارسی ترکیب ہے اور وہ بھی اس لئے کہ "گلِ رنگیں" نظم کا عنوان ہے یہاں الفاظ سادہ اور آسان ہو گئے ہیں۔ پھر "گلِ رنگیں" سے پہلے مصرع میں خطاب کر کے انھوں نے فنی جواز بھی پیدا کر لیا ہے۔ اور خطابیہ انداز نے مصرعے کو حسن بھی عطا کیا ہے۔ البتہ اس بند کا آخری شعر بہت رواں اور دلکش تھا۔ مگر علامہ نے اسے بھی بدل دیا ہے۔ فنی لحاظ سے یہ تبدیلی بھی ابتری کی طرف لے جاتی ہے پہلے دو شعروں میں اقبال نے گلِ رنگیں کی بے حسی اور آرزو سے محرومی کا ذکر کیا ہے۔ خود کو اس سے مختلف قرار دیا ہے اب بند کے آخری شعر میں اسی بات کو آگے بڑھایا گیا ہے اور بڑے دلکش انداز میں اپنے اور گلِ رنگیں کے فرق کو بیان کیا ہے۔ بند کا آخری شعر ہمیشہ یا تو پہلے کہی گئی بات کو مکمل کرتا اور یا پھر اس میں زور پیدا کرتا ہے اقبال نے موجودہ شعر سے اسی مقصد کو حاصل کیا ہے۔ اس کے برعکس پہلا شعر اگر اس بند کا آخری شعر رہتا تو یوں محسوس ہوتا کہ شاعر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے کے بجائے ایک دم چھلانگ لگا گیا ہے۔ چنانچہ شعر پر تاثیر اور جاذبِ نظر ہونے کے باوجود اس بند میں موزوں نہ تھا۔ اس کی دلکشی نے اقبال

نے دل کو بھی موہ لیا تھا۔ چنانچہ وہ اسے حذف نہ کر سکے اور اسے تیسرے بند کا پہلا شعر بنا دیا۔ اس نظم میں سے دو بند اقبال نے حذف کر دیے پہلے چھ بند تھے اب چار رہ گئے۔ اقبال نے نیا شوالہ کی طرح اس نظم کو بھی مختصر کر دیا۔ حالانکہ بعض لوگ بھرتی کے اشعار داخل کر کے نظموں یا غزلوں کو طویل بناتے ہیں۔ "بانگ درا" کی بہت سی نظموں کے ساتھ اقبال نے یہی سلوک کیا ہے۔ مگر جہاں ترمیم کی ضرورت نہ تھی وہاں اقبال نے ترمیم نہیں کی۔ "حقیقت حسن" ان کی مختصر سی نظم ہے۔ اس میں صرف سات شعر ہیں ان میں فنی سقم نہ تھا اور حشو و زوائد سے بھی پاک تھی اس لئے انھوں نے اسے جوں کا توں رہنے دیا یہ نظم اتنی مکمل اور گتھی ہوئی ہے کہ اس میں کوئی کھانچا نہیں۔ اور کوئی بیکار شعر نہیں جسے حذف کیا جاتا۔ پہلا شعر ہے۔

خدا نے حسن سے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا

پہلا مصرع بیانیہ ہے۔ دوسرے میں حسن کا سوال ہے۔ اس سوال کو سننے کے بعد خدا کی زبان سے صرف دو شعروں کا جواب دیا گیا ہے۔

ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شب دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا

ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

پہلے شعر میں ایک فضا پیدا کی گئی ہے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں ایک حقیقت بیان ہوئی ہے کہ اس دنیا کی نمود رنگ تغیر سے ہوئی ہے اور دوسرے مصرع میں یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ حسین وہی ہوتا ہے جو زوال سے آشنا ہو۔ یہ دنیا کا اصول ہے اور اس سے کسی کو مفر نہیں۔ زوال آشنائی حسن کی تقدیر ہے۔ وہی حسین ہے حقیقت

زوال ہے جس کی؟ کتنا خوبصورت اور بولتا ہوا مصرع ہے۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی یہ درست ہے کہ قاری کو حسن کی حقیقت معلوم ہو گئی ہے مگر یہ حقیقت سوز سے خالی ہے ابھی تاثیر کا تیر تو چلایا ہی نہیں گیا۔ اس کے لئے وہ ڈرامائی فضا پیدا کرتے ہیں۔ پہلے اسٹیج پر صرف حسن اور خدا تھے، اب چاند، ستارے، سحر، شبنم، پھول اور کلیاں نمودار ہوتی ہیں۔

کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی ۔۔۔ فلک پہ عام ہوئی اخترِ سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو ۔۔۔ فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو

یہ خبر عام ہو گئی ہے مگر اس میں جو درد کا عنصر ہے وہ ظاہر نہیں ہوا۔ آنے والا شعر زوالِ حسن کی حقیقت کا اثر ظاہر کرتا ہے۔ اس خبر سے کلی کا خون ہو گیا اور پھول کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے ۔۔۔ کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

اس کے بعد آخری شعر ہے جو اس غم کی داستان کو عام کرتا ہے اور اسے تاثیر سے مالامال کر دیتا ہے۔

چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا ۔۔۔ شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

اب ڈرامہ مکمل ہو گیا ہے۔ قاری پر غم کی وہ کیفیت طاری ہو گئی ہے جو اقبال کا مقصود تھی۔ فن کا یہ کمال اقبال کی اکثر نظموں میں نظر آتا ہے۔ اور جہاں کہیں یہ کمالِ فن مجروح ہوتا نظر آیا اسے اپنی تنقیدی بصیرت کی مدد سے بچا لیا ہے اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بانگِ درا کا شاعر ابھی فن پر کامل عبور حاصل نہیں کر سکا۔ کبھی تو اس کی نظمیں فنی طور پر مکمل ہوتی ہیں۔ اور کبھی وہ ان میں حک و اضافے اور ترمیم سے حسن پیدا کرتا رہتا ہے۔ ابھی فن اس کی روح میں سرایت نہیں ہوا۔ یہ چیز مسلسل محنت

اور تنقیدی حس کے متواتر استعمال سے حاصل ہوتی ہے۔ اقبال نے اپنے ذوق کی تکمیل بانگ درا کی نظمیں لکھ کر کی۔ بال جبریل میں انھیں فن کے دیو پر قابو حاصل ہو گیا۔ اور اب وہ جس طرح چاہیں اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ چنانچہ مسجد قرطبہ، ذوق و شوق، ساقی نامہ ابلیس و جبریل اور دوسری نظموں میں ہیئت اور موضوع ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہیں۔ یہی پختگی اور فن کی بلندی ان کی فارسی تصانیف، زبور عجم، پیام مشرق، اور جاوید نامے میں نظر آتی ہے۔ بانگ درا سے بال جبریل تک کا سفر ایک دم طے نہیں ہوا۔ اس دوران میں وہ برابر اپنی شاعری کی پرورش خون جگر سے کرتے رہے ہیں۔ اور کوشش کرتے رہے ہیں کوئی سقم باقی نہ رہے۔ رموز بے خودی کے متعلق وہ سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"صحت الفاظ و محاورات کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے ضرور صحیح ہوگا لیکن اگر آپ ان لغزشوں کی طرف بھی توجہ فرماتے تو میرے لئے آپ کا ریویو مفید ہوتا۔ اگر آپ نے غلط الفاظ و محاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے مجھے ان سے آگاہ کیجئے تاکہ دوسرے ایڈیشن میں ان کی اصلاح ہو جائے۔ غالباً آپ نے رموز بے خودی کے صفحات پر بھی نوٹ کئے ہوں گے۔ اگر ایسا ہو تو وہ کاپی ارسال فرما دیجئے" [1]

اور جب سید سلیمان ندوی ان کو ان غلطیوں سے آگاہ نہیں کرتے وہ چین سے نہیں بیٹھ رہتے بلکہ ان کو یاد دلاتے ہیں۔

"رموز بے خودی کی لغزشوں سے آگاہ کرنے کا وعدہ آپ نے کیا تھا اب تو ایک ماہ سے بہت زیادہ عرصہ ہو گیا۔ امید ہے کہ توجہ فرمائی جائے گی" [2]

---

[1] اقبال نامہ۔ صہ ۸۲

[2] اقبال نامہ صہ ۸۴

ان خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اقبال غلطیوں کو جاننے اور ان کے رفع کرنے پر مستعد رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہے۔ وہ کبھی مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ جاتے کہ اب ان کا فن تکمیل کی حدود چھو گیا ہے۔

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئے
تپد آں زماں دل من پئے خوب تر نگارے

یہی ناصبوری فن کو بلندی عطا کرتی ہے[1] اگر فنکار کا دل قرار پکڑ لے اور اس کی نظر صرف ایک جگہ جم کر رہ جائے تو عظمت کے تخت — پر جلوہ افروز نہیں ہو سکتا۔

اپنی شاعری کو دلکش اور موثر بنانے کے لئے اقبال نے قاری اور شاعر کے درمیان واسطے کا بڑا خیال رکھا ہے۔ اقبال کے پاس ایک پیغام تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ان کی قاری کے گھر کرے اس لئے انھوں نے اپنے اور قاری کے درمیان موجود تعلق کو منقطع نہیں کیا انھوں نے اپنا رشتہ ہمیشہ روایت سے جوڑے رکھا اور اپنے فن اور افکار کی بنیاد اسی پر رکھی۔ ان کا فلسفہ خودی جدید ترین ہونے کے باوجود قدامت کا دامن کبھی نہیں چھوڑتا

---

[1] گوئٹے کا ہیرو فاوسٹ بھی ایسی ہی طبیعت کا مالک تھا۔ وہ شیطان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے "اگر میں کسی لمحے کو مخاطب کر کے کہوں ذرا ٹھہر جاؤ تو کتنا حسین ہے تب تجھے اختیار ہے کہ طوق و سلاسل میں جکڑ کر قعر ذلت میں ڈھکیل دے" سر فاوسٹ ترجمہ انجمن ترقی اردو صفحہ ۱۹۱) اور اقبال کا اردو شعر ہے

ناصبوری ہے زندگی دل کی ؛ آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں

مولانا حالی نے اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

اور غالب کہتے ہیں:

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

ان کا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ حال ماضی کے بطن سے جنم لیتا ہے اور حال کے بغیر مستقبل کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لہذا ماضی کو نظر انداز کر کے ہم شدید غلط فہمی کے مرتکب ہوں گے اور ہمارا وجود ایک خلا میں کھڑا ہو جائے گا۔ ماضی ہمارے لئے سمت کا تعین کرتا ہے۔ اس کے بغیر ہم اپنے حال اور مستقبل کو بے یقین بنا دیں گے چنانچہ انھوں نے اپنے فلسفۂ خودی کی تعمیر میں ماضی کے رنگوں سے بھی استفادہ کیا ہے انھوں نے مشرقی اور مغربی فلسفوں کے علاوہ قرآن حکیم سے پورا پورا استفادہ کیا ہے اور پھر اپنے فلسفہ کو ایک ایسا رنگ عطا کیا ہے جو بیسویں صدی کے لوگوں کو متاثر کرے اور دلکش معلوم ہو۔ اسی طرح انھوں نے فن کی تعمیر میں وہ تمام حربے استعمال کئے ہیں۔ جو اس سے پہلے مروج تھے مگر ان میں جدت پیدا کی ہے اور نیا آہنگ بھی پیدا کیا ہے آپ یہ نہ سمجھیں کہ اقبال نے تقلید کو اپنا فن بنایا۔ تقلید کو تو وہ کسی طرح بھی پسند نہیں کرتے۔

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب
پیمبر ہم رہ اجداد رفتے

وہ تو ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلّی کی تلاش میں رہتے ہیں

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

انھوں نے انقلاب برپا کیا ہے مگر پرانے نظام کو کام میں لا کر انھوں نے روایت کے درخت میں پیوند لگا کر ایک نیا درخت تیار کیا ہے۔ جو آج خود ایک روایت بن گیا ہے۔ اور لوگ اس کی تقلید فخر سے کرتے ہیں۔ ان کا نظریۂ روایت ٹی۔ایس ایلیٹ کے نظریے سے ہم آہنگ ہے۔ ماضی ہمیشہ ان کے سامنے ایک زندہ حقیقت کی طرح موجود رہتا ہے مگر وہ حال و مستقبل کے تقاضوں سے بھی بے خبر نہیں رہتے۔

اقبال نے سب سے پہلے اپنی ردیف اور قافیے کا پابند بنایا اور مقبول ترین

بحروں کو استعمال کیا جو موسیقی کا جادو جگانے اور روانی پیدا کرنے میں ان کی مدد کرتی ہیں۔ ان کے خیال میں قافیہ اور ردیف کو ترک کر کے ہم متخریب کے مرتکب ہوتے ہیں مگر یہ بحریں، ردیفیں اور قافیے ان کے خیال کی ادائیگی میں رکاوٹ نہیں بنتے بلکہ اسے جامہ رنگیں عطا کرتے ہیں۔ اقبال تو دلکشا صدا کے پیچھے بھاگتے ہیں، وہ خواہ عجمی ہو یا تازی نئی ہو یا پرانی۔ وہ صرف جدت کے لئے پرانے اوزاروں کو ترک کرنے پر رضامند نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے غزل کی اس زبان اور لہجے کو ترک کر دیا۔ جو میر اور درد کا زبان اور لہجہ تھا۔ کیونکہ یہ زبان اور لہجہ ان کے افکار تازہ کے بوجھ کو سہار نہ سکتا تھا انھوں نے پرانی تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں میں جدت پیدا کی ان کو اس طرح استعمال کیا کہ ان کی رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگا۔ قصہ فرہاد بڑا پرانا ہے اور شاعروں نے اسے خوب ترتا ہے۔ اقبال نے اس قصے میں سے شیریں کو نظر انداز کر دیا ہے وہ اس کا ذکر بہت کم کرتے ہیں۔ شاید ایک یا دو جگہ انھوں نے اس کو شاعری میں استعمال کیا ہے۔ البتہ خسرو اور فرہاد سے انھوں نے بڑا کام لیا ہے۔ فرہاد کا تیشہ مسلسل محنت اور عمل پیہم کا نشان ہے لہذا اقبال نے اسے اپنے فلسفہ زندگی میں جگہ دی ہے۔ پرویز فرہاد کے راستے کا سنگ گراں ہے وہ بادشاہت کا نمائندہ ہے اس لئے اقبال کی نفرت کا نشانہ بنتا ہے۔ مگر اس کی شخصیت کا رعب داب اور اس کا جلال ان کی تعریف کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اسی فرہاد کا تیشہ کہیں عشق کی علامت ہے۔ تو کہیں کمیونزم کا نشان بن گیا ہے۔ قصہ فرہاد کے مختلف اجزا کو اقبال نے اپنے فلسفے میں مختلف مقامات پر جگہ دی ہے اور ان تلمیحوں کو زمانہ جدید کے افکار کی ادائیگی کا ذریعہ بنایا ہے۔ اقبال نے زندگی کو مستقل موضوع بنایا ہے اور ساقی نامہ اور خضر راہ میں اس پر کئی اشعار لکھے

ہیں۔ مگر زندگی کی حقیقت کو قصۂ فرہاد کے ذریعہ انھوں نے کس قدر عام فہم بنا دیا ہے۔

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ   جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

چند شعر ملاحظہ فرمائیں جن میں اقبال نے حکایتِ غمِ فرہاد اور عشرتِ پرویز کو نیا رنگ دیا ہے۔

بہ ہر زمانہ بہ اسلوبِ تازہ می گویند   حکائتِ غمِ فرہاد و عشرتِ پرویز
ندارد عشق سامانے و لیکن تیشہ دارد   خراشد سینۂ کہسار و پاک از خونِ پرویز است
در عشق و ہوسناکی دانی کہ تفاوت چیست!   آن تیشۂ فرہادے این حیلۂ پرویزے
تیشہ اگر بہ سنگ زد این چہ مقام گفتگو است   عشق بہ دوش می کشد این ہمہ کوہسار را
بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی   کیا ہے اس نے فقیروں کو وارثِ پرویز
گو فقر بھی رکھتا ہے انداز ملوکانہ   ناپختہ ہے پرویزی بے سلطنتِ پرویز
زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا   طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اس ایک تلمیح سے واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال نے الفاظ کو پرانے معنی کا حامل ہوتے ہوئے بھی کس طرح نئی روشنی عطا کی ہے اسی طرح انھوں نے عشق، خودی، لا الٰہ، مردِ مومن، لیلیٰ، جنوں اور دوسرے کئی الفاظ کو نیا انداز بخشا، قاری کے لئے یہ الفاظ نئے نہ تھے۔ ان کا ایک خاص مفہوم اس کے ذہن میں متعین تھا اقبال نے اس مفہوم کو پھیلا کر یا قدرے بدل کر اپنے فلسفے سے اس طرح ہم آہنگ کر لیا کہ قاری کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ الفاظ کے نئے مفہوم سے دوچار ہو رہا ہے چنانچہ اقبال کی شاعری میں ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا نئے لکھنے والوں نے اس بات کا خیال نہیں رکھا اس لئے ان کے قاری کے درمیان خلا پیدا ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک کسی چیز کا استعمال کرنے والا اس سے مطمئن نہ ہو وہ منڈی

لہ غالبؔ کا شعر ہے۔ تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ — سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

میں موجود نہیں رہ سکتی۔ یہ درست ہے کہ ایک ادیب کو ایک عام قاری کے ذوق کی تسکین کا خیال نہیں رکھنا چاہئے بلکہ اسے قارئین کے ذوق کی تربیت کرنی چاہئے تاکہ وہ اس مقام تک پہونچ سکیں جہاں شاعر یا ادیب ہے اگر ادیب کا رشتہ قاری سے منقطع ہو جائے اور وہ صرف اپنی ذات کے اندھیروں میں بھٹکتا پھرے تو پھر وہ قاری کو اپنے ساتھ لے کر منزل کی طرف کس طرح بڑھ سکتا ہے۔ اقبال نے اس راز کو پالیا تھا۔ انھوں نے قارئین کو اس بلندی پر اٹھالیا ہے جس پر وہ خود تھے۔ نئے لکھنے والوں میں فیض احمد فیض نے اس سلسلے میں اقبال کی مثال کو سامنے رکھا اور اسے کامیابی سے برتا بھی ہے۔

اقبال عروض اور علم بیان پر پوری قدرت رکھتے ہیں انھوں نے شاعری کے لئے بڑی جان کاہی کی ہے اور اس کے ساتھ اس کے سینے میں آہ شرر ریز بھی موجود ہے جو شعر کو دلآویزی بخشتی اور تاثیر حامل بناتی ہے ان کی شاعری جذبہ و فکر اور تخیل کا حسین امتزاج ہے بال جبریل میں ان کا اسلوب، جذبات اور فکر کے ساتھ اس طرح گھل مل گیا ہے کہ ان کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا یہاں ان کے خیالات اور جذبات مناسب پیکر خود ہی تراش لیتے ہیں۔ مسجد قرطبہ کا موضوع عظمت ہے۔ مسجد میں جو شان و شکوہ اور جلال ہے اس کے لئے اسلوب بھی پر شکوہ ہونا چاہئے تھا۔ چنانچہ یہاں فارسی تراکیب کی کثرت ہے اور الفاظ بھی سادہ نہیں ہیں۔ ان کا انداز بیان خود بخود مسجد قرطبہ کی شان سے ہم آہنگ ہو گیا ہے۔ اس میں ایک ٹھہراؤ ہے جیسے عظیم الشان دریا وسیع میدانوں میں سفر کر رہا ہو مسجد قرطبہ پر تفصیلی تبصرہ اسی کتاب میں شامل ہے۔ اس لئے مثالیں دینے کی ضرورت نہیں اس کے برعکس ساقی نامے میں زبان سادہ ہے اور روانی بھی زیادہ ہے۔ مگر انھوں نے دلکش تشبیہات اور استعارات کی مدد سے ایک مشکل مضمون کو آسان بنا دیا ہے یہ ان کے فن کا اعجاز

ہے کہ فلسفہ اور شعر میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے انھوں نے حکمت کو شعر کے دیدہ زیب جامے میں پیش کیا - خودی کے فلسفے اور زندگی کی حقیقت کو اتنے دلپذیر انداز میں پیش کرنا اقبال کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے - دیکھئے خودی کا فلسفہ کتنے سادہ اور رواں انداز میں بیان ہوا ہے -

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو سے پیدا من و تو سے پاک

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگ رواں

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے!!

کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں
یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فراز و پس و پیش سے

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے!
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے!!

ساقی نامہ فنی اعتبار سے ایک حسین نقش ہے - اس کی خوبیوں بیان ایک

الگ مضمون میں کیا گیا ہے چنانچہ ہم اس سے قطع نظر کرتے ہوئے اقبال کی شاعرانہ خوبیوں کی طرف لوٹتے ہیں اقبال کے پاس تشبیہات کا وافر خزانہ موجود ہے وہ ایک منظر کو کئی رنگوں میں پیش کر سکتے ہیں۔ اس کی ہر صورت دلکشی میں دوسری سے کم نہیں ہوتی۔ شام کا منظر انھوں نے کئی جگہ بیان کیا اور ہر جگہ مختلف انداز میں بیان ہوا ہے اس کا ذکر مسجد قرطبہ والے مضمون میں موجود ہے۔ اس لئے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ندی کے بہتے ہوئے پانی سے بھی اقبال کو بڑی محبت ہے اور انھوں نے اس کا ذکر کئی جگہ کیا ہے میں صرف دو مقامات سے مثال دوں گا۔ ان کی نظم "فلسفۂ غم" میں ندی کا بیان یوں ہے۔

آتی ہے ندی جبین کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

آئینہ روشن ہے اس کا صورت رخسار حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور

ہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے ہو گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے ہو گئے

جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی

ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثل تار سیم ہے

ایک اصلیت میں ہے نہر روان زندگی
گر کے رفعت سے ہجوم نوع انساں ہو گئی

یہاں اقبال نے ندی کو زندگی سے تشبیہ دی ہے یہی تشبیہ ساقی نامہ میں بھی استعمال ہوئی ہے مگر باندازِ دگر۔ ساقی نامہ میں ندی کا منظر دیکھئے۔

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی

اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی!

رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

ذرا دیکھ اے ساقی لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

اقبال کو ندی کی روانی اس لیئے پسند ہے کہ یہ زندگی کا پیام دیتی ہے۔ علامہ اقبال نے مناظرِ فطرت کو ہمیشہ اپنے خیالات کا اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور ہر دفعہ ان کیلئے بڑے حسین دل پذیر پیکر تراشا ہے۔ شام کا منظر دیکھ کر انھیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سورج شام کی دلہن کو مہندی لگا رہا ہے اور پھولوں نے سرخ جوڑے پہن رکھے ہیں اور کبھی وہ اسے ایک سوداگر کے روپ میں دیکھتے ہیں جو لعلِ بدخشاں کے ڈھیر آسمان پر چھوڑ گیا ہو ایک دوسرے موقع پر وہ افق کے طشت سے شام سیاہ قبا کو لالے کے پھول مارتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ ان کے مناظر اتنے دلکش ہوتے ہیں کہ دریا کا پانی ان کو اٹھ اٹھ کر دیکھتا ہے۔ وہ درختوں کو صف باندھے ہوئے دیکھتے ہیں اور ندی کے صاف پانی سے ان کی تصویر اتروا تے ہیں جب پھولوں والی ٹہنی جھک جھک کر پانی کو چھوتی ہے تو اقبال کو یوں لگتا ہے جیسے کوئی حسین آئینہ دیکھتا ہو، جب شبنم پھولوں پر گرتی ہے تو سمجھتے ہیں کہ وہ ان کو وضو کرانے آئی ہے اپنی نظم "جگنو" میں وہ جگنو کو رنگ برنگی تشبیہات سے سجاتے ہیں، پھولوں کی انجمن کی شمع، آسمان سے اڑ کر آیا ہوا ستارہ، مہتاب کی کرن، شب کی سلطنت میں دن کا سفیر، مہتاب کی قبا کا تکمہ، سورج کے پیرہن میں ذرہ کہہ کر انھوں نے جگنو کو ہمارے لیئے بے حد دلکش چیز بنا دیا ہے۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا — غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ گرا ہے کوئی مہتاب کا قبا کا — ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ!
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو!

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

"حدی" میں انھوں نے ناقہ کے حسن کو کتنا ارفع و اعلیٰ بنا دیا ہے اور ساتھ ہی ساربان کے جذبات کا دلکش اظہار بھی ہے۔ شاہدِ رعنا، دلکش و زیبا، رشکِ حور، غیرتِ لیلیٰ، دخترِ صحرا، لختِ دلِ ساربان، لکۂ ابرِ رواں، کشتیٔ بے بادباں کہہ کر انھوں نے اس کو جمیل تر بنا دیا ہے اور ناقہ ایک محبوبہ کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے اس نظم کے صرف دو بند ملاحظہ ہوں یہ نظم روانی اور موسیقیت میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی ساربان کے گیت میں وہی روانی ہے جو ناقہ کی رفتار میں ہے۔

دلکش و زیبا ستی — شاہدِ رعنا ستی
رشکِ حور استی — غیرتِ لیلا ستی
دخترِ صحرا ستی
تیز ترک گامزن منزلِ ما دور نیست

لکۂ ابرِ رواں — کشتیٔ بے بادباں
مثلِ خضر راہ داں — بر تو سبک ہر گراں

لحن دل ساربان

تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست

ٹیپ کا شعر یاد دلاتا ہے کہ ناقہ اپنی منزل کی طرف رواں ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال نے زندگی کو ناقہ کے روپ میں دیکھا ہے اور وہ اسے منزل کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ انسان کی منزل کبھی نزدیک ہے اور دور بھی۔ منزل کو پا لینے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کا یہ یقین ہو کہ منزل اس سے دور نہیں اور ذرا کوشش اور ہمت سے وہ اسے پا لے گا۔ اسی طرح ہر گام پر وہ اپنی ہمت میں اضافہ کرتا رہتا ہے ساربان کا سفر زندگی کا سفر ہے۔ ہر قدم پر یہ مصرع تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست ہمیں آگے بڑھنے پر اکساتا رہتا ہے۔ "ناقہ میں اقبال کو اسی لیے دلچسپی ہے کہ وہ صحراؤں کا سینہ چیرتے ہوئے آگے بڑھتی رہتی ہے اور ہر گراں اس کے لیے سبک بن جاتا ہے۔ بر تو سبک گراں کی ترکیب کا اردو ترجمہ ساقی نامے میں خودی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ خودی کی قوتوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا "سبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں" بہر حال ناقہ سے ان کی دلچسپی ان کے فلسفہ زندگی ہی کا ایک حصہ ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی حالت زار کو وہ شمع، پروانے، اور ساقی، کارواں، لیلیٰ اور دشت کے استعاروں سے ان کرتے ہیں۔ شمع و شاعر کے یہ شعر دیکھیں ؎

وہ جگر سوزی نہیں وہ شعلہ آشامی نہیں
فائدہ کیا ہو گر دو شمع پروانے رہے!

خیر تو ساقی سہی لیکن پلائے گا کسے
اب نہ وہ مے کش رہے باقی نہ مے خانے رہے

ہیں خاموش وہ دشت جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلیٰ رہی لیلیٰ کے پروانے رہے

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

پیلی کے استعارے کو انھوں نے "بزم انجم" میں کسی اور مقصد کے لئے استعمال کیا ہے
یہ نظم بھی تشبیہات و استعارات کی ندرت کے لئے قابل دید ہے۔

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو — طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنادیا شفق نے سونے کا سارا زیور — قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی — چمکے عروس شب کے موتی وہ پیارے پیارے

اقبال نے اپنے اشعار میں حروف والفاظ کی تکرار سے ترنّم پیدا کیا ہے۔ یہ خوبی میر تقی میر کے یہاں بھی پائی جاتی ہے چند شعر دیکھئے جن میں تکرار حروف یا الفاظ سے موسیقیت نے جنم لیا ہے۔

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار

اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

یہاں اودے اودے اور نیلے نیلے کی تکرار نے رنگوں کا دریا بہا دیا ہے ہر طرف رنگا رنگ پھول آنکھوں کے سامنے مسکرانے لگتے ہیں۔ ساقی نامہ کے ان دو اشعار میں ل اور ک کی تکرار سے ندی کی رفتار اس کے رکنے، رک کر آگے بڑھنے اور پھسلنے کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی! — اٹکتی لچکتی، سرکتی ہوئی!!!
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی — بڑے پیچ کھاکر نکلتی ہوئی!

ان کی نظم "کشمیر" میں الفاظ وحروف کی اسی تکرار نے ایسا سماں باندھا ہے کہ "کشمیر" کا بہاریہ منظر مجسم ہو کر نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

رفت ببر کا شغر کشا کوہ تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر

باد بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج
صلصل سار زوج زوج بر سر نارون نگر

لالہ بہ خاک بر دمید موج بہ آب جو تپید
خاک شرر شرر ببیں آب شکن شکن نگر

زخمہ بہ تار ساز زن بادہ بہ ساتگین بریز
قافلہ بہار را انجمن انجمن نگر

سفر افغانستان کے دوران قندھار کی تعریف میں جو اشعار ہیں۔ ان کی صوتی کیفیت سے شاعر نے سنجیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ہ کی تکرار سے ایک قسم کی ہیبت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ منظر جمال سے زیادہ جلال کا حامل بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس الفاظ کے جوڑوں کی تکرار سے انھوں نے "کشمیر" والی نظم میں شگفتگی اور جمال کو پیدا کیا ہے۔

رنگ ہا بوہا ہوا ہا آب ہا
آب ہا تابندہ چوں سیماب ہا!

لالہ ہا در خلوت کہسار ہا!
نارہا یخ بستہ اندر نار ہا!

اسی طرح انھوں نے اشعار کے درمیان قافیہ لا کر موسیقیت اور ترنم پیدا کیا ہے یا پھر شعر کے اندر ہم قافیہ الفاظ لا کر اس میں ایک خاص صوتی کیفیت پیدا کی ہے۔

فصل بہار ایں چنیں، بانگ ہزار ایں چنیں
چہرہ کشا، غزل سرا، بادہ بیار ایں چنیں

از چشم ساقی مست شرابم
بے مے خرابم، بے مے خرابم

شوقم فزوں تر از بے حجابی
بینم نہ بینم، در پیچ و تابم

از من بروں نیست منزل گہ من
من بے نصیبم، راہے نیابم

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد؟ — گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن
تو سوز درون او، تو گرمیٔ خون او — باور نہ کنی چاکے در پیکرِ عالم زن

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

گیسوئے تابدار کو اور بھی تاب دار کر — ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں — یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

یہ ساری خوبیاں اقبال کے کلام میں خود بخود پیدا ہو گئی ہیں۔ اس میں شعوری کوشش کو بہت کم دخل ہے۔ اگر صفت صنعت کی خاطر آئے تو وہ شعر کے حسن کو مجروح کر دیتی ہے۔ اقبال کے شعروں میں نادر تشبیہات، خوبصورت استعارات، دلکش صنائع و بدائع، تکرار الفاظ و حروف، قافیہ اور ردیف کا ماہرانہ استعمال سب کچھ موجود ہے۔ مگر غیر فطری معلوم نہیں ہوتا۔ اور نہ ان سے ان کے خیالات میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

اقبال نے تشبیہہ اور استعارے کو ان کے ظاہری حسن سے متاثر ہو کر استعمال نہیں کیا۔ ان کی تشبیہات اور استعارات با مقصد ہوتے ہیں۔ انھیں صرف ظاہری حسن متاثر نہیں کرتا۔ بلبل کی آواز اور طاؤس کا رنگ بڑے حسین ہیں مگر ان کا یہ حسن علامہ کے فلسفہ

زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ ان کے اس جمال میں جلال موجود نہیں ہے اور رنگ و آواز سے آگے ان کا مقصد نہیں۔

گر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ

ان کی ہر تشبیہ کے پس منظر میں ایک مقصد کارفرما ہوتا ہے۔ شاہین کی تشبیہ کے متعلق انھوں نے خود اپنے ایک خط میں وضاحت کی ہے۔

شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ نہیں۔ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ۱۔ خوددار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ ۲۔ بے تعلق ہے کہ آشیاں نہیں بناتا۔ ۳۔ بلند پرواز ہے۔ ۴۔ خلوت پسند ہے۔ تیز نگاہ ہے۔" یہی حال ان کی دوسری تشبیہات کا ہے۔

سڈنی نے شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت "ایجاد" کو قرار دیا ہے۔ اس کے خیال میں شاعر نئے نقشے، نرالی صورتیں اور نئی دنیائیں ایجاد کرتا ہے۔ وہ ایسے مناظر دکھاتا ہے جو حقیقت میں موجود نہیں ہوتے اس نے افلاطون کو اس لئے شاعر قرار دیا ہے کیونکہ وہ مکالمات میں ایسی ایسی باتیں کرتا ہے۔ اور لوگوں کے مونہہ سے ایسے کلمات کہلواتا ہے جو درحقیقت کبھی نہیں کہے گئے۔ اس ایجاد کے لئے شاعر کے پاس تخیل کی بے پناہ قوت موجود ہے جس سے وہ سہارے لئے اک جہان تازہ پیدا کر دیتا ہے۔ عاشق ہرجائی میں انھوں نے اپنا یہی صفت کا یوں ذکر کیا ہے۔

زندگی الفت کی درد انجامیوں سے ہے مری
عشق کو آزاد دستورِ وفا رکھتا ہوں میں
یوں اگر پوچھے تو افلاس تخیل ہے وفا
دل میں ہر دم اک نیا محشر بپا رکھتا ہوں میں

محفل ہستی میں جب ایسا تنک جلوہ تھا حسن پھر تخیل کس لیے لا انتہا رکھتا ہوں میں

اسی لاانتہا تخیل کے ذریعے وہ اپنی شاعری میں نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ جاوید نامہ میں ان کے تخیل نے ان کو آسمانوں کی سیر کرائی اور ایسے مناظر دکھائے جو ان کی نظر سے کبھی نہیں گذرے تھے۔ اور ایسے اشخاص سے ان کی ملاقات کرائی جن کو انھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی نظموں میں جانور تو کیا بے جان اشیا تک آپس میں گفتگو کرتی ہیں ان کی بچوں کے لیے لکھی ہوئی نظموں میں پہاڑ اور گلہری، مکڑا اور مکھی اور بکری اور گائے آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ ان سے بچے اخلاقی سبق سیکھتے ہیں۔ جبریل اور ابلیس ہمارے سامنے یوں گفتگو کرتے ہیں جیسے ہم ان کو دیکھ رہے ہوں۔ لینن کو وہ خدا کے حضور میں لے جاکر سرمایہ پرستی کا سفینہ ڈبونا چاہتے ہیں۔ فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور روح ارضی مجسم ہو کر ان کا استقبال کرتی ہے۔ قبر مردے سے اور مردہ قبر سے محو تکلم ہیں اور خود اقبال رومی سے اسرار حیات دریافت کرتے رہتے ہیں اور زندگی کے کھیل میں رازی کو ہارتا ہوا اور رومی کو فتحیاب ہوتا ہوا دکھا کر اقبال خوشی سے تالیاں بجاتے ہیں۔ شاہین کی خود کلامی ہم کو قوت اور بے نیازی کا سبق پڑھاتی ہے وہ محراب گل افغان جیسے کردار وضع کرتے ہیں۔ حتی کہ زندگی کے ڈرامے میں خدا اور ابلیس بھی زندہ کردار بن کر سامنے آتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں عقاب اور چیونٹی کی گفتگو سے ہم پر پستی اور بلندی کا راز ظاہر ہوتا ہے۔ موج اور ساحل کی باتوں سے عمل پیہم کی اہمیت اجاگر ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ وہ ہر لمحہ ایک نیا طور اور نئی برق تجلی لے کر آتے ہیں۔ اور ہر لمحہ حسن کا ایک جلوہ دکھاتے ہیں۔

دل نہیں شاعر کا ہے کیفیتوں کا رستخیز کیا خبر تجھ کو درون سینہ کیا رکھتا ہوں میں

آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے مضطرب ہوں دل سکوں نا آشنا رکھتا ہوں میں
گو حسین تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر حُسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں

ان کا بے پناہ تخیل ان میں بے باکی اور جرأت پیدا کرتا ہے اور وہ جب انسان کی نمائندگی کرتے ہوئے خدا سے ہم کلام ہوتے ہیں تو اپنا اور اس کا مقابلہ شروع کر دیتے ہیں وہ تخلیق اور ایجاد میں انسان کو خدا کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے خدا اور انسان کے درمیان ایک مکالمے میں انسان کی تخلیقی قوتوں کا اظہار کیا ہے۔ اس نظم میں اقبال کی جدتِ فکر اور ندرتِ خیال دیکھنے کے قابل ہے۔ خدا کہتا ہے کہ میں نے ساری دنیا کو ایک مٹی سے بنایا مگر انسان نے ایران و توران کی تقسیم پیدا کر لی میں نے لوہا پیدا کیا تو اس نے تیر و تلوار بنا لئے۔ میں نے چمن اور درخت پیدا کئے تو اس نے ان کو کاٹنے کیلئے ہتھیار بنا لئے۔ میں نے خوشنوا پرند پیدا کئے تو اس نے ان کو قید کرنے کے لیے قفس تیار کئے۔ اس پر انسان بھی خاموش نہیں رہتا اور وہ اپنی تخلیقی قوتوں کا ذکر خدا سے کہیں زیادہ زوردار انداز میں کرتا ہے۔ اور پھر خدا سے پوچھتا ہے کہ بتا تیری تخلیق بہتر ہے کہ میری۔ تو نے رات بنائی تو میں نے اس کو روشن کرنے کے لئے شمع ایجاد کی۔ تو نے مٹی بنائی میں نے اسے ساغر میں بدل دیا۔ تو نے بیابان، کوہسار اور مرغزار بنائے تو میں نے خیابان گلزار اور باغ تیار کئے تو نے پتھر بنایا تو میں نے اس میں سے آئینہ نکالا۔ تو نے زہر بنایا

لہ اقبال ایک جگہ کہتے ہیں۔

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں، اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں میں

تو میں نے میٹھا شربت بنایا۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم | سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی | خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم | من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

خیال تنگ نظر ملا نہیں ہے۔ وہ مصلح ضرور ہے مگر شاعر بھی ہے۔ یہاں ایک مولوی ... کا فتویٰ دے سکتا ہے مگر اقبال فنکار ہے۔ چنانچہ اس کا یقین ہے کہ کار نادر خواہ گناہ کیوں نہ ہو وہ ثواب کا درجہ حاصل کر لیتا ہے [۱]

گر از دست تو کار نادر می آید!
گناہے ہم اگر باشد ثواب ست

چنانچہ خیال کی ندرت اس کے احساس کی چنگاری کو شعلہ بنا دیتی ہے اور وہ واعظ شہر کو مشورہ دیتا ہے کہ برہمن سے اس بات پر ناراض نہ ہو کہ وہ بتوں کو سجدہ کرنے کو کہتا ہے۔ ہمارے ... نے بھی تو فرشتوں سے کہا تھا کہ وہ آدم کے بت کو سجدہ کریں۔

مرنج از برہمن اے واعظ شہر | گر از ما سجدہ پیش بتاں خواست
خدائے ماکہ خود صورت گری کرد | بتے را سجدہ از قدسیاں خواست

ہم سب کعبے جانے کو بیتاب رہتے ہیں اور اسے بہت بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔ اقبال اس راہ پر چلنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ یہ بے خطر ہے اور ان کے نزدیک زندگی جفا طلبی سے عبارت ہے۔

بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بکعبہ نہ کردم کہ راہ بے خطر است

---

[۱] گوئٹے کہتا ہے کہ "شاعر کا تھوڑا بہت بے دین ہونا ضروری ہے"

وہ خدا سے کہتا ہے کہ اگر آدم کو زوال نصیب ہوا تو یہ زوال خود خدا کی ذات کا ہوگا کیونکہ آدم ایک ایسا ستارہ ہے جس سے ذات باری کا جہاں روشن ہے۔

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

ان کی رعنائی افکار، شوخی گفتار، اور بلند مقامی کو ذیل کے اشعار میں دیکھئے:

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی
ہر شوق نہیں گستاخ ہر جذب نہیں بیباک
فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا!
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد!
مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشت سادہ وہ تیرا جہان بے بنیاد
مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انھیں کا کام ہے یہ جنکے حوصلے ہیں زیاد

یہ تونے کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لئے لامکاں میرے لئے چار سو

نہ کر تقلید اے جبریل مرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

مزی اندر جہانے کور ذوقے!
کہ یزداں دارد و شیطاں نہ دارد

اقبال نے تخیل کی بے پناہ قوت، جذبات کی شدت، رعنائی فکر، اور ندرت خیال سے اپنا پیغام لوگوں تک پہونچایا کہ وہ ان کے دلوں میں گھر کر گیا اور اقبال ایک خشک واعظ اور مصلح کے علاوہ شاعر رنگین نوا بھی بن گئے۔ ایسا شاعر رنگین نوا جس نے دیدۂ بینائے قوم کے فرائض بھی انجام دیئے۔ اقبال ایک ایسا شاعر اور پیغامبر ہے جس کی ضرورت کا ذکر پروفیسر میکنزی نے اپنی کتاب انٹروڈکشن ٹو سوشیالوجی میں کیا ہے۔

"غالباً ہمیں پیغمبر سے زیادہ عہد نو کے شاعر کی ضرورت ہے۔ یا ایک ایسے شخص کا وجود ہمارے لئے مفید ثابت ہوگا جو شاعری پیغمبری کی دوگونہ صفات سے متصف ہو۔ عہد ماضی کے شاعروں نے ہمیں فطرت سے محبت کرنے کی تعلیم دی ہے انھوں نے ہمیں اس قدر ژرف نگاہ بنا دیا ہے کہ ہم مظاہر فطرت میں انوار ربانی کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم ابھی ایک ایسے شاعر کے منتظر ہیں جو ہمیں اسی وضاحت کے ساتھ پیکر انسانی میں صفات الٰہی کے جلوے دکھائے۔۔۔ جو اس حقیقت پر ہماری آنکھیں کھول دے کہ ہمارے بلند ترین نصب العین روزمرّہ کی زندگی میں پورے ہو رہے ہیں اور اگر زندگی کو ترقی دینے کی سعی کی جائے تو ہمیں محض ارباب ریاضت اور نفس کشی ہی کا موقع نہ ملے گا بلکہ ایسا ارفع و اعلیٰ مقصد حاصل ہو جائے گا جو تمام خیالات تمام جذبات اور تمام مسرتوں کو ترقی کے بلند مقام پر پہونچا سکتا ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم کو اقبال کی صورت میں ایک ایسا شاعر مل گیا جس میں پیغمبری اور شاعری کی صفات جمع ہو گئی ہیں۔

دیدۂ بینائے قوم

محفل نظم حکومت چہرۂ زیبائے قوم
شاعر رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ!

اقبال ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے ان کے والد اور والدہ دونوں کو مذہب سے گہرا لگاؤ تھا۔ چنانچہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اقبال نے مذہب کی گود میں پرورش پائی۔ پھر ان کے استاد شمس العلما میر حسن نے اقبال کے ان مذہبی رجحانات کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا اور بالآخر اقبال پر مذہب کا رنگ اتنا پختہ ہو گیا کہ مغرب کی لادینی تعلیمات اور فلسفے کی موشگافیاں بھی اسے مٹا نہ سکیں۔ ماں باپ کے فیضان نظر اور تربیت کا اثر انھوں نے حضرت اسماعیل کی مثال دے کر واضح کیا ہے۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

انھیں تجربہ ہے کہ والدین کا دیا ہوا سبق اہل مدرسہ کی تعلیم پر غالب آجاتا ہے علامہ

اقبال جاوید سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو ہے اس کا مذاق عارفانہ
جو ہر میں ہو لاالٰہ تو کیا خوف تعلیم ہو گو فرنگیانہ

اسی عارفانہ مذاق نے ان کی تربیت کی تھی۔ اس لئے فرنگیانہ تعلیم کا جادو ان پر نہ چل سکا۔ اور وہ ہمیشہ مسلمانوں سے محبت کرتے رہے۔ اور ان کی حالت سدھارنے کا ان کو ہر وقت خیال رہتا۔ وہ شب و روز اس فکر میں رہتے کہ مسلمانوں کو پستی کے گڑھے سے کیونکر نکالا جائے اور ہندوستانیوں کو غلامی کی زنجیر سے کس طرح نجات دلائی جائے۔ "گل رنگین" کا اطمینان قلب ان کو کھلتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ زخمی شمشیر ذوق جستجو رہتے تھے۔ دور اولین کی شاعری میں وہ ہر چیز سے سوال کرتے نظر آتے ہیں اور خفتگان خاک سے پوچھتے ہیں۔

جستجو میں ہے وہاں بھی رُوح کو آرام کیا
واں بھی انساں ہے قتیل ذوقِ استفہام کیا

اور آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غلامی کی زنجیر توڑنے کے بعد ہی ترقی کی منزل پائی جا سکتی ہے۔ اور ان زنجیروں کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے اتحاد کے بغیر نہیں کاٹا جا سکتا۔ امتیاز ملت و آئین ہی اس خرابی کی جڑ ہے۔ اور اگر مذہبی جھگڑوں کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو اتحاد کا رستہ مل سکتا ہے۔ چنانچہ ان کے پہلے دور کی شاعری میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل جل کر رہنے کا درس دیا گیا ہے۔ ہندو اور مسلمان کا آپس کا نفاق ان کو تڑپاتا رہتا ہے۔ اور ان کو کسی پہلو کل نہیں پڑتی۔ ان کا یہی جذبہ "صدائے درد" کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق انگیز ہے

بدلے یک رنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں

اور اپنی نظم "تصویرِ درد" میں کہتے ہیں۔

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

یہاں قوم سے مراد ہندوستانی قوم ہے۔ اس وقت وہ مذہب کو سیاست سے الگ کر کے دیکھتے اور جغرافیائی حدود سے بننے والی قوم میں محبت کی روح پھونکنا چاہتے تھے۔ "ترانہ ہندی" اور "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" ان کے اسی رجحانِ طبع کو ظاہر کرتے ہیں۔ "نیا شوالہ" میں ان کو خاکِ وطن کا ہر ذرہ دیوتا نظر آتا ہے۔ اور وہ دیر و حرم سے رشتہ توڑ کر ایک نیا شوالہ بنانا چاہتے ہیں جہاں واعظ کا وعظ اور برہمن کے افسانے نہ ہوں جس کے بھگت محبت کے دین پر ایمان رکھتے ہوں۔ اسی محبت کا پرچار انھوں نے مذکورہ با نظم میں کیا ہے۔ اور ملت سے احتراز کا درس دیا ہے۔ کیونکہ وہ ایک مذہب اور آئین منحصر ہوتی ہے۔

اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

اس شعر میں قوموں کی بربادی کا باعث ملت کو قرار دیا گیا ہے کیونکہ ملت جغرافی حدود سے تشکیل پانے والے وطن کی بجائے اپنا رشتہ مذہب یا دین سے جوڑتی ہے اس

کے برعکس نظریۂ وطنیت کے حامل وطن کے مقابلے میں مذہب کو اہمیت نہیں دیتے اور وطن کی خاطر دوسری قوموں کا خون بہانے اور ان سے فریب کرنے سے باز نہیں رہتے مگر اقبال کی تربیت مذہب کی آغوش میں ہوئی تھی۔ اس لئے وہ پوری طرح اس سے قطع تعلق نہ کر سکے انہوں نے درمیانی راستہ یہ نکالا کہ مذہب وطنیت کے راستے میں حائل نہیں ہوتا۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

اسی مذہب سے لگاؤ نے بالآخر ان کو صحیح راستے پر لا ڈالا چنانچہ جب وہ انگلستان سے واپس لوٹے تو ان کا نظریہ بدل چکا تھا انگلستان میں انہوں نے انگریزی تہذیب اور انگریزی سیاست کا بغور مطالعہ کیا اس سے پہلے وطنیت کا نظریہ انہوں نے اس لئے اختیار کیا تھا کیونکہ ان کو پختہ یقین تھا کہ مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے۔ اب جو انہوں نے دیکھا کہ انگریزوں نے ہندوستان پر ہی نہیں بلکہ کئی دوسرے اسلامی ممالک پر بھی سیاست کے بل بوتے پر قبضہ کر رکھا ہے اور تہذیب حجازی کی رگوں سے خون نچوڑ کر اسے مردہ بنا دیا ہے تو ان پر نظریۂ وطنیت کی شیطنت ظاہر ہوئی اور ان پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ مسلمان جب تک نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر تک ایک نہیں ہو جاتے ان کی نجات ممکن نہیں چنانچہ وہ نظریۂ وطنیت سے ملت کی طرف لوٹ آئے۔ علامہ اقبال کی زندگی میں انگلستان کا یہ سفر نہ صرف مادی اعتبار سے اہم ہے بلکہ یہ باطنی معنی بھی رکھتا ہے۔ وہ ہندوستان کی جغرافیائی حدود کو توڑ کر آگے بڑھے تو ان کی نظریاتی دنیا میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ اس سفر نے ان کو ہندوستان اور وطنیت کی زنجیروں سے آزاد کر دیا۔ اور پہلی بار ان کی شاعری میں ملت سے گریز کی بجائے اس پر نازاں ہونے کا

خیال نظر آیا۔

ع فدا ہو ملّت پہ یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا

یہاں انھیں پہلی بار ہندوستان کے باہر کے مسلمانوں کی حالت زار نظر آئی۔ "جزیرہ سسلی" پر ان کی نظم اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ پہلی بار ان کی نظریں ہندوستان کی حدود کو توڑ کر اس سے باہر کی اسلامی دنیا کی حالت دیکھتی ہیں اور وہ اس پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ یورپ کے قیام کے دوران انھوں نے بہت کم لکھا ہے۔ وہاں سے واپس آکر ان کا یقین اس بات پر پختہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی بقا نظریہ ملی میں ہے۔ اور وطنیت کا سیاسی تصور ان کے لیے بڑا خطرناک ہے۔ اب وہ اسلام کو مذہب اور وطنیت دونوں میں حرف آخر کا درجہ دیتے ہیں اور چونکہ اسلام جغرافیائی حدود میں قید نہیں اور ساری دنیا کے مسلمان بھائی بھائی ہیں اس لئے وہ وطنیت کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے خطرہ قرار دیتے ہیں۔ وہ ترانہ ہندی کے بجائے ترانہ ملی لکھتے ہیں۔ اور وطن کے ہر ذرے کو دیوتا سمجھنے کی بجائے وطنیت کو اقوام جہاں کے لئے سب سے بڑی تباہی قرار دیتے ہیں۔

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی   رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی   دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے   تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے   کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے

قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

دین اور وطن کی اس جنگ کو اقبال نے خیبر کی جنگ قرار دیا ہے۔

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکہ دین و وطن

اس زمانہ میں کوئی حیدر کرار بھی ہے

کیونکہ لوگ وطنیت کو اپنا دین سمجھ کر اصل دین کو بھول گئے ہیں۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

نظریہ وطنیت کو نیشنلزم کے خوبصورت نام سے سجایا گیا ہے۔ نیشنلزم کے مطابق ہکسلے نے بھی انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کہتا ہے "یہ ایک بت پرستانہ مسلک ہے اور مشرکانہ مذہب ایسا مذہب جو فساد اور تفریق کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب وحدت انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اور جے۔ ایم۔ مرے J.M. Murray اپنی کتاب (Adam & Eve) میں لکھتا ہے:

"چونکہ انسانوں کے دل سے خدا کا عقیدہ نکل گیا ہے۔ اس لئے اس خالی مکان پر اس جدید مذہب شیطان نے قبضہ کر لیا ہے"

علامہ اقبال اپنے ایک خط میں رقم طراز ہیں۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود ملک پر ہے دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر لے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدرد نوع کی حیثیت سے ان کو یاد دلاتا

مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی غرض سارے بنی آدم کی نشو و ارتقا ہے نسل اور حدود کی بنیاد پر قبائل اور قوموں کی تنظیم اجتماعی ترقی اور تربیت کا وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

مگر ظاہر ہے کہ اس نظریئے کو عارضی اور وقتی اہمیت نہیں جاتی بلکہ اس کی بجائے اسے ایک مستقل قدر بنایا جا رہا ہے۔ آج انہیں خیالات کے حامل لوگ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان دیوار بنے ہوئے ہیں۔ اور پاکستان کے وجود کو مٹانے کے درپے ہیں۔ کاش وہ علامہ اقبال کی شاعری اور قرآن کو اپنے لئے مشعل راہ بناتے۔ مگر مغرب کے شعبدہ بازوں سے ان کی عقل پر پردہ ڈال رکھا ہے۔

گر د مغرب آں سراپا مکر و فن　　　اہلِ دیں را داد تعلیمِ وطن

کیونکہ اسی میں مکار مغربیوں کا فائدہ ہے اور تھا اچھے خاصے دیندار لوگ اس جال میں پھنس گئے اور ہندوستانی قوم کو جغرافیائی حدود میں قید کرنے لگے۔ مولانا حسین احمد مدنی نے جب ایسے خیالات کا اظہار کیا تو علامہ اقبال نے ان کے متعلق یہ اشعار کہے۔

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ور نہ　　　ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است　　　چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　　اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

وہ تو ایسی آزادی بھی نہیں چاہتے جسے حاصل کرنے کے لئے دین سے ہاتھ دھونے پڑیں۔

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت

ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا (۵)

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ علامہ اقبال کو اپنے وطن سے نفرت ہو گئی اور انہوں نے اپنی آئندہ شاعری میں وطن کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہے جو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں کہ اقبال صرف وطنیت کے سیاسی تصور کے خلاف ہیں۔ ورنہ ان کو وطن اب بھی اتنا ہی عزیز ہے جتنا پہلے تھا۔ انہوں نے ہندی مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مملکت کا مطالبہ کیا تاکہ وہ اسلامی ریاست کا قیام عمل میں لا سکیں اور اس کے ذریعہ دوسرے اسلامی ممالک سے اتحاد پیدا کریں۔ وہ وطن کے اس وقت مخالف بنتے ہیں جب وہ اسلام کی عالمگیر اخوت کو ختم کر دیتا ہے۔ ورنہ انہیں ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ محبت رہی۔

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

جاوید نامہ میں روحِ ہندوستان کی پکار سنیئے۔ اس میں کتنا درد ہے اور دیکھیے انہوں نے جعفر اور صادق جیسے غداروں کے لئے کتنے سخت لفظ استعمال کئے ہیں۔ انہیں کی بدولت ہندوستان جیسا بے نظیر ملک خاک و خوں میں لوٹ رہا ہے۔ اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اقبال ان کو معاف نہیں کر سکتے۔

جعفر از بنگال صادق از دکن
ننگِ ملت ننگِ دیں ننگِ وطن

ناقبول و ناامید و نامراد
ملتے از کارِ شاں اندر فساد

ملتے کو بندِ ہر ملت کشاد
ملک و دینش از مقامِ خود فتاد

می ندانی خطۂ ہندوستاں
آں عزیزِ خاطرِ صاحب دلاں

خطۂ ہر جلوہ اش گیتی فروز
درمیانِ خاک و خوں غلطد ہنوز

در گلش تخمِ غلامی را کہ کشت
ایں ہمہ کردارِ آں ارواحِ زشت

آج بھی صادق اور جعفر موجود ہیں مگر انھوں نے اب دوسرا بہروپ بھرا ہے۔ اب وہ وطنیت کا علم لے کر اٹھے ہیں اور اسلام کے پرچم کو تار تار کر رہے ہیں۔ وہ تو بظاہر دین کے غم میں دبلے ہو رہے ہیں مگر ان کا باطن صاف نہیں ہے۔ اس زمانے کے جعفروں اور صادقوں سے خدا محفوظ رکھے۔

پیش ازیں چیزے دگر مسجود او
در زمان ما وطن معبود او!

ظاہر او از غم دیں دردمند
باطنش چوں دیریاں زنار بند

ملتے را ہر کجا غارت گرے است
اصل او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از روح جعفر الاماں

الاماں از جعفران ایں زماں

اقبال پنجاب میں پیدا ہوئے انھیں اس کی بربادی کا بھی افسوس ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کا دامن چھوڑ دیا تو سکھوں نے ان پر غلبہ پا لیا۔ اور دین اسلام کی تباہی کا باعث ہوئے۔

مرد حق از غیر حق اندیشہ کرد
شیر مولا روبہی را پیشہ کرد

از دلش تاب و تب سیماب رفت
خود بدانی آنچہ بر پنجاب رفت

خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد
اندراں کشور مسلمانی بمرد

حرف رومی در دلم سوزے فگند
آہ پنجاب آں زمین ارجمند

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ علامہ کو اپنی جنم بھومی سے محبت ہے اور وہ اس سرزمین کی خوش حالی اور ترقی کے خواہش مند ہیں مگر ساتھ ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ دوسرے اسلامی ممالک سے اتحاد کا رشتہ برقرار رہے کیونکہ تمام دنیا کے مسلمان اسلام

کے رشتۂ اخوت میں بندھے ہوئے ہیں اور ان کی طاقت کا راز اکٹھے رہنے میں ہی ہے مسلمانوں کی رسوائی کا باعث یہ ہے کہ وہ پاکستانی، ہندی، افغانی، اور پٹھان ہونے کو اسلام سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ مسلمان صرف اسی صورت میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ جغرافیائی حدود کو توڑ کر بے کراں ہو جائیں آج ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان ممالک آپس میں دست و گریباں اور اسی لئے انھیں ذلتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ایک چھوٹا سا اسرائیل تمام عرب ممالک بلکہ اسلامی دنیا کے لئے رسوائی کا باعث بنا ہوا ہے اس وقت اگر تمام مسلمان ممالک مل کر ایک اسلامی بلاک قائم کر لیں تو یہ ایک بہت بڑی طاقت بن سکتے ہیں۔ اقبال اس حقیقت سے آشنا تھے۔ چنانچہ انھوں نے ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھنے اور تمام مسلمان کے ایک ہو جانے پر بڑا زور دیا ہے۔

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی دنیا میں تو رسوا ہوا

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر
جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائیگا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کے مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہگذر

علامہ اقبال کے نزدیک اسلام ساری انسانیت کا مذہب ہے یہی ایک ایسا دین ہے۔ جو بنی آدم کو ایک مرکز پر اکٹھا کر سکتا ہے۔ انگریز کی سیاست یہ ہے کہ ملکوں کو ایک دوسرے

سے لڑ اکر اپنی بڑائی کو قائم رکھے۔ آج امریکہ اور روس اسی روش پر گامزن ہیں۔ ویتنام اور اسرائیل دونوں ہی اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود

اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم

آج[1] مشرقی اور مغربی پاکستان کے اتحاد کا مسئلہ درپیش ہے۔ اگر ہم مذہب کا دامن تھام لیں اور صحیح طور پر مسلمان بن جائیں تو مشرقی اور مغربی پاکستان تو کیا ساری دنیا کے اسلامی ملکوں کے مسائل حل ہو جائیں۔ بلکہ یہ بات انسانیت کے اتحاد کی طرف بہت بڑا قدم ہوگا۔ اقبال کا یہ پختہ یقین تھا کہ اسلام تمام انسانیت کے لئے بھلائی کا پیغامبر ہے اور یہی ایک ایسا دین اور نظامِ حیات ہے جو سارے انسانوں کو ایک کر سکتا ہے اور ان کو ملتِ واحد بنا سکتا ہے۔ اقبال نے اسلام کو اس لئے بہترین نظامِ حیات کے طور پر پیش نہیں کیا کہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا تھا بلکہ اس نے تمام معاشرتی نظاموں سے مقابلہ کر کے اس کو دوسروں سے بہتر پایا ہے۔ وہ ایک خط میں ڈاکٹر نکلسن کے نام لکھتے ہیں۔

"میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوت اور میری طلب و جستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصدِ وحید ذات پات

---

[1] یہ سطور ۱۹۶۹ء میں لکھی گئیں۔

رتبہ و درجہ، نسل و رنگ کے تمام امتیازات کو مٹا دیتا ہے۔ اسلام دنیوی معاملات کے باب میں بھی نہایت ژرف نگاہ اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ و نعم کے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے اور حسن معاملت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اسی قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یورپ اس گنج گرانمایہ سے محروم ہے اور متاع اسے ہمارے ہی فیض سے حاصل ہو سکتی ہے۔ [۱]"

قرآن صرف الہٰیات کی کتاب نہیں بلکہ اس میں انسان کے معاش و معاد کے مسائل کو بھی حل کیا گیا ہے۔ اسی لئے اقبال نے جاوید نامہ میں روسیوں کو قرآن حکیم کا دامن پکڑنے کی دعوت دی ہے کیونکہ قرآن ایک ایسا معاشی نظام پیش کرتا ہے جو اشتراکی مقاصد کو بھی پورا کرتا ہے اور اس کی خامیوں سے بھی پاک ہے۔ قرآن سرمایہ داری کا سب سے بڑا مخالف ہے چنانچہ اقبال بھی اسے پسند نہیں کرتے۔ وہ روسیوں کے جوشِ عمل کو سراہتے ہیں اور انہیں قرآن کے انقلابی آئین پر نظر ڈالنے کی دعوت دیتے ہیں[۲]۔ اسلام سے ان کی یہ محبت الفاظ کی حد تک ہی نہ تھی۔ وہ زبانی دعوؤں کے قائل نہ تھے۔ وہ خود اسلامی قوانین کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ اور حلال اور حرام کے بارے میں بڑی جستجو سے کام لیتے تھے۔ مقدمات کی پیشی میں آئے ہوئے لوگوں سے پھول، پھل، مٹھائی کا نذرانہ لینے تک میں وہ بڑے محتاط تھے۔ وہ ایک خط میں سید سلیمان ندوی سے دریافت کرتے ہیں۔

" دریافت طلب امر یہ ہے کہ موکلین وکلا کے پاس جب مقدمات کی پیشی

---

[۱] اقبال نامہ ص ۴۷۲ [۲] ملاحظہ ہو اقبال اور سوشلزم۔

کے لئے آتے ہیں تو ان میں سے بعض پھل، پھول، یا مٹھائی کی صورت میں ہدیہ لے آتے ہیں۔ یہ ہدایا فیس مقررہ کے علاوہ ہوتے ہیں اور وہ لوگ اپنی خوشی سے لاتے ہیں؟ کیا یہ مال مسلمان کے لئے حلال ہے؟[۱]

اقبال خود وکیل تھے۔ اس لئے ظاہر ہے انھوں نے یہ بات اپنی ذات کے لئے پوچھی تھی۔ چنانچہ یہ کہنا غلط ہے کہ وہ پوری طرح اسلام پر عمل پیرا نہ تھے۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ اقبال اشتراکی گو چہ گردوں کے نظام سے مطمئن نہیں ہیں کیونکہ ان کے خیال میں یہ بھی ملوکیت کی ہی ایک قسم ہے[۲] اسی جمہوریت کو وہ مسلمانوں کے حق میں سم قاتل خیال کرتے ہیں۔ درحقیقت جمہوری قبا کے اندر دیو استبداد چھپا ہوا ہے[۳] یہ آزادی کا مژدہ نہیں بلکہ غلام بنانے کی ایک نئی چال ہے۔ دراصل دوسرے فلسفیوں کی طرح اقبال بھی ایک مثالی معاشرہ پیدا کرنا چاہتے تھے اور جمہوریت یا سوشلزم ان کے نزدیک اس معاشرے کو پیدا کرنے کے قابل نہ تھے۔ وہ ایک ایسا معاشرہ چاہتے تھے۔ جہاں ہر شخص اعلیٰ انسانی اقدار کا حامل ہو۔ ان کے ہاں یہ معاشرہ مومنین سے تشکیل پاتا ہے۔ اقبال ڈاکٹر نکلسن کو پروفیسر میکنزی کے یہ الفاظ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"کامل انسانوں کے بغیر سوسائٹی معراج کمال پر نہیں پہونچ سکتی اور اس غرض کے لئے محض عرفان اور حقیقت آگاہی کافی نہیں بلکہ ہیجان اور تحریک کی قوت بھی ضروری ہے۔ جسے یوں کہنا چاہئے کہ یہ معمہ حل کرنے کے لئے ہم نورد

---

[۱] اقبال نامہ صفحہ ۱۱۰

[۲] ملاحظہ ہو جاوید نامہ میں ان کی نظم "اشتراکیت و ملوکیت"

[۳] دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب ۔۔۔ تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

حرات دونوں کے محتاج ہیں۔ غالباً عہد حاضرہ کے معاشری مسائل کا فلسفیانہ فہم وادراک بھی وقت کی اہم ترین ضرورت نہیں۔ ہمیں معلم بھی چاہیے اور پیغمبر بھی"[۱]

اور کامل انسان کس طرح پیدا ہو اس کا طریقہ انھوں نے اپنے فلسفہ خودی میں بتایا ہے۔ حکومت کا حق صرف مرد مومن کو حاصل ہے کیونکہ وہی بہترین معاشرے کا خالق ہو سکتا ہے۔ وہ مرد مومن جو "لینے" کی بجائے "دینے" کی پالیسی پر عمل کرتا ہے جو بے ایمانی سے کوسوں دور ہے۔ وہ افلاطون کے فلسفی بادشاہ اور نطشے کے انسان کامل سے بہتر ہے۔ وہ خود حکومت نہیں کرتا بلکہ خدا کی نیابت کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ اس لئے وہ انسانوں کے لئے خیر کا پیغامبر ہے۔ وہ اپنی قوت اور فکر وفہم سے معاشرے کو جنت کا نمونہ بنا دیتا ہے۔ اس کی نظر کبھی غیر کی کھیتی پر نہیں پڑتی۔ بلکہ وہ ہر وقت دوسروں کی حالت بہتر بنانے میں لگا رہتا ہے۔ چنانچہ اقبال سوسائٹی کو مرد مومن کے تابع بنانا چاہتے ہیں۔

گریز از طرز جمہوری غلامے پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

قوموں نے جمہوریت کے زور سے نہیں بلکہ انسان کامل کی مدد سے ہی ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ جب تک ایک مضبوط ارادے اور اعلیٰ فہم وادراک کا مالک شخص لیڈر نہ ہو کوئی جماعت اپنی منزل مقصود کو نہیں پا سکتی۔ خود اقبال نے ہندوستان کی آزادی کے لئے قائد اعظم کی قیادت پر بھروسہ کیا ہے۔ اور انھیں اپنے خطوط میں لکھا ہے کہ اس وقت وہی

---

[۱] اقبال نامہ صد ۶۲

مسلمانوں کی کشتی کو ساحل سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔ تاریخ عالم پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ پختہ کار مردوں نے اس کے دھارے کا رُخ بدل دیا ہے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ زمانہ ان پر نہیں بلکہ وہ زمانہ پر حکومت کرتے ہیں۔ نئے معاشرے کی تشکیل کے لئے ہمیشہ انسانِ کامل کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔

ہنوز ایں کارواں دور از مقام است　　　ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است

تو می دانی کہ ملت بے امام است　　　زکارِ بے نظام او چہ گویم

مگر یہ امام مردِ مومن یا انسانِ کامل جلدی جلدی پیدا نہیں ہوتے۔ ان کے لئے ہزاروں سال نرگس انتظار کرتی ہے۔ زندگی عرصۂ دراز تک پیچ و تاب کھاتی ہے۔ تب کہیں ایک بے تاب جان پیدا ہوتی ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

عمرہا در خویش می پیچد وجود
تا یکے بے تاب جاں آید فرود[1]

اقبال کے مردِ مومن[2] میں یہ صفات پائی جاتی ہیں۔

---

[1] اور میر تقی میر کہتے ہیں۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں "مردِ مومن" والا باب۔

۱۔ وہ قلندرانہ صفات کا حامل ہوتا ہے۔ اسے حکومت اور سلطنت کی خواہش نہیں ہوتی اور وہ قرآن پر پوری طرح عمل کرتا ہے۔

۲۔ اس کی امیدیں قلیل مگر مقاصد جلیل ہوتے ہیں۔

۳۔ وہ اطاعت اور ضبطِ نفس کے مراحل سے گزر کر نیابتِ الٰہی کے مرتبے پر فائز ہوتا ہے۔

۴۔ اس کی ایک نگاہ تقدیر بدل دیتی ہے۔ قوتِ بازو میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔

۵۔ جغرافیائی حدود کا پابند نہیں۔

۶۔ عشق اور عقل کا حاصل ہے۔

۷۔ خدمتِ خلق یکتا ہوتا ہے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اسلام ایک زندہ قوت ہے جو ایک بہترین معاشی اور معاشرتی نظام پیش کرتا ہے اور یہ بات بھی مسلّم ہے کہ ہم اسلام کے پیروکار ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم تو ذلیل و خوار ہیں اور اسلام کے مخالف سربلند ہیں۔ اس سوال کا جواب اقبال نے جوابِ شکوہ میں تفصیل سے دیا ہے اور ان کی شاعری کے آئینہ میں ہر مقام پر دیکھا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کا اقرار تو کیا ہے۔ مگر اپنے عمل سے اس اقرار کو ثابت نہیں کیا۔ اور جو عمل بھی کیا ہے وہ صرف روایتی اور تقلیدی ہے ان میں جدتِ کردار اور جوشِ کردار نہیں ہے۔ مسلمان نماز تو پڑھتے ہیں، مگر نماز کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ ان کی نمازیں بے سرور اور ان کا امام بے حضور ہے۔ وہ روزہ رکھتے ہیں مگر روزے کی طہارت سے کوسوں دور ہیں۔ وہ قربانی دیتے ہیں مگر اس جذبے سے محروم ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی قربانی میں تھا۔

غرض کہ ان کے اعمال سوزِ یقین اور ایمان کی حرارت سے خالی ہیں ۔ چنانچہ ان اعمال کا کوئی فائدہ نہیں ۔ اقبال بار بار ہمیں دلاتے ہیں کہ صرف قرآن کا پڑھنا ہی کافی نہیں بلکہ اس کی تلاوت یوں کرنی چاہئے جیسے وہ ہم پر نازل ہو رہا ہے اور اس کی گرمی سے پگھل کر ہم خود قرآن بن جائیں ۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے　　مسلمانوں میں خون باقی نہیں ہے
صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق　　کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

بغیر اللہ گردم تکیہ یک بار　　دو صد بار از مقام خود فتادم

خدا کے علاوہ کسی اور پر ایک بار تکیہ کریں تو دو سو دفعہ اپنے مقام سے گر جاتے ہیں ہم نے خدا کو چھوڑ دیا ہے اور اپنے مقام کو کھو چکے ہیں ۔ درحقیقت یہ امت مر چکی ہے ۔ مگر اپنی موت سے آگاہ نہیں ہے ۔

آہ قومے دل ز حق پرداختہ ۔
مُرد و مرگِ خویش را نشناختہ

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم تو اسلام کے پرستار ہیں اور اس پر جان دے سکتے ہیں ہم ہر وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں اور ان کی شان میں نعت خوانی کرتے ہیں ۔ اقبال کہتے ہیں کہ گفتار کے غازی بننے سے کوئی فائدہ نہیں ہے ۔ عشقِ رسول ؐ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر وقت نعت خوانی کرتے رہیں بلکہ یہ عشق اس وقت حاصل ہوتا ہے جب ان کے رنگ میں ڈوب جائیں ۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے مسلمان اگر تجھے رسول مقبول ؐ کی بتائی ہوئی راہوں پر نہیں چلنا ہے تو اپنی ناپاک زبان

پران کا پاک نام نہ لا۔

عشق می گوید کہ اے محکوم غیر　　سینۂ تو از بتاں مانند دیر
تا نداری از محمد رنگ و بو　　از درود خود میالا نام او

اور یہ صورت حال اس لئے پیدا ہوئی کہ مسلمان سوز یقین سے محروم ہے اسے اگر یقین کی دولت حاصل ہوتی تو وہ حضرت ابراہیم کی طرح آگ میں چھلانگ لگا سکتا تھا۔ خدا پر پختہ یقین انسان کو خوف سے نجات دیتا ہے چنانچہ بے یقینی بے حد خطرناک ہے۔

یقین مثل خلیل آتش نشینی　　یقین اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار　　غلامی سے ہے بد تر بے یقینی

غلامی کی زنجیریں جن میں مسلمان جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ خالی باتوں سے کاٹی نہیں جا سکتیں۔ یقین عمل کا پیش خیمہ ہے اور عمل کے بغیر آزادی کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

غلامی مسلمانوں کے لئے بڑی خطرناک ہے۔ غلام کی ہر چیز دوسروں کی ہوتی ہے غلام نہ اپنا آپ پہچان سکتا ہے۔ اور نہ خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے۔ ایمان کی روشنی غلامی کی تاریکی میں گم ہو جاتی ہے۔ غلاموں کی نماز ان کی تلاوت، ان کی عید سب روح سے خالی ہوتی ہیں اور صرف دکھاوے کی چیز بن جاتی ہیں۔ ان کے سجدے طویل ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کو کوئی اور کام نہیں ہوتا۔

بدن غلام کا سوز یقین سے ہے محروم　　کہ ہے سرور غلاموں کے روز و شب پہ حرام

وہ سادہ مردِ مجاہد وہ مومنِ آزاد | خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نمازِ غلام
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے | ورائے سجدہ غریبوں کو اور کیا ہے کام

ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش | وہ بندۂ افلاک ہے وہ خواجۂ افلاک

ما غلاماں از جلالش بے خبر | از جمال لازوالش بے خبر
از غلامِ لذتِ ایماں مجو | گرچہ باشد حافظِ قرآں مجو
عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں | عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

ز محکومی مسلماں خود فروش است | گرفتارِ طلسمِ چشم و گوش است
ز محکومی رگاں در تن چناں است | کہ ما را شرحِ و آئیں بار دوش است

غرضیکہ غلاموں کا ضمیر بدل جاتا ہے۔ ان کی نگاہ حقیقت آشنا نہیں رہتی۔ اور وہ بدی کو نیکی کا درجہ دیتے ہیں۔

جو تھا ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اگر غلامی سے نجات حاصل کرنی ہے تو ہمیں خودی کی پرورش کرنی چاہیئے۔ خودی کی روشنی ہی غلامی کی تاریکی کو دور کر سکتی ہے۔

سُنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات | خودی کی پرورش و لذتِ نمود سے ہے

مسلمانوں کی غلامی کے ذمہ دار انگریز ہیں اس لئے اقبال نے اپنے ترکش کے زہریلے تیر ان کی سیاست اور تہذیب پر چلائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب تک انگریز کے پنجوں سے نجات حاصل نہ کی جائے گی۔ اس وقت تک ترقی کی راہوں پر چلنا ممکن نہیں انگریز نے ہندوستانیوں کو غلام رکھنے کے لئے جن حربوں سے کام لیا۔ اقبال نے ان سے بھی خبردار کیا ہے۔ قوت اور سیاست سے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے اپنی حکومت کو استقلال بخشنے کے لئے نظام تعلیم اس طرح رائج کیا جو جوانوں کو انگریزی خوبیوں کا پرستار بنا دے۔ اس کو انگریزی حکومت کی برکات کا قائل بنا دے اور آزادی کی روح کو کچل دے۔ انگریز نے ہندوستان کی چیزوں سے نفرت کرنا سکھایا اور فرنگی اشیا کی برتری کو قائم کیا۔ اس نے دستور و آئین کا سہارا لے کر ہندوستانیوں کو لوٹا۔ اقبال کہتے ہیں اس کی پہچان یہ ہے کہ یہاں امیر اور امیر، غریب غریب تر ہو جاتا ہے۔ یہی کام دستور فرنگ نے کیا۔ اس نے مردہ ہندوستانیوں کو اور مردہ بنا دیا۔ اقبال نے اشعار کے آئینے میں ان حقائق کو یوں دکھایا ہے۔

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے ۔۔۔ مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

آہ مکتب کا جوان گرم خون! ۔۔۔ ساحر افرنگ کا صید زبوں

قاہر آمر کہ باشد پختہ کار ۔۔۔ از قوانیں گرد خود بندد حصار

حاملِ آئینِ دستورِ ملوک ۔۔۔ دہ خدایاں فربہ و دہقاں چوں دوک

وائے بر دستور جمہور فرنگ ۔۔۔ مردہ تر باشد مردہ از صورِ فرنگ

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں — سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی — مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیِ خارا

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج — من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

انگریزی تہذیب اور انگریز کی مخالفت کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ یہ عقل و خرد کے علمبردار ہیں۔ وہاں دل کی خرابی اور خرد کی معموری نظر آتی ہے مغرب کا مشینی نظام دل کی موت کا باعث ہے اور اقبال عقل و عشق کی لڑائی میں ہمیشہ عشق کے طرفدار رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے دانشِ فرنگ کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔

برا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے — فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن — پرکار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے

مغرب میں بلند و بالا عمارات ہیں مگر روح کی عفت باقی نہیں اور جب تک روح پاک نہ ہو اس وقت تک خیال بلند اور ذوق لطیف کا حصول ناممکن ہے مغرب نے مادیت کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔ وہاں بنکوں کی عمارات گرجوں سے بلند ہیں جو مذہب پر دولت کی فوقیت کو ظاہر کرتی ہیں۔

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیرِ پاک، خیالِ بلند ذوقِ لطیف

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

اقبال نے مشرق و مغرب دونوں کو دیکھا ہے اور ان کی ہر چیز کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ دونوں کی خوبیوں اور خامیوں پر ان کی نظر ہے۔ مشرق اس لئے پستی میں گرا ہوا ہے کہ اس کی عقل بے ربطی افکار کا شکار ہے اور مغرب کی تباہی اس لئے یقینی ہے کہ وہاں عشق لادینی افکار سے مردہ ہو چکا ہے۔ مغرب میں صہبائے ذوق ہے تو مشرق میں ساقی نہیں ہے۔

مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

اقبال مغربی تہذیب کے مخالف ہی نہیں بلکہ اس کی خوبیوں کے معترف بھی ہیں۔ وہ کسی چیز کی اندھا دھند مخالفت نہیں کرتے بلکہ اس کے ہر پہلو پر نظر رکھتے ہیں۔ مغرب نے علم و حکمت میں بہت ترقی کی ہے اور اب وہ آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا ہے آج امریکہ چاند پر پہونچ گیا ہے۔ اقبال کے زمانے میں انگریز نے بے شمار ایجادات اور انسانیت کی بھلائی کے لئے سائنس کو استعمال کیا۔ آج ہمارا جدید تمدن سارے کا سارا مغربی سائنس دانوں کی ایجادات کا مرہون منت ہے۔

اقبال نے ستاروں پر کمندیں ڈالنے کا خواب دیکھا اور مغرب کے سائنس دان اسے

خواب کی تعبیر پیش کر رہے ہیں۔ اقبال کو ان کی ان صلاحیتوں کا علم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ لذت ایجاد کا ثمر ہے اور کبھی لذت ایجاد مسلمانوں کو حاصل تھی۔ یہ پری کبھی ہمارے قاف میں تھی مگر آج مغرب کے تصرف میں ہے۔ درحقیقت جو کام مسلمانوں کے کرنے کا تھا۔ وہ آج اہل مغرب کر رہے ہیں۔

حکمت اشیا فرنگی زاد نیست — اصل او جز لذت ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلماں زادہ است — ایں گہر از دست ما افتادہ است
ایں پری از شیشہ اسلاف ماست — باز صیدش کن کہ او از قاف ماست

انھوں نے اپنے خطبات میں مغربی تہذیب کے اس پہلو کو اسلامی تہذیب کی مزید نشوونما قرار دیا ہے۔

"اس تحریک میں کوئی خرابی نہیں اس واسطے کہ یورپین تہذیب ذہنی اعتبار سے اسلامی تہذیب کے بعض اہم پہلوؤں کی مزید نشوونما سے عبارت ہے ہمیں خوف ہے تو یہ کہ کہیں یورپین تہذیب کی ظاہری چمک دمک ہماری اس تحریک کو روک نہ دے اور ہم اس کی (یورپین تہذیب کی) حقیقی اندرونی رُوح تک نہ پہونچ پائیں۔"

اقبال کا یہ اندیشہ کہ ہم کہیں اس تہذیب کی ظاہری چمک دمک سے متاثر نہ ہو جائیں درست ثابت ہوا۔ ہم نے مغربی لباس اور گفتار میں ترقی کا راز ڈھونڈا جس کا نتیجہ تنزل کی گہرائیوں میں ڈوب گئے۔ مغرب کی ترقی لباس اور زبان سے نہیں ہے۔ یہ جو کہا جا رہا ہے کہ انگریزی زبان کے بغیر ہم ترقی نہیں کر سکتے۔ مغرب کی قوت کا باعث چنگ و رباب اور رقص بے حجاب نہیں ہے۔ اور یہ خیال بھی غلط ہے کہ علم و فن کے حصول کے

سوٹ بوٹ کی ضرورت ہے اور عمامہ اس کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے۔ ڈارھی منڈانے اور جسم کو عریاں کرنے سے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ مغرب کی ترقی کا راز فکر چالاک اور طبع دراک میں پوشیدہ ہے کیونکہ ان سے علم و فن کا چراغ روشن ہوتا ہے۔

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب ۔ نے ز رقص دختران بے حجاب
نے ز سحر ساحران لالہ روست ۔ نے ز عریاں ساق و نے از قطع موست
محکمی اورا نہ از لادینی است ۔ نے فروغش از خط لاطینی است
قوت افرنگ از علم و فن است ۔ از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و برید جامہ نیست ۔ مانع علم و ہنر عمامہ نیست
علم و فن را اے جوان شوخ و شنگ ۔ مغز می باید نہ ملبوس فرنگ
اندریں رہ جز نگاہ مطلوب نیست ۔ ایں کلہ و آں کلہ مطلوب نیست
فکر چالاکے اگر داری بس است ۔ طبع دراکے اگر داری بس است

علم و فن کا جو چراغ مغرب نے فکر چالاک سے روشن کیا ہے وہ ہمیشہ نہیں جلے گا۔ کیونکہ جب تک عشق کا دامن تھاما جائے ہمیشگی نصیب نہیں ہو سکتی۔ مغرب کی لادینی تہذیب زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لیے اقبال نے اس کے سست بنیاد ہونے کی طرف جا بجا اشارے کئے ہیں۔ فرنگ عیش جہاں کا دوام ڈھونڈ رہا ہے۔ مگر اس کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام ۔ وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام!

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوان فرنگ ۔ سست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے | لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح | دیکھئے گرتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

تمہاری تہذیب آپ اپنے خنجر سے خودکشی کریگی | شاخ نازک پہ جو آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

چونکہ اقبال مغربی تہذیب کی کم عیاری سے واقف ہیں اس لئے وہ اس کے مٹنے اور ختم ہونے پر خوش ہوتے ہیں۔ اور ہر وہ شخص جو فرنگی تہذیب کے درخت کو کاٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے داد دیئے بغیر نہیں رہتے۔ کارل مارکس اور نٹشے کی تعریف کا پہلو یہ بھی ہے کہ وہ تہذیب مغرب کے مخالف ہیں۔ نٹشے کے متعلق تو وہ صاف کہتے ہیں کہ اس نے مغربی تہذیب کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں اس لئے تعریف کا مستحق ہے۔

نیشتر اندر دل مغرب فشرد | دستش از خون چلیپا احمر است

آنکہ بر طرح حرم بتخانہ ساخت | قلب او مومن دماغش کافر است

ایسی تہذیب جس کی بنیادیں کمزور ہیں اور اس کا شیش محل کسی وقت بھی زمیں بوس ہو سکتا ہے کس طرح نمونہ بن سکتی ہے۔ چنانچہ اقبال مسلمانوں کو کہتے ہیں کہ مغرب کی تقلید سے باز رہیں۔ تقلید کو تو وہ کسی طرح پسند نہیں کرتے کیونکہ اگر تقلید قابل عمل اور اچھی چیز ہوتی تو پیغمبر اپنے لئے الگ راہ نکالنے کی بجائے جادۂ اجداد پر ہی چلتے رہتے۔

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب | پیغمبر ہم رہ اجداد رفتے

اور

طرح نو فگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم | ایں چہ بوالعجبی است کہ در رزو فرد ساختی

اگر کچھ حاصل کرنا ہے تو تقلید سے نہیں بلکہ اپنی کوشش سے حاصل کرنا چاہیئے۔ دوسروں کے مارے ہوئے شکار سے پیٹ بھرنا مومن کی شان کے خلاف ہے۔ چنانچہ دوسروں کے علوم پر جان دینا اور اپنی کوشش سے علوم وفنون کی تخلیق نہ کرنا۔ دوسروں کی تہذیب کو اختیار کرنا اور اپنے تمدن سے مونہہ موڑ لینا، موت کو دعوت دینا ہے۔

وہ قوم جو اپنی تخریب اور دوسروں کی تعمیر کرے، کس طرح زندہ رہ سکتی ہے۔ آپ دوسروں کے دیئے ہوئے علوم تو حاصل کر سکتے ہیں مگر ان سے اپنی خودی کی تعمیر نہیں کر سکتے لہذا یہ علوم بے کار ہیں۔ کوئی قوم اپنی صلاحیتوں سے باخبر ہوئے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔

وائے قومے کشتہ تدبیر غیر　　کار او تخریب خود تعمیر غیر

می شود در علم وفن صاحب نظر　　از وجود خود نگردد باخبر

آج پاکستان میں بھی دوسروں کی نقالی کی جا رہی ہے۔ اور اپنی صلاحیتوں سے باخبر ہو کر ان کو بروئے کار لانے سے گریز کیا جا رہا ہے۔ آج پھر قوم کو حکیم الامت کے درس کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی تعمیر خود کرنے پر متوجہ ہو سکے، اور دوسروں کی دریوزہ گری سے اجتناب کرے۔ دوسرے ممالک میں جا کر پی۔ایچ۔ڈی کرنا، ان کی تعمیر کرنا ہے۔ اور اپنی تخریب۔ کیونکہ وہ لوگ اس لئے جو موضوع تجویز کرتے ہیں۔ وہ ان کے ملک کے لئے مفید تو ہو سکتا ہے مگر پاکستان کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ وہ خود تو اپنا ایک مسئلہ حل کر لیتے ہیں مگر ہمارے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا پکڑا دیتے ہیں۔ جس کی مدد سے ہم قوم کی گردن پر سوار ہو کر اسے نقالی کی راہ پر لگائے رہتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم خود اپنے مسائل پر نظر رکھیں، اور انھیں پر اپنی تحقیق

قوتوں کو صرف کریں اور صاحب نظر بن کر قوم کے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کریں۔ نقل کرنا کبھی بھی قابل ستائش نہیں سمجھا گیا اس لئے قوم کو راہ مغرب پر چلانے کی کوشش کبھی سود مند ثابت نہیں ہو سکتی لہ۔

غیروں کی چیزوں کو استعمال کرنا اور خود ان چیزوں کو بنا نہ سکنا اقبال کے نزدیک قابل نفرت ہے۔ کیونکہ دوسروں کی دی ہوئی چیزوں پر انحصار کرنا تن آسانی ہے جو قوم کے حق میں زہر قاتل کا درجہ رکھتی ہے۔

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

ہندوستانیوں کی تن آسانی اقبال کے لئے روح فرسا تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان محنت کوش اور تندرو ہوں۔ وہ قصر سلطانی میں قیام کرنے کی بجائے پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کرنا سیکھیں۔ آرام کو ترک کر کے بے آرامی اور مشقت کو اپنائیں مگر ہمارے نوجوانوں کی حالت اس کے برعکس تھی اور آج بھی ہم تن آسانی کا شکار ہیں۔ دفتروں میں ہمیں ایئر کنڈیشنر چاہیئیں اور گھروں میں افرنگی صوفے اور ایرانی قالین پر ہم جان دیتے ہیں۔ نوجوان عورتوں کی طرح نرم و نازک بنے رہتے ہیں جب قوم کو سخت جان مردوں کی ضرورت ہے بوڑھے حیا سے بیگانہ ہو رہے ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ ان کا فرض سنجیدگی اور حیا کا متقضی ہے۔

لہ اکبر الہ آبادی نے خوب کہا تھا۔

راہ مغرب میں یہ لڑکے لٹ گئے
واں نہ پہنچے اور ہم سے چھوٹ گئے

از حیا بیگانہ پیران کہن
نوجواناں چوں زناں مشغول تن

اب عورتوں کی طرف آئیے تو وہ حکمت فرعونی کے شکار ہیں ان کی دنیا ان کی زلفیں ہی ہیں۔ وہ ہر وقت بنی ٹھنی اور شوخ چشم نظر آتی ہیں انھوں نے زخمیوں کی تیمارداری اور تلوار اٹھانے کے بجائے اپنے ابروں کے خنجر سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔

دختران او بہ زلف خود اسیر ساختہ پرداختہ دل باختہ
شوخ چشم و خود نما و خوردہ گیر ابرواں مثل دو تیغ آختہ

چنانچہ قوم اپنے سرمائے سے محروم ہو گئی ہے اس کا سرمایہ تو صحت مندانہ اور محنت کوش بچے ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کے خارزار کو اپنے طاقت ور جوانوں کی مدد سے گلزار بناتی ہے اقبال اس حالت پر افسوس ظاہر کرتے ہیں۔ کیونکہ بعض قومیں ایسی ہوتی ہیں جو مر رہی ہوتی ہیں مگر انھیں موت کے آنے کا پتہ نہیں چلتا۔ جو بھی فطرت کے اصولوں کی خلاف ورزی کرے گا اس کے ساتھ یہی ہوگا ایک وقت تھا کہ مسلمان عظیم ترین قوم تھے اور بے شمار اسلامی ممالک کبھی اپنا تحفظ نہیں کر سکتے اور امریکہ و روس کے دست نگر ہیں۔

ایک اور گروہ جس نے اسلام اور مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے وہ فقیہوں اور ملاؤں کا ہے ان لوگوں نے قرآن کی تعلیمات کو غلط رنگ میں پیش کیا اور مسلمانوں کو گوسفندی کا سبق پڑھایا۔ انہوں نے اپنے آپ کو قرآن کے سانچے میں ڈھالنے کے بجائے قرآن کو تاویلات کی مدد سے اپنے مطابق بنا لیا۔ ان لوگوں نے کبھی اپنے نفس کا غلام بن کر اور کبھی غیروں کا آلہ کار بن کر قرآن کے احکام کو مسخ کر دیا۔ قوم کے ہاتھ سے تلوار چھین کر اسے خانقاہ میں بٹھا دیا۔ اور پھر ایسے روایات میں ایسا الجھایا کہ وہ کبھی حقیقت کی روشنی نہ پا سکی۔

انھوں نے مسلمانوں کو اتحاد کی بجائے نفاق کے راستے پر چلایا اور ایک ملت کو کئی فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ لڑنا بھڑنا ان اللہ کے بندوں کا شعار بن گیا۔ چنانچہ اقبال نے ملا کے کردار پر زبردست تنقید کی اور اسے ملت کے لئے خطرناک قرار دیا۔ مگر یاد رہے کہ اقبال ایسے مولویوں کے خلاف نہ تھے جو عالم فاضل تھے اور قوم کی رہنمائی صحیح طور پر کر رہے تھے انھوں نے اپنے خطوط میں مولانا سید سلیمان ندوی کی بے حد تعریف کی ان سے مسائل پوچھے ہیں اور الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اقبال نے سید سلیمان ندوی کو اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ جب اقبال ملا، فقیہ یا واعظ کے خلاف لکھتے ہیں تو ان کی مراد ایسے لوگوں سے ہوتی ہے جو قوم کو بے عملی کا سبق سکھاتے ہیں۔ اور جن کا کام بدآموزی اقوام ہے۔ جن کی ناعاقبت اندیشی نہ جانے کتنے سفینے ڈبو چکی ہے اور جو اندیشہ و نظر کا فساد پیدا کرتے ہیں۔ جو عمل کی دولت سے محروم ہیں اور جن کے پاس صرف فسانہ ہائے کرامات کے سوا کچھ نہیں رہا۔ میں چند شعر درج کرتا ہوں جن میں ملا کے ان کے کردار کا پول کھولا گیا ہے۔

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکے کے ملا ہوں غازی

ہے بدآموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی

اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ ملا سے نہ پوچھ ہوگیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے کردار بے سوز گفتار واہی

دینِ حق از کافری رسواتر است زانکہ ملا مومنِ کافر گر است
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبی آسمانش تیرہ از بے کوکبی
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد ملت از قال و اقولش فرد فرد
دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد دینِ ملا فی سبیل اللہ فساد

زمن صوفی و ملا را سلامے کہ پیغامِ خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

جنتِ ملا مے و حور و غلام جنتِ آزادگاں سیر دوام

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ حکیم وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام
قوم کیا ہے قوموں کی امامت کیا ہے اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

اقبال کہتے ہیں کہ مُلا عشق کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کی حقیقت اور اس کے تقاضوں سے بیخبر ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ عشق منبر پر کھڑے ہو کر کافر گری کرنے میں نہیں ہے بلکہ حق کی خاطر تختہ دار پر چڑھ جانے کا نام ہے۔ ابراہیمی شان جس شخص میں بھی ہو وہ نمرودی طاقتوں سے نہیں ڈرتا اور بے دھڑک آگ میں چھلانگ لگا دیتا ہے عشق ہمیشہ قربانی کا طلب گار ہوتا ہے۔

میاں اندر دو حرفے سر کار است — مقام عشق منبر نیست دار است

براہیماں ز نمرودان نترسند — کہ عود خام را آتش عیار است

مُلاّ ہی کا ایک ساتھی صوفی بھی ہے جس نے قوم کو بے عملی کا سبق پڑھایا اور ترک دنیا کی تعلیم دے کر رہبانیت کا قائل کر دیا۔ اس نے دنیا کو سراب قرار دیا۔ اور ہندوؤں کی طرح اسے مایا سمجھ کر اس سے بھاگنے لگا۔ اس نے ایک ایسا فلسفہ ایجاد کیا جس کا ذرہ بھر تعلق بھی قرآنی تعلیمات سے نہ تھا اپنے اس غیر اسلامی فلسفہ حیات کے ذریعہ اس نے اس کائنات کو موہوم قرار دیا اور یہاں کی زندگی کو خواب سمجھ کر عمل سے کنارہ کش ہو گیا۔ اور ایک حجرے میں یا پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھ کر نفس کشی کرنے لگا۔ اقبال ایسے صوفی کے سخت مخالف تھے۔ وہ اپنے ایک خط میں رقمطراز ہیں۔

"لیکن ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی ایک معنی میں میری تمام تحریریں اس تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں"[1]

[1] اقبال نامہ صـ ۲۰۳

وہ تصوف کے وجود کو عجمیوں کے دماغ کی اختراع سمجھتے ہیں ۔اس کا تعلق اسلام سے کسی زمانے میں بھی نہیں رہا ۔ اس کے غیر اسلامی ہونے سے ہی اقبال کو اس کا مخالف بنایا ہے ۔ وہ کہتے ہیں ۔

"اس میں ذرا شک نہیں کہ تصوف کا وجود سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے ؎"

اقبال نے اپنی اس شاعری میں صوفی کی اس بے عملی اور ناخوش اندیشی گلہ بارہا کیا ہے ۔ اکثر اشعار میں انھوں نے صوفی اور ملا کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے کیونکہ درحقیقت دونوں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ دونوں مسکینی محکومی اور نومیدی کے خوگر ہیں اور اس بات ہی پہ قانع ہیں کہ مسلمانوں کو سجدے کی اجازت ہے ۔ ایک کا اسلام صرف مسجد کی چار دیواری میں مقید ہے اور دوسرے نے اسے ترک دنیا میں پانے کی کوشش کی ہے دونوں ابلیسی کرامت کا شکار ہو کر ملوکیت کے غلام بن گئے ہیں ۔

مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید ۔۔۔ جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ۔۔۔ ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی ۔۔۔ رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی

مرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانے میں ۔۔۔ کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

؎ اقبال نامہ صفحہ ۲۹-۲۸

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی　　　فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

حلقۂ صوفی میں ذکر بے نم و بے سوز و ساز　　　میں بھی رہا تشنہ کام تو بھی رہا تشنہ کام

ہماری سعیِ پیہم کی کوشش ہے کہ آج　　　صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام[1]

اقبال چاہتے ہیں کہ مسلمان صوفی اور ملا کے دام میں گرفتار ہونے کی بجائے قرآن کا دامن پکڑیں اور اسے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنا لیں۔ قرآن اس لئے نازل نہیں ہوا کہ مرتے ہوئے اس کی آیات کی تلاوت کر لی جائے تاکہ موت آسان ہو جائے بلکہ وہ ایک نظامِ زندگی پیش کرتا ہے جس سے زندگی کی مشکلات آسان ہو جاتی ہے۔

بہ بندِ صوفی و ملا اسیری !　　　حیات از حکمتِ قرآں نہ گیری

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست　　　کہ از لیسین او آساں بمیری

مگر یاد رہے کہ اقبال تمام صوفیوں کے مخالف نہیں ہیں۔ وہ صرف ان صوفیا کو مردود قرار دیتے ہیں جو بے عملی کا درس دے کر قوم کو مفلوج کر رہے ہیں۔ وہ صوفی جو اپنی قوت قرآن سے حاصل کرتے ہیں اور اسی کی تعلیمات کو مشعلِ راہ بناتے ہیں ان کے معترف ہیں۔ حضرت داتا گنج بخش جس تصوف کا ذکر اپنی کتاب کشف المحجوب میں کرتے ہیں وہ اقبال کو بھی پسند ہے۔ حضرت علی بن عثمان ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش نے حضرت ابوبکر، حضرت علی، حضرت عمر اور حضرت عثمان کو صوفیہ کا امام قرار دیا ہے اور ان حضرات کی بے پناہ تعریف اقبال کی شاعری میں موجود ہے۔ اسی طرح انھوں نے اہل بیت میں سے

---

[1] ابلیس کی مجلس شوریٰ

امام حسین کو صوفیہ کا امام کہا ہے۔ اور علامہ اقبال نے امام حسین کو بنائے لا الہٰ کہہ کر خراج تحسین ادا کیا ہے لہ اور خود داتا صاحب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

سید ہجویر مخدوم امم — مرقد او پیر سنجر را حرم
بند ہائے کوہسار آساں گسیخت — در زمین ہند تخم سجدہ ریخت
عہد فاروق از جمالش تازہ شد — حق ز حرف او بلند آوازہ شد
پاسبان عزت ام الکتاب — از نگاہش خانہ باطل خراب
خاک پنجاب از دم او زندہ گشت — صبح ما از مہر او تابندہ گشت
عاشق و ہم قاصد طیار عشق — از جبینش آشکار اسرار عشق

اقبال ان صوفیا کے مخالف ہیں جو اس دنیا کو مردود قرار دیتے ہیں ان کا فقر مسکینی و نا امیدی سکھاتا ہے۔ اقبال بھی دنیا کی آلائشوں سے بے نیاز ہونے کو پسند کرتے ہیں مگر ان کا فقر دنیا سے تعلق رکھتے ہوتے بے تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ اقبال نے جابجا صوفیا کے دونوں گروہوں کا مقابلہ کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ایک کا فقر ملوکیت کا غلام بناتا ہے تو دوسرے کا فقر شیر کا دل عطا کرتا ہے۔ ایک کا فقر مسکینی و نا امیدی سکھاتا ہے تو دوسرے کا فقر قیصر و کسری کی ہلاکت کا باعث ہے۔ اس دوسری قسم کے فقر کی تعریف اقبال نے ہر جگہ کی ہے۔

لہ بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است — پس بنائے لا الہ گردیدہ است

اور دوسری جگہ کہا:

رمز قرآں از حسین آموختیم! — ز آتش او شعلہ ہا افروختیم

نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ!

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی — خونِ دلِ شیراں ہو جس فقر کی دستاویز
کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے — وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
کیا گیا غلامی میں مبتلا تجھ کو! — کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

وہ "ضربِ کلیم" میں "صوفی سے" خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تری نگاہ میں ہے معجزات کی دنیا — مری نگاہ میں ہے حادثات کی دنیا
تخیلات کی دنیا غریب ہے لیکن — غریب تر ہے حیات و ممات کی دنیا
عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تری — بلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا

اور "فقر و راہبی" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

یہ کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی — تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی
سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار — فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
پسند روح و بدن کی ہے وانمود اسکو — کہ ہے نہایت مومن خودی کی عریانی
وجود صیرفی کائنات ہے اس کا — اسے خبر ہے یہ باقی ہے اور وہ فانی
اسی سے پوچھ کہ پیشِ نگاہ ہے جو کچھ — جہاں ہے یا کہ فقط رنگ و بو کی طغیانی
یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے — رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی

اور صوفیا کا یہی بے عملی اور راہبی کا تصور شاعروں نے بھی اپنایا اور اسے اپنی شاعری کے ذریعے عوام میں پھیلا دیا۔ بعض اوقات خود صوفیا شاعر بھی ہوتے تھے اور وہ ان نظریات کو شعر کا حسین لباس پہنا دیتے تھے دنیا کے موہوم اور خواب ہونے کا

تصور اس قدر عام ہوا کہ اسے غیر صوفی شاعروں نے بھی اپنے شعروں میں کثرت سے بیان کیا ہے۔ اسی طرح وحدت الوجود کا نظریہ بھی عام طور پر اپنا لیا گیا اقبال کے نزدیک یہ نظریات غیر اسلامی ہیں اس لئے اس نے ایسے تمام شاعروں کو (خواہ وہ صوفی یا غیر صوفی ہوں) ہدف ملامت بنایا ہے۔ اس رجحان کا سب سے بڑا نمائندہ انہوں نے حافظ قرار دیا اور اسرار خودی میں اس پر سخت نکتہ چینی کی۔

ہوشیار از حافظ صہبا گسار ۔۔۔ جامش از زہر اجل سرمایہ دار
نیست غیر از بادہ در بازار او ۔۔۔ از دو جام آشفتہ شد دستار او
مفتیِ اقلیم و مینا بدوش ۔۔۔ محتسب ممنونِ پیرِ مے فروش
آں فقیہ امتِ مے خوارگاں ۔۔۔ آں امام امتِ بیچارگاں
دلربائی او زہر است و بس ۔۔۔ چشم او غارت گر ہیر است و بس

اقبال کے حافظ کے متعلق ان خیالات پر بڑی لے دے ہوئی۔ حافظ کا دفاع کرنے والوں نے کہا کہ حافظ کی شاعری کے باطن معنی کچھ اور ہیں۔ اقبال نے اگرچہ اسرار خودی کے دوسرے ایڈیشن میں حافظ کے متعلق اشعار حذف کر دیئے مگر ان کا نقطہ نظر نہیں بدلا حافظ کو تو انھوں نے صرف علامت کے طور پر استعمال کیا تھا ورنہ وہ ایسی تمام شاعری کو مردہ قرار دے رہے تھے چنانچہ انھوں نے اپنے خطوط میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ وہ اس دلیل کو کہ حافظ کے کلام کے باطنی معنی کچھ اور ہیں نہیں مانتے وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ حافظ جیسی شاعری کا اثر لوگوں پر کیا ہوتا ہے

" حقیقت یہ ہے کہ مذہب یا قوم کے دستور العمل میں باطنی معنی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا، اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے یہ نہایت (SUBTLE) طریق تنسیخ

کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کرسکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعرا ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اسمیں نشوونما نہ ہونے دیا تاہم وقت پاکر ایران کا آبائی طبیعی مذاق اچھی طرح ظاہر ہوا بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنا پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی ان شعرا نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی ہر محمود شے کو مذموم بیان کیا ہے۔ اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجہ کی سعادت قرار دیتا ہے، جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لئے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم اس کے شعائر اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں۔

غازی پئے شہادت اندر تگ و پوست　　غافل کہ شہید عشق فاضل تر از دست

در روز قیامت ایں بآں کے ماند　　ایں کشتہ دشمن و آں کشتہ دوست

یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے بہت عمدہ ہے اور قابل تعریف ہے مگر انصاف سے دیکھئے تو جہاد اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دلفریب اور خوبصورت طریقہ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس کو زہر دیا ہے اس کو احساس کبھی اس امر کا نہیں ہوسکتا کہ مجھے آب حیات پلایا گیا ہے۔ آہ! مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں اس نکتہ خیال سے نہ صرف حافظ بلکہ تمام شعرائے ایران پر نظر ڈالنی چاہئے۔

اسی زاویہ نگاہ سے انھوں نے ہندوستان کے شاعروں کو بھی دیکھا ہے اور اپنی شاعری میں انکی بے عملی کی تعلیم کے خلاف احتجاج کیا ہے۔

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے　　فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

ہنرورانِ ہند" کے عنوان سے وہ ضربِ کلیم میں لکھتے ہیں

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا — ان کے اندیشہ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری انکے صنم خانوں میں — زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند — کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس — آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ہندوستانیوں کے پستی کے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تقدیر کا غلط مفہوم سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ روز ازل سے متعین ہے اور انسان اس کو بدل نہیں سکتا۔ اس لئے کوشش اور عمل کا کیا فائدہ ہے جو خدا چاہے گا وہی ہوگا انسان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمارے شعرا نے بھی ان خیالات کا اظہار کیا ہے چنانچہ میر تقی میرؔ کہتے ہیں۔

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہمکو عبث بدنام کیا

اقبال اس اعتقاد کے خلاف بھی جہاد کرتے ہیں اور بتاتے ہیں انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے مردِ مومن کی ایک نگاہ تقدیر بدل دینے کے لئے کافی ہے[1] اگر ہمارے لئے[2] ایک تقدیر ناساز گار تو ہمیں چاہئے کہ خدا سے دوسری تقدیر مانگ لیں۔ خدا کے پاس لا انتہا تقدیریں ہیں اور ہماری کوشش اور خواہش ان میں سے نئی تقدیر حاصل کر سکتی ہے اگر انسان خود بدل جائے تو اس کی تقدیر بھی بدل جاتی ہے خدا جیسا انسان ہو اسکی ویسی تقدیر بنا دیتا ہے اگر مٹی ہو تو اسے اڑا دیتا ہے اور اگر پتھر ہو تو اسے شیشے کو توڑنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔

گر زیک تقدیر خوں گردد جگر — خواہ از حق حکم تقدیرِ دگر

---

[1] نہ کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا — نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست — زانکہ تقدیرِ حق لاانتہاست

ارضیاں نقدِ خودی در باختند — نکتۂ تقدیر را نہ شناختند

رمز باریکش بحرفے مضمر است — تو اگر دیگر شوی او دیگر است

خاک شو نذرِ ہوا سازد ترا — سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا

اسی مضمون کو بالِ جبریل میں چیونٹی اور عقاب کے ذریعے ادا کیا گیا ہے۔ چیونٹی عقاب سے کہتی ہے کہ وہ تو خوار و زبوں ہے اور خاک پہ چلتی ہے مگر عقاب آسمانوں کو بھی نگاہ میں نہیں لاتا اس کی کیا وجہ ہے ؎ میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند

تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

اور عقاب جواب دیتا ہے کہ چونکہ تو خاکِ راہ میں رزق ڈھونڈتی ہے اس لئے پائمال ہوتی ہے اور میں ہمیشہ بلندیوں پہ نگاہ رکھتا ہوں اس لئے بلند مقام پر فائز ہوں

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں — میں نُہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

مسلمانوں کو غلامی نے تن بہ تقدیر رہنا سکھایا ہے اور ترکِ جہاں کی تعلیم دی ہے ورنہ اسی قرآن نے ان کو فاتح اور سربلند بنایا تھا۔ جس سے اب وہ دنیا سے کنارہ کشی کا سبق پڑھتے ہیں

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز — تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا — کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اقبال کہتے ہیں کہ انسان اپنے عمل کا خود مختار ہے اور اسی لئے اس کو "اچھائی" اور "برائی" کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ زندگی میں انسان کے سامنے بہت سے امکانات ہوتے ہیں اور وہ اپنی مرضی سے ایک خاص راہ کو اختیار کرتا ہے خود خدا بھی اس کے اس چناؤ میں دخل انداز نہیں ہوتا۔

جب عمل کی ایک سے زیادہ راہیں میرے سامنے ہوں تو خود خدا بھی میرے لئے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب نہیں کر سکتا نہ وہ میرے لئے محسوس کر سکتا ہے یا فیصلہ کر سکتا ہے چنانچہ انسان جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ اگر وہ نیک اعمال کرے گا تو اس کی جزا پائے گا اور اگر برے عمل کرے گا ان کی سزا اس کو ملے گی اگر قومیں بے عملی اختیار کریں گی تو تباہ ہو جائیں گی اور اس تباہی کی تمام تر ذمہ داری ان پر ہو گی۔ یہ کہنا کہ خدا کو یہی منظور تھا محض ایسا ہوا غلط ہے جو قوم اپنے عمل کا حساب کرتی رہتی ہے۔ وہ دست قضا میں تلوار کی مانند ہوتی ہے اور اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

گزشتہ صفحات میں ان امراض کا ذکر کیا گیا ہے جو اقبال کی نظر میں ملت اسلامیہ کو مفلوج کیے ہوئے ہیں۔ اقبال نے ان امراض کا علاج بھی ساتھ ہی بتا دیا مگر اب یہ قوم بے عملی کی وجہ سے دنیا کے لئے بار دوش بن چکی ہے۔ اس لئے اقبال نوجوانوں سے کہتے ہیں کہ وہ اس امت کو بدل دیں اور اس کی جگہ نئی امت کا نقش تیار کریں۔ ہ

بیا نقش دگر ملت بہ ریزیم   کہ ایں ملت جہاں را بار دوش است

ایک ایسی ملت جو ہر وقت عمل کے راستے پر چلتی رہے اور ایک عالم پر رضامند نہ ہو بلکہ دونوں جہانوں کو اپنے کندھوں پر اٹھا لے۔

دگر ملت کہ کارِ پیش گیرد   دگر ملت کہ نوش از نیش گیرد

ہ

لہ خرد کو غلامی سے آزاد کر   جوانوں کو پیروں کا استاذ کر

نہ گرہ دہا یکے عالم رضا مند دو عالم را بہ دوش خویش گیرد

مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنی زندگی کو قرآن کی تعلیمات کے مطابق ڈھال لیں اور قرآن کی تعلیمات کو ایک نئے انداز سے دیکھیں اور اس کی حرکی قوتوں سے آگاہ ہوں۔ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو ہر زمانے کے حالات سے نپٹنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے اندر وہ فلسفہ پوشیدہ ہے جو قوموں کو سر بلندی اور عروج سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ اقبال نے قرآن کی روشنی میں قوم کے سامنے ایک ایسا فلسفہ حیات پیش کیا جو ان کے نزدیک قوم کے تمام امراض کا علاج ہے انھوں نے اس کو فلسفہ خودی کا نام دیا ہے اور اس کا تفصیلی ذکر ہم آئندہ باب میں کر رہے ہیں۔

فلسفۂ خودی اور بیخودی

خودی شیر مولا جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید

خودی فارسی زبان کا لفظ ہے اور یہ "خود" سے بنا ہے "خود" کا مطلب اپنا آپ یا میں ہے۔ اس "خود یا میں" کو مختلف لوگوں نے مختلف زاویوں سے دیکھا ہے جو شخص اپنی "ذات یا میں" کو زیادہ اہمیت دے وہ عام لوگوں کی نظر میں مغرور یا متکبر لیا جاتا ہے اور اس لئے "خودی سے بھی غرور تکبر یا انانیت کے معنی مراد لئے جاتے ہیں اور لئے جاتے تھے[1] غالب کی شاعری میں اپنی ذات کا شدید احساس پایا جاتا ہے اور وہ اپنے مقابلے میں دوسروں کو کچھ نہیں سمجھتے[2] اسلئے ہم کہتے ہیں کہ انکے ہاں انانیت پائی جاتی ہے اور اسی لئے اسطرح کے فقرے وجود میں آئے کہ[3]

لہ ملاحظہ ہو نسیم اللغات   ۲ے اس سلسلے میں غالب کی ایک غزل کے شعر ملاحظہ ہوں

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے   ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
ایک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے آگے   اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے   گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

۳ے غالب نے اس عقیدے کو یوں بیان کیا ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔   ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

خودی اور خدائی میں بیر ہے یعنی غرور خدا کو پسند نہیں۔

مگر ہمارے حکماء نے "میں" "خود" یا خودی کو زیادہ گہری نظروں سے دیکھا ہے اور اس کی پوشیدہ وسعتوں میں جھانکنے کی کوشش کی ہے بعض صوفیا نے خود سے مراد انسانی جسم لیا ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ وجود انسان کو خدا سے جدا کرنے کا باعث ہے روح خدا کا جزو تھی جب اسے وجود ملا تو وہ خدا سے جدا ہو گئی اور جسم میں مقید ہو گئی۔ جسم روح کو دنیا کی آلائشوں سے ملوث کرتا ہے اس لئے اس سے جس قدر جلد ممکن ہو نجات حاصل کر لینی چاہیئے چنانچہ وجود یا خود کو خطرناک سمجھا گیا اور اس سے گریز کی تعلیم دی گئی۔ چنانچہ ابو سعید ابوالخیر کہتے ہیں۔

با مار سیاہ نشیں و با خود منشیں!

یعنی "خود" سانپ سے بھی زیادہ خطرناک ہے اس لیے اس کی صحبت سے بچنا چاہیئے۔ عرب کا ایک شاعر انسانی وجود کو سب سے بڑا گناہ سمجھتا ہے کیونکہ اس نے اسے خدا سے الگ کر رکھا ہے:

"تیرا وجود وہ گناہ ہے جو تصور میں بھی نہیں لایا جا سکتا۔

چنانچہ اس وجود کو ختم کر دینا ہی بہتر ہے اسے جتنی زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچائی جائے اچھا ہے۔ چونکہ وجود یا جسم کا تعلق دنیا سے ہے اس لئے دنیا کو ترک کر دینا چاہئے۔ بدھ مت اور ہندو مت میں بھی ایسے ہی خیالات پائے جاتے ہیں۔ صوفیا کے اس گروہ نے اپنی بات کی وضاحت کے لئے تشبیہات کا سہارا لیا اور خدا کو سمندر اور انسان کو قطرہ قرار دیا قطرے کا انجام اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ وہ سمندر میں مل اپنی ہستی ختم کر دے اور خود سمندر بن جائے

درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا　　عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

قطرے کی طرح انسان کے لئے بھی اعلیٰ ترین مقام یہ ہے کہ وہ اپنے وجود کو ختم کر کے

خدا سے جا ملے چنانچہ موت کے لئے جو الفاظ وضع کئے گئے ہیں وہ بھی اس طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مرنے کو وصال کہا جاتا ہے۔ کیونکہ مر کر انسان خدا سے وصل حاصل کرتا ہے اسی طرح واصل بحق ہونا بھی مرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے یا مرنے والے کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملا مگر اقبال کے نزدیک یہ نظریہ قرآنی تعلیمات سے متصادم ہے۔ اس لئے وہ اسے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں کیونکہ اس سے موت کے بعد زندگی کا تصوّر باطل ہو جاتا ہے۔ اگر انسان مر کر خدا سے جا ملتا ہے تو پھر اس سے حساب لینے اسے جزا یا سزا دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن تو ہر انسان کو خود اس کے اعمال کو ذمہ دار قرار دیتا ہے اور اس کے ضروری ہے کہ انسان کی انفرادیت برقرار رہے اور وہ اپنی یکتا ذات کے ساتھ خدا کے سامنے جواب دہ ہو۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں وحدت الوجود کا یہ تصور غیر اسلامی ہے اور عجمی اثرات کا نتیجہ ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کے نزدیک وحدت الوجود کا تصور فلسفۂ اشراق کے زیر اثر وجود میں آیا۔

عشق اتحاد چاہتا ہے۔ عاشق جب تک معشوق سے متحد نہ ہو جائے اس کو کسی اور چیز سے تسکین نہیں ہوتی۔ عشق کے اس نظریہ نے وحدت الوجود کا نظریہ پیدا کیا اور صوفیوں نے خدا کی ذات کے ساتھ اتحاد کرنا چاہا لیکن جسم کا اتحاد جسم سے نہیں ہوتا بلکہ روح کا اتحاد روح سے ہوتا ہے اور خدا چونکہ ہمہ تن روح ہے اس لئے اس سے اتحاد پیدا کرنے کے لئے جسم کو فنا کرنا چاہیئے۔ صوفیوں کے ریاضت اور مجاہدہ کی بنیاد اسی نظریہ پر ہے [1]

وحدت الوجود کے نظریہ کا ایک اور پہلو بھی ہے اس کے مطابق کائنات اور انسان خدا کا جز نہیں بلکہ عکس ہے اور موہوم ہے اس لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

---

[1] اقبال کامل از عبدالسلام ندوی [2] داتا گنج بخش اس نظریہ کے مخالف تھے انکے نزدیک ایسے صوفیہ مردود ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کشف المحجوب۔

اس دنیا کی زندگی خواب کی مانند ہے اور ظاہر ہے کہ خواب میں کئے ہوئے اعمال کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نظریہ کے تحت بھی صوفیوں نے دنیا کو ترک کر دینے کی تعلیم دی۔ سائے کے پیچھے بھاگنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ یہ خواب کی کیفیت بھی ہمارے وجود نے پیدا کی ہے حقیقت آشنا ہونے کے لئے اس سے دامن چھڑانا ضروری ہے اس نظریے کو بھی ہمارے شاعروں نے مختلف پہلوؤں سے بیان کیا ہے۔ غالب کہتے ہیں ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

میر نے تصوف کی گود میں پرورش پائی تھی۔ انھوں نے کہا

یہ توہم کا کارخانہ ہے — یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

اور خواجہ میر درد جو خود صوفی تھے، فرماتے ہیں۔

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

دنیا کے موہوم ہونے کا یہ خیال افلاطون کے اعیان نامشہود کے نظریے نے پیدا کیا اسی لئے اقبال نے اس کو گوسفندان قدیم میں شمار کیا ہے ان کے خیال میں افلاطون اس نظریے کا خالق اس لئے بنا کیونکہ وہ ذوق عمل سے محروم تھا۔

بسکہ از ذوق عمل محروم بود — جان او وارفتۂ معدوم بود
منکر ہنگامہ موجود گشت — خالق اعیان نامشہود گشت

صوفیا کے یہ دونوں نظریئے وحدت الوجود کے زیر اثر پیدا ہوئے اور ان کے اثرات بھی مسلمان قوم پر ایک جیسے ہوئے یعنی اس دنیا میں دلچسپی نہ لینا اور وجود کو ختم کرنا جو خدا سے جدائی کا باعث ہے چنانچہ مسلمان بے عملی کا شکار ہو گئے اور آسمان نے ان کو ثریا سے زمین

پردے مارا۔ اقبالؔ نے ان نظریات کی شدت سے مخالفت کی اور قوم کو عمل پر ابھارا۔ انھوں نے کہا کہ اس دنیا کو چھوڑ کر غاروں اور پہاڑوں میں جانا اور وہاں ریاضت اور مجاہدہ سے خدا کو پانے کی کوشش کرنا سراسر کافری ہے۔ اپنی خودی کو مٹانے کا نظریہ کفر پر مبنی ہے اسلام تو خودی کے چراغ کو روشن کرنا چاہتا ہے اور وجود کے مٹانے کے خلاف ہے۔

فقر مومن چیست تسخیر جہات بندہ از تاثیر او مولا صفات
زندگی آن را سکون غار و کوہ زندگی ایں را ز مرگ باشکوہ
آں خدا را جستن از ترک بدن ایں خودی را بر فساں خود زدن!
آں خودی را کشتن، واسوختن ایں خودی را چوں چراغ افروختن

چنانچہ اقبال نے نفی وجود کی بجائے اثبات وجود کا نظریہ پیش کیا۔ انھوں نے صوفیا کے نظریات کا جائزہ قرآن کی روشنی میں لیا اور پھر اپنا فلسفۂ خودی پیش کیا۔ جو قرآنی مقاصد کو بروئے کار لاتا ہے۔ سب سے پہلے خودی کا مطلب بدل دیا اور اس سے وجود مراد لینے کی بجائے رُوح مراد لی انھوں نے صوفیا کا یہ نظریہ قبول کر لیا کہ خودی خدا کا ہی جزو ہے۔ اور اسی سے علیحدہ ہو کر ایک مستقل وجود اس نے حاصل کر لیا ہے اس خیال کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے چنانچہ اقبال نے صوفیا کی یہ تشبیہ بھی اپنائی کہ خدا سمندر ہے اور انسان ایک قطرہ جو سمندر سے الگ ہو گیا ہے مگر یہ قطرہ اب قطرہ نہیں رہا بلکہ گوہر بن گیا ہے۔ یہ گوہر بغیر سمندر کے وجود میں نہیں آسکتا تھا[۱]

خودی را از وجودے حق وجودے خودی را از نمودے حق نمودے
نمی دانم کہ ایں تابندہ گوہر کجا بودے اگر دریا نہ بودے

اقبال نے انسان کو قطرے سے گوہر اس لئے بنا دیا ہے کہ خدا سے وصال ہونے کے بعد

---

[۱] پرانے حکما کا خیال تھا کہ پانی کا ایک قطرہ صدف کے اندر چلا جاتا ہے اور وہ اسے مدبّر کر کے موتی بنا دیتی ہے۔

بھی انسان کو قطرے سے گوہر اس لئے بنادیا ہے کہ خدا سے وصال ہونے کے بھی انسان کا وجود برقرار رہتا ہے اور وہ اپنی انفرادیت کو کبھی نہیں کھوتا اقبال قطرے کے سمندر میں مل جانے کو پسند نہیں کرتے کیونکہ یہ تشبیہہ وجود کو فنا کرنے کی طرف اشارہ کرتی ہے اپنی نظم شبنم انھوں نے استعارے کی زبان میں اسی حقیقت کو بیان کیا ہے جب شبنم کو دریا میں اپنا وجود فنا کر دینے کو کہا جاتا ہے تو وہ جواب دیتی ہے کہ وہ اپنا وجود ختم کر کے دریا بننا پسند نہیں کرتی اس لئے سمندر میں ملنے کی بجائے لالے کے پھول پر گر کر چمکتی ہے۔

من عیش ہم آغوشی دریا نہ خریدم
آں بادہ کہ از خویش رباید نہ خریدم
از خود نہ دمیدم
ز آفاق بریدم
بر لالہ چکیدم

وہ اس ندی کو پسند کرتے ہیں جو صحرا میں جذب ہو جائے مگر سمندر میں مل کر اپنا وجود فنا نہ کرے ؎

اے خوش آں جوئے تنک مایہ کہ از ذوق خودی
در دل خاک فرو رفت بہ دریا نہ رسید

اقبال نے اپنے خطبات میں خدا کو
لا محدود خودی یا خودی کامل قرار دیا ہے۔ جو انسانی خودی کی پیدائش کا باعث ہے اقبال خودی اور خدا کے تعلق کو مختلف پہلوؤں سے بیان کیا ہے اس نے خدا کو قرآن اور خودی کو سیپارہ اور خدا کو سورج اور انسان کو ستارا کہہ کر اپنا مطلب واضح کیا ہے جس طرح سیپارہ

قرآن ہی کا حصہ ہے مگر اپنا وجود علیحدہ بھی رکھتا ہے اور ستارہ سورج کی روشنی سے منور ہوتا ہے مگر اس کی اپنی بھی بحال رہتی ہے۔ قرآن کے بغیر سیپارے کا وجود نا ممکن ہے اور سورج کے بغیر ستارے کی ہستی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے اسی طرح انسانی خودی خدا یا لامحدود خودی کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔

تو خورشیدی و من ستارۂ تو
سراپا نورم از نظارۂ تو
ز آغوشش تو دورم ناتمام!
تو قرآنی و من سیپارۂ تو[۱]

خدا نے خودی کو پیدا کیا ہے۔ لامحدود خودی ہی محدود خودی کی خالق ہے۔ مگر تخلیق کا یہ عمل اس طرح نہیں ہوا کہ خدا نے کائنات پیدا کی اور پھر ایک تماشائی کی طرح الگ ہٹ کر دیکھتا رہا یا ایک مشین بنا کر چلا دی اور اب الگ ہٹ کر اس کا نظارہ کر رہا ہے۔ خدا ہر وقت تخلیق کا کام کرتا رہتا ہے[۲] اس لامحدود خودی میں بے شمار خودیاں موجود ہیں اور ہر لمحہ وجود میں آتی رہتی ہیں۔ چنانچہ بعض صوفیاء کا یہ نظریہ کہ جب یہ کائنات

---

[۱] اور ایک جگہ کہا کہ انسان خدا کے ضمیر میں ہی موجود تھا۔ اس نے اس تابندہ گہر کو جوشش خود نمائی میں کنارے پھینک دیا۔

بہ ضمیرت آرمیدم تو بجوشش خود نمائی   بہ کنارہ بر فگندے در آبدار خود را!

[۲] اقبال کا یہ شعر: یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید ٭ کہ آرہی ہے صدائے کن فیکوں
اور قرآن کہتا ہے "خدا اپنی تخلیق میں جو اضافہ چاہتا ہے کر دیتا ہے۔"

پیدا نہ ہوئی ہوتی تو اس وقت صرف خدا ہی خدا تھا اور اب غیر خدا کائنات پیدا ہو گئی ہے درست نہیں ہے۔ خدا پہلے بھی تھا اور اب بھی ویسا ہی ہے وہ ساری کائنات میں جاری و ساری ہے اور ہر لحظہ تخلیق کا کام کرتا رہتا ہے کیونکہ اس کی تخلیقی قوت ہر وقت مصروف کار رہتی ہے۔ حضرت بایزید بسطامی کے ایک شاگرد نے ان سے ایک مرتبہ کہا تھا ایک وقت تھا جب خدا کے سوا کچھ موجود نہ تھا۔ اور حضرت بایزیدؒ نے فوراً جواب دیا تھا۔ جیسا پہلے تھا اب بھی ویسا ہی ہے غالب نے اس عام نظریئے کو یوں بیان کیا ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

مگر یہ نظریہ اقبال کے نزدیک قطعاً غلط ہے۔ خدا کائنات سے الگ نہیں ہے۔ کائنات اسی کا حصّہ ہے اور تھی۔ صرف اسے ایک خاص شکل دی گئی ہے خودی اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ خود خدا یا محدود خودی۔

ز آغاز خودی کس را خبر نیست
خودی در حلقۂ شام و سحر نیست
ز خضر ایں نکتۂ نادر شنیدم
کہ بحر از موج خود دیرینہ تر نیست

جس طرح سمندر اور اس کی موجیں دو مختلف چیزیں ہونے کے باوجود ایک ہی چیز ہیں اور کسی کا وجود دوسرے سے پرانا نہیں ہے۔ موج اپنی پیدائش سے پہلے بھی سمندر میں ہی موجود ہوتی ہے۔ ہم موج کے خاص نام

سے اس کو اس وقت پکارتے ہیں جب وہ ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے اسی طرح خودی خدا میں ہی موجود تھی۔ مگر ایک مخصوص شکل پانے کے بعد اس کا علیحدہ وجود قائم ہوا مگر اس کا رشتہ ہر وقت خدا سے موجود رہتا ہے۔ جیسا کہ سیپارے اور قرآن یا موج اور دریا کا رشتہ ہے۔ خدا سے ہی اس کو تقویت ملتی ہے۔ اور کائنات سے الگ وجود رکھتے ہوئے بھی اس میں جاری ہے اس کا رشتہ کائنات سے کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ [1]

اسی لئے قرآن میں خدا کہتا ہے کہ

"میں تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں"

جتنی کوئی خودی مکمل ہو اتنا ہی اس کو خدا کا قرب نصیب ہوتا ہے۔

کائنات میں سب سے اعلیٰ خودی چونکہ انسان کی ہے اس لئے خدا باقی اشیاء کی نسبت اس سے زیادہ قریب ہے۔

چونکہ خدا اور انسان دونوں رُوح یا خودی ہی ہیں۔ خدا لامحدود خودی اور انسان محدود خودی کا مالک ہے۔ مگر دونوں میں گہرا رشتہ موجود ہے۔

---

[1] اقبال کا شعر ہے۔

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے!

اس لئے اقبال نے کہا ہے کہ

اگر انسان خدا کو تلاش کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے آپ کو تلاش کرنا چاہیئے۔ جب وہ اپنی خودی کو پالے گا تو خدا اسے خود بخود مل جائے گا۔ [1]

بیا بر خویش پیچیدن بیاموز
بناخن سینہ کاویدن بیاموز
اگر خواہی خدا را فاش بینی
خودی را فاش تر دیدن بیاموز

خدا اور خودی کے اس گہرے تعلق کی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ خدا کو ڈھونڈنے نکلیں تو خود اپنے کو پائیں گے اور اگر اپنی ذات کا شعور حاصل کر لیں تو خدا کو پالیں گے۔

کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی
کہ او پیداست تو زیر نقابی

---

[1] امام غزالیؒ کا خیال بھی یہی ہے کہ معرفت خود معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر بنیاد رکھی ہے کہ

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ،

جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا ۔۔۔۔۔۔ چونکہ نفس یا روح کا تعلق خدا سے ہے اس لئے جو اسے جان لے گا وہ خدا کو پہچان لے گا۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو کیمیائے سعادت، باب معرفتِ خود۔

تلاشِ او کنی جز خود نہ بینی ؛ تلاشِ خود کنی جز او نیابی

اور دوسرے مقام پر فرمایا کہ دل و عقل حیران ہیں کہ تیری تلاش میں نکلوں یا اپنے آپ کو تلاش کرنے جاؤں۔

من بہ تلاشِ تو روم یا بہ تلاشِ خود روم
عقل و دل و نظر ہمہ گم شدگانِ کوئے تو

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ساری خدائی خدا ہی ہے اور انسان اور خدا کا وجود الگ نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اور خدا کا گہرا تعلق ہے اور اس کی خودی جب اپنی اصلی حالت میں ہوتی ہے اور آلائشوں سے پاک ہوتی ہے تو وہ خدا سے بہت قریب ہوتی ہے اس کو پانے کے بعد خدا کو پانا آسان ہے۔ خدا کا مسکن بھی انسانی دل ہے اور خودی کا مقام بھی یہی ہے۔ انسان کا دل خدا کا امین ہے۔ اس لئے جب وہ دل میں جھانکے گا تو خدا کو پالے گا۔ خدا ایک چراغ کی مانند ہے جو انسان کے دل کو روشن کرتا رہتا ہے [۱]

چراغ درمیان سینۂ تست ؛ چہ نور است ایں کہ در آئینہ تست
مشو غافل کہ تو اورا امینی ؛ چہ نادانی کہ سوئے خود نہ بینی

اور خودی کے متعلق کہا کہ یہ بھی اپنی وسعتوں کے باوجود انسان کے دل میں موجود ہے [۲]

---

[۱] آتش کا شعر ہے۔ دل روشن ہے روشن گر کی منزل ؛ یہ آئینہ سکندر کا مکان ہے!

[۲] امام غزالی بھی دل کے ثنا خواں ہیں۔ کیونکہ یہ روح کا مسکن ہے بلکہ وہ تو دل اور روح کو مترادف قرار دیتے ہیں۔ لہذا ان کے نزدیک دل کی قوتیں لامحدود ہیں خود اقبال نے بعض مقامات پر دل کو انہی معانی میں استعمال کیا ہے۔

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
جس طرح آسمان آنکھ کے عمل میں ہے

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے کہا کہ اگر انسان اپنے آپ کو تلاش کرے تو وہ خدا کو تلاش کرے گا۔ اور جو اپنی ذات کو پہچان لے گا تو وہ خدا کو پہچان لے گا۔

خودی کا وجود خدا سے الگ ہے اور وہ کبھی فنا نہیں ہوتا یہ نظریہ اقبال نے قرآن سے حاصل کیا ہے اور اسی لئے صوفیا کے اس خیال کو رد کر دیا کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ خدا میں ضم ہو جائے۔ رسول اکرم ؐ کا معراج انسانی عروج کی انتہا ہے مگر وہ جب خدا کے سامنے گئے تو ان کا علیحدہ وجود برقرار تھا۔ اقبال نے واقعہ معراج سے یہی نتیجہ نکالا ہے۔ اور خودی کی انتہائی بلندیوں پر بھی وہ خدا میں جذب نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنا الگ وجود برقرار رکھتی ہے لہ جیسا کہ اس فارسی شعر میں واقعہ معراج کے متعلق کہا گیا ہے۔

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوہ صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی

محدود خودی غیر محدود خودی سے بالکل علیحدہ ہو کر تعلق ختم نہیں کرتی مگر دونوں میں امتیاز باقی رہتا ہے۔ قرآن مجید میں کہا گیا کہ مرنے کے بعد انسانوں کی روحیں برزخ میں رہتی ہیں اور پھر قیامت کے دن سب انسانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور اس دن نیک لوگوں کے روشن چہرے خدا کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

"بہت سے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے"
(قرآن)

لہ THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHTS IN ISLAM P. 118

اس کا مطلب یہ ہوا کہ روح فنا نہیں ہوتی اور انسان کا وجود برقرار رہتا ہے یہ الگ بات ہے کہ مرنے کے بعد یہ وجود ختم ہو جائے مگر کوئی دوسرا وجود روح کو مل جائے یہ جسم تو روح کو ایک امتیازی حیثیت دینے کے لئے عطا ہوا ہے یعنی ہمارے جسم کی وجہ سے ہم نہیں ہیں بلکہ جسم ہماری وجہ سے وجود میں آیا ہے۔ مولانا روم نے اس شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

پیکر از ما ہست شد نے ما ازو
بادہ از ما مست شد نے ما ازو

چنانچہ جب یہ پیکر نیست ہو جاتا ہے تو ہم ختم نہیں ہوتے۔ موت کا فرشتہ ہمارے بدن کو چھوتا ہے مگر وجود کے مرکز یعنی رُوح سے دور رہتا ہے۔ اقبال ضرب کلیم "آیا ت" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے
اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے
مہ و ستارہ مثال شرارہ یک دو نفس
مے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

اور بال جبریل میں اسی مضمون کو دوسرے انداز سے یوں بیان کرتے ہیں۔

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

لہ حضرت داتا گنج بخش کا خیال ہے کہ روح لطیف جسم رکھتی ہے اور اس میں دیکھی بھی جا سکتی ہے مگر دل کی آنکھوں سے۔ (کشف المحجوب)

چنانچہ اقبال ہر پہلو سے فنا کے مسئلے کے خلاف ہیں۔ مگر وہ صوفیا کے اس نظریے سے متفق ہیں کہ ساری کائنات غیر محدود خودی کے تخلیقی عمل کی وجہ سے وجود میں آتی ہے اور غیر محدود خودی سے خودیاں ہی تخلیق ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ہر چیز میں خودی ہے ان کے نزدیک مادہ اور روح کی علیحدگی کا تصور غلط ہے۔ روح مادے کی ہی مصفا اور پاک شکل ہے۔ اقبال اپنے خطبات میں لکھتے ہیں۔

"مادہ کیا ہے؟ یہ کمتر درجہ کی خودیوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں سے اس وقت اعلیٰ درجہ کی خودی پیدا ہوتی ہے۔ جب ان کا ملاپ اور باہمی عمل ایک خاص ترکیب پاتا ہے"[1]

اقبال نے شاعری میں بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چاند اور تاروں کی چمک زندگی کی علامت ہے۔ سونے، چاندی، پارے اور کانٹوں اور پھولوں سب میں زندگی پائی جاتی ہے۔ ساقی نامہ کا یہ بند ملاحظہ کریں۔ اس میں اقبال نے زندگی کی حقیقت یوں بیان کی ہے۔

دمادم رواں ہے یم زندگی ہر اک شے سے پیدا رم زندگی

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود

گراں گرچہ ہے صحبت آب و گل خوش آئی اسے محنت آب و گل

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں!

چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے

اسی کے بیاباں اسی کے ببول اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول

---

[1] The Reconstruction of Religious Thought in Islam P. 106

کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور — کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور
کہیں جرہ شاہین سیماب رنگ — لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ
کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

یہ زندگی کے مختلف مظاہر ہیں۔ خودی کے متعلق بھی اقبال نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دراصل زندگی اور خودی ایک ہی چیز ہیں۔ ان میں بہت کم فرق ہے اقبال کہتے ہیں کہ زندگی تلوار ہے اور خودی اس کی دھار ہے یعنی زندگی کے بغیر خودی کا وجود ہی ممکن نہیں۔

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی زندگی کی نکھری ہوئی صورت یا اس کا جوہر ہے۔ خودی تمام کائنات میں ہے اور زمانے کے ستم سہہ کر، شر سے لڑ کر اس نے ترقی کی راہیں کھولی ہیں زندگی ترقی کرتی رہی۔ خودی نکھرتی رہی اور بالآخر آدم کی صورت میں اس کا ظہور ہوا۔ خودی کے اس سفر کو اقبال یوں بیان کرتے ہیں۔

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی — ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی — دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی!!
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں — پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگ رواں
سفر اس کا انجام و آغاز ہے — یہی اس کی تقویم کا راز ہے
کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں — یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اے واسطہ کیا کم و بیش سے ‌ ‌ ‌ ‌ نشیب و فراز و پس پیش سے
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر ‌ ‌ ‌ ‌ ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تمام کائنات کی خودیاں غیر محدود خودی یا خدا سے پیدا ہوئی ہیں تو کیا خیر کے ساتھ شر بھی خدا کا ہی پیدا کردہ ہے۔ اور پھر مختلف انسانوں اور عناصر میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ اقبال نے یہ واضح کر دیا ہے کہ کائنات کی مختلف اشیا اور انسانوں کی خودی میں درجوں کا فرق ہے انسان کے مقابلے میں دوسرے عناصر کی خودیاں کم تر درجہ کی ہیں۔ یہی حال انسانوں کا ہے۔ ان کی خودیاں بھی مختلف درجوں پر ہیں کوئی اعلیٰ ہے اور کوئی ادنیٰ۔ ہر جگہ فرق مراتب موجود ہے اور جو مرتبے کے اس فرق کو نہیں پہچانتا کافر ہے۔

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد
گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی!

بعض صوفیا نے درجات کے اس فرق کو مٹا دیا اور ہر چیز کو خدا کا جز قرار دے کر ایک جیسی کہہ دیا۔ حکیم سنائی یہاں پہونچے کہ انھوں نے رسول اکرم اور ابلیس کو ایک ہی درجہ دے دیا۔ (نعوذ باللہ نقل کفر کفر نہ باشد)

در مذہب عاشقان یک رنگ
ابلیس و احمدؐ است یک سنگ[1]

اقبال اس تصور کے مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں مختلف ہستیاں مختلف مرتبوں کی حامل ہیں اور ان کی خودیوں میں فرق موجود ہے۔ دنیا میں شر اور خیر موجود ہیں ان کو ایک

---

[1] بحوالہ سلیم کے نام جلد سوم از غلام احمد پرویز

چیز قرار نہیں دیا جا سکتا - خدا نہ خیر ہے نہ شر کیونکہ اگر خدا کو خیر کہا جائے تو شر کا وجود بھی ماننا پڑے گا - جو خدا سے الگ موجود ہو - اقبال نے اس مسئلے کو ایک عمدہ مثال سے واضح کر دیا ہے - وہ کہتے ہیں پھول اور کانٹا اگرچہ شاخ سے پیدا ہوتے ہیں مگر شاخ کے اندر نہ پھول ہوتا ہے اور نہ کانٹا - وہ صرف شاخ ہے - شاخ کو ہم کانٹا نہیں کہہ سکتے اور نہ اسے پھول قرار دے سکتے ہیں -

چہ گویم نکتہ زشت و نکو چیست　　زباں لرزد کہ معنی پیچدار است
بروں از شاخ بینی خار و گل را　　دروں او نہ گل پیدا نہ خار است

چنانچہ اقبال کے نزدیک خودیوں میں فرق مراتب موجود ہے اور یہ گردش روزگار اس لئے ہے کہ خودی کی تربیت ہو سکے -

یہ ہے مقصد گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

اقبال کہتے ہیں کہ حضرت آدم کو جنت سے اس لئے نہیں نکالا گیا کہ انھیں سزا دینا مقصود تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان کی خودی جنت میں پرورش نہ پا سکتی تھی اور زشت و خوب کی یہ دنیا ہی خودی کی پرورش کے لئے موزوں جگہ تھی - انسان کی خودی میں جو پوشیدہ صلاحیتیں ہیں - وہ ان کو اس دنیا میں ہی آشکار کر سکتا تھا - روح ارضی آدم کا استقبال کرتے ہوئے کہتی ہے -

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں　　یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں　　تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہونچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے

تعمیر خودی کر اثرِ آہ رسا دیکھ

آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں

اے پیکرِ گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

انسان اپنی صلاحیتوں سے طوفانوں کے تھپیڑے کھا کر آگاہ ہوتا ہے۔ وہ جوں جوں عمل پیہم کی مدد سے آگے بڑھتا ہے اپنی خودی میں مضمر قوتوں سے بھی آگاہ ہوتا رہتا ہے اسی نظم میں علامہ اقبال نے خودی کی تعمیر کا ذریعہ بھی بتا دیا ہے اور وہ ہے عمل پیہم۔ مسلسل عمل خودی کے فروغ کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس کے ذریعے انسان ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بڑھتا ہے چنانچہ قرآن میں انسان کو جانچنے کا آلہ اس کے اعمال کو قرار دیا گیا ہے۔

"وہ بڑا برکت والا ہے جس کے ہاتھ میں راج ہے اور وہ تمام چیزوں پر قادر ہے جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ دیکھے کہ تم میں سے اعمال کے اعتبار سے کون اچھا ہے"

قرآن خیال کی بجائے عمل پر زور دیتا ہے کیونکہ عمل یا جوشِ کردار تقدیر کے راز کو کھولتا ہے اور انسان مسلسل عمل سے اس کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔ اقبال نے بھی عمل کی اہمیت کو مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے۔

راز ہے راز ہے تقدیر جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیر سکندر کا طلوع
کوہ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز

جوشش کردار سے تیمور کا سیل ہمہ گیر　　سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صف جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر　　جوشش کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

علامہ اقبال کے نزدیک بے عملی کی زندگی خودی کے حق میں موت کا حکم رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ان تمام نظریوں اور فلسفہ ہائے زندگی کی مذمت کی ہے جو بے عملی کی ترغیب دیتے ہیں۔ افلاطون کا اعیان نامشہود کا نظریہ بے عملی کی طرف راغب کرتا ہے اور تصوف کا دنیا سے گریز کا تصور بھی انسانی قوی کو شل کر دیتا ہے۔ ان دونوں نظریوں نے مشرقی قوام پر انیون کا اثر کیا ہے اس لئے اقبال نے شدت سے ان کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ عمل کے بغیر ارفع واعلیٰ مقاصد بھی بے کار ہو جاتے ہیں باعمل قومیں کس طرح بے عملی کا شکار ہوتی ہیں۔ اس کو اقبال نے شیر اور لومڑی کی حکایت سے واضح کیا ہے لومڑی شیر کو تصوف کا سبق پڑھاتی ہے یعنی اپنی خودی یا دبدبہ کو مار کر ہی ترقی کی منازل طے کی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ لومڑی شیر سے کہتی ہے کہ تو دوسروں کو تو مارتا رہتا ہے۔ کبھی اپنے آپ کو بھی مار کر دیکھ۔ اس سخت کوشی کو چھوڑ اور عبادت الٰہی میں زندگی بسر کر۔ یہ دنیا موہوم ہے۔ اس کا وجود غیر حقیقی ہے اور ایک غیر حقیقی چیز کے پیچھے بھاگنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ شیر کو یہ بیٹھا زہر پسند آگیا اور اس نے شکار کے پیچھے بھاگنے کا کام ترک کر کے ایک جگہ بیٹھے رہنے کا مشغلہ اختیار کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ لومڑی کا مقصد پورا ہو گیا۔ کیونکہ اب شیر بیکار ہو گیا تھا اور وہ اس سے محفوظ تھی مسلمان بھی شیر کی مانند تھے مگر غیروں نے ان کو نفی خودی اور بے عملی کا سبق پڑھا کر گوسفند بنا دیا اور وہ تن آسانی کا شکار ہو گئے۔ تن آسانی عمل کی سب سے بڑی دشمن ہے اس لئے اقبال نے تن آسانی کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے اور سخت جانی کی حمایت میں اپنے قلم کا زور صرف

کردیا ہے۔ مصائب اور تکالیف انسان کو سخت کوش بنا دیتے ہیں۔ اور ایسے طوفانوں کا مقابلہ کرنا سکھا دیتے ہیں۔ تندی باد مخالف عقاب کے حق میں بری نہیں بلکہ اچھی چیز ہے کیونکہ یہ اسے زمین کی پستی کی طرف نہیں بلکہ آسمان کی بلندی پر لے جاتی ہے۔ گردش روزگار اور زمانے کے تھپیڑے انسان پر اس کی خودی کو آشکار کرتے ہیں۔

یہ ہے مقصد گردش روزگار

کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

اگر انسان آرام طلب ہو جائے تو عمل کی دولت سے محروم ہو جائے گا۔

عمل کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے سامنے کوئی مقصد ہو اور اسے حاصل کرنے کی جستجو کرتے رہیں۔ اگر بے مقصد عمل کیا جائے گا تو اس کا فائدہ نہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ انسانیت کے لئے نقصان کا باعث ہو۔ برگساں نے بھی زندگی کے آگے بڑھنے کا فلسفہ پیش کیا ہے اور جوش حیات کی بڑی تعریف کی ہے مگر اس کے نزدیک مقاصد کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ کہتا ہے کہ جوش حیات خود بخود منازل طے کرتی رہتی ہے مگر اقبال عمل اور حرکت کیلئے مقاصد کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

زندگانی را بقا از مدعا است — کاروانش را درا از مدعا است

زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصل او در آرزو پوشیدہ است

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم — از شعاع آرزو تابندہ ایم

مقصد کے بغیر عمل ناممکن ہے۔ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمارے دل میں آرزو یا خواہش پیدا ہوتی ہے اور یہ آرزو یا خواہش ہی عمل پر اکساتی ہے۔ اگر آرزو نہ ہو تو عمل وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے اقبال نے آرزو یا تمنا کو بھی بڑی اہمیت دی ہے

آرزو یا تمنا کے بغیر زندگی محال ہو جائے۔ یہ دنیا خواہشات اور تمناؤں ہی کی بدولت اتنی رنگین ہے۔ آرزو انسان کے ہر وقت ساتھ رہتی ہے۔ اور راہ محبت کے مسافر کا تو آخری سہارا بھی ہے۔

راہ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق
ساتھ میرے رہ گئی ایک مری آرزو

یہ آرزو محبت کا جز ہے۔ عشق بغیر آرزو کے وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ کسی کی تمنا جب تک دل کو زخمی نہ کرے عشق اس میں پیدا نہیں ہوتا۔ آرزو جب شدت اختیار کر جاتی ہے تو ہم اس کو عشق کا نام دے دیتے ہیں۔ اور عشق کی نوعیت کا تعین آرزو ہی کرتی ہے۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ صوفیا آرزوؤں اور تمناؤں کا گلا گھونٹ دینا چاہتے ہیں۔ مگر اقبال آرزو کے سوز کو بڑھانا چاہتے ہیں۔ صوفیا کا عشق نفی تمنا سے جنم لیتا ہے۔ مگر اقبال کا عشق تمنا کی بقا کا ضامن ہے۔ اسی تمنا کی بدولت وہ آگے بڑھتا رہا اور اس دنیا کو تسخیر کرنے کے بعد کائنات کا کام شروع کر دیتا ہے اقبال کے ہاں آرزو مقاصد کو تخلیق کرتی ہے اور پھر ان کی تسخیر کا کام شروع کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ صوفیا کا عشق غاروں میں چھپ جاتا ہے اور اقبال کا عشق ستاروں پر کمند ڈالنے کے منصوبے باندھتا ہے اور پھر ان سے بھی آگے اپنی منزل تلاش کرتا ہے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

عمل کو شدت بخشنے والی سب سے بڑی قوت عشق ہے یہ عمل کو تسلسل عطا کرتی ہے اور نصب العین سے محبت سکھاتی ہے۔ عشق اپنے نصب العین کے حصول کے لئے کسی خطرے سے نہیں ڈرتا۔ یوں یہ عمل کو بے خوف بنا دیتا ہے۔ اور تمام اندیشوں کو راہ سے ہٹا دیتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

عشق بے پناہ قوتوں کا مالک ہے اور خودی کے استحکام اور ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے کبھی کبھی تو اقبال عشق پر اتنا زور دیتے ہیں کہ وہ بے حد اہمیت اختیار کر جاتا ہے اور خودی کے مترادف نظر آنے لگتا ہے۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفٰے
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق فقیہہ حرم، عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزار وں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق ہے نور حیات عشق ہے نار حیات

عشق، زندگی، اور خودی ان تینوں کا اقبال کے ہاں گہرا تعلق ہے۔ یہاں اقبال نے عشق کو نور حیات اور نار حیات قرار دیا ہے۔ اور خودی کو زندگی کی تلوار کی دھار کہا ہے۔ خودی زندگی کے متعلق لکھتے ہوئے وہ اسے اتنی ہی قوی بنا دیتے ہیں جتنی کہ خود خودی ہے۔ بہر حال اگر ان میں ترتیب قائم کی ہے تو عشق زندگی سے اور خودی عشق سے بہتر قرار پاتی ہے۔

جوہر زندگی ہے عشق، جوہر عشق ہے خودی

گزشتہ سطور کے مطالعہ سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ خودی کے لئے عمل، عشق، آرزو اور مقاصد ضروری ہیں۔ عمل، عشق، آرزو اور مقاصد کا آپس میں بھی گہرا تعلق ہے۔ مقاصد کے بغیر آرزو پیدا نہیں ہوتی، آرزو عشق کی خالق ہے۔ اور عشق عمل کا خالق ہے عمل انسان کو فائدہ ضرور پہونچاتا ہے۔ چنانچہ اقبال نے کہیں نپولین کے جوش کردار اور مسولینی کی ندرت فکر و عمل کی تعریف کی ہے اور کہیں اسی جوش کردار کی وجہ سے چنگیز یا تیمور کو اللہ کے نشتر قرار دیا ہے مگر اچھا عمل وہی ہے۔ جس سے ساری انسانیت فائدہ اٹھائے۔ عمل زندگی کو جنت بھی بنا سکتا ہے اور جہنم بھی۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

عمل سے انسانی خودی کی تعمیر ہوتی ہے۔ خودی ہٹلر اور مسولینی کی بھی عمل سے تقویت حاصل کر گئی تھی مگر چونکہ ان کے مقاصد اعلیٰ اور ارفع نہ تھے۔ اس لئے وہ انسانیت کیلئے خیر کی بجائے شر بن گئے۔ اقبال کہتے ہیں کہ:۔

"خودی مسولینی کی ہو یا ہٹلر کی قانون الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے"۔ ہر انسان عمل سے اپنی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر کے خودی کی تعمیر کر سکتا ہے۔ مگر اسلام خودی کے لئے ایک ایسا نصب العین پیش کرتا ہے۔ جو ایک مثالی معاشرہ کی تشکیل میں ممد ثابت ہو[۱]۔ چنانچہ خودی کی تربیت یوں ہونی چاہئے کہ وہ نیابت الٰہی کا فریضہ ادا کر سکے۔ اقبال نے اس کیلئے پہلی بات جو ضروری قرار دی ہے وہ اطاعت ہے

در اطاعت کوش اے غفلت شعار — می شود از جبر پیدا اختیار

[۱] خودی بذات خود مسلمان نہیں ہے۔ یہ تو ہر شخص میں موجود ہے کافر ہو یا مومن مگر اس کی تربیت کا بہترین ذریعہ اسلام ہی ہے۔

جب تک کسی خاص آئین کی پابندی نہ کی جائے ترقی ناممکن ہے۔ آئین کی اطاعت ہی انسان میں آگے بڑھنے کی قوت پیدا کرتی ہے۔ اور یہ آئین کیا ہے؟ خودی کی تربیت کا ذریعہ جو اسے شر نہ بننے دے بلکہ خیر میں ڈھال دے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ رسول اکرمؐ کا دیا ہوا آئین ہی اپنے اندر یہ قابلیت رکھتا ہے اس کی سختی کی شکایت نہیں کرنی چاہئے اور حدود مصطفٰے سے باہر نہیں جانا چاہئے۔

شکوہ سنج سختی آئین مشو
از حدود مصطفٰے بیروں مشو

اطاعت کے بعد ضبط نفس کی منزل ہے اگر انسان کو اپنے آپ پر کنٹرول نہ ہو تو وہ کبھی بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتا اگر کوئی شخص اپنے آپ پر حکومت نہیں کر سکتا تو وہ دوسروں پر بھی حکم نہیں چلا سکتا۔

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں
می شود فرماں پذیر از دیگراں

اقبال کے نزدیک اپنے نفس کو قابو میں کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خوف دنیا، خوف عقبیٰ، خوف جان اور خوف آلام زمین سے نجات حاصل کرے۔ اسی طرح اسے بعض چیزوں کی محبت سے بھی احتراز کرنا چاہئے۔ مثلاً حب مال و دولت، حب وطن، حب خویش واقربا، حب زن، یہ محبتیں بھی انسان سے ایسے کام کرواتی ہیں جو خودی کے مضر ہیں! اور ان محبتوں اور خوف سے بچنے کے لئے لا الٰہ کی تلوار ہاتھ میں ہونی چاہئے۔ ۲۔ نماز سے اپنے دل کو قوی کر لیا جائے ۳۔ روزہ کی امداد سے تن پروری سے نجات حاصل کر لی جائے ۴۔ حج سے وطن پرستی ختم کی جائے اور ہجرت کا سبق سیکھا جائے ۵۔ حب دولت کو زکواۃ سے ختم کیا جائے۔ یہ

پانچ چیزیں انسان کے نفس کو قابو میں کرتی ہیں اور وہ نفس کے اونٹ پر سواری کے قابل بن جاتا ہے جب انسان ان دو مرحلوں سے گزر جاتا ہے تو وہ خدا کا نائب کہلاتا ہے جب خودی کی نشوونما اور اس کی تربیت کے بعد انسان نیابت الٰہی کے مرتبے پر فائز ہوتا ہے تو وہ کائنات پر اپنا حکم چلاتا ہے۔ چونکہ وہ خدا کا نائب ہے اس لئے خدا کی صفات اس میں آجاتی ہیں۔ اقبال کا "مرد مومن" اسی مرتبے پر فائز ہوتا ہے۔

نائب حق در جہاں بودن خوش است ۔۔۔ بر عناصر حکمراں بودن خوش است

اے سوار اشہب دوراں بیا ۔۔۔ اے فروغ دیدہ امکاں بیا

رونق ہنگامہ ایجاد شو ۔۔۔ در سواد دیدہ ہا آباد شو

شورش اقوام را خاموش کن ۔۔۔ نغمۂ خود را بہشت گوش کن

اقبال کے نزدیک یہ خودی کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ اور کاروان زندگی کی یہی منزل ہے۔

نوع انساں مزرع تو حاصلی

کاروان زندگی را منزلی

اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ اور اس کی مرضی خدا کی مرضی بنجاتی ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

غالب و کار آفریں کار کشا کارساز

اور

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

انسانی خودی کی بلندی اس انتہا کو پہونچتی ہے کہ اس کا مرتبہ فرشتوں سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔

فروغِ مشتِ خاک از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیر او گردوں شود روزے

مردِ مومن جب یہ بلند مقام حاصل کر لیتا ہے تو وہ اپنے آپ کو انسانیت کی بھلائی کے لئے وقف کر دیتا ہے اور یہیں سے بے خودی کی منزل شروع ہوتی ہے۔ اقبال کا فلسفہ بے خودی جماعت یا قوم کے لئے ہے۔ فرد یا جماعت کے تعلق پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو فرد کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک افراد کی آزادی ہی سب سے بڑی چیز ہے۔ اسے جماعتی بندھنوں میں مقید کرنا ناروا ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ افراد کے بغیر جماعت کا تصوّر بے معنی ہے اور افراد نے ہی قوموں کی تقدیر کو بنایا ہے زندگی کی قدروں کا تعین فرد ہی سے ہوتا ہے۔ اور وہی ان کا خالق بھی ہے۔ بقول جوڈلیر "حقیقی ترقی جو اخلاقی ترقی سے عبارت ہے۔ فرد کی ذات میں اور فرد کے ذریعے ہی سے ممکن ہے۔"

دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ قوم کے سامنے افراد کی کوئی اہمیت نہیں۔ افراد کے خیالات کو آزاد چھوڑنا خطرناک ہے۔ قوم افراد کے اعمال پر پابندیاں لگانے کی حق دار ہے۔ اور وہ اس کے دائرہ کار کی حدود متعین کرنے کی بھی مجاز ہے۔ فرد بغیر جماعت کے زندہ نہیں رہ سکتا افراد کی جبلت میں یہ بات ہے کہ وہ مل جل کر رہیں۔ جیسا کہ ارسطو نے کہا کہ فرد ایک عمرانی حیوان ہے" وہ معاشرے میں ہی رہ سکتا ہے۔ لہذا معاشرے کو حق حاصل ہے کہ اس کو کنٹرول کرے۔ اگر ان افراد کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں گے۔

اور طاقتور کمزوروں کو ہڑپ کر جائیں گے۔ معاشرہ افراد کے اعمال کو کنٹرول کر کے ان اخلاقی معیاروں کا پابند بناتا ہے چنانچہ جماعت فرد کی نسبت اہم ہے۔ اور ضرورت پڑے تو فرد کو جماعتی اصولوں پر سے قربان کیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے ان نقطہ ہائے نظر کے امتزاج سے ایک نیا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ ان کا فلسفہ خودی فرد کی قوت کا مظہر ہے اور فلسفہ بے خودی اس قوت کو ملت کے لئے مفید بناتا ہے۔ اور ملت کی خودی کے عناصر کی نشاندہی کرتا ہے ملت فرد کے کاموں کے لئے محتسب ہے۔ اس کے بغیر تنہا فرد اپنے مقاصد سے غافل ہو جاتا ہے چنانچہ ملت اس کی قوت کو آئین کا پابند بناتی ہے۔ دراصل اقبال نے فرد اور ملت دونوں کو ایک آئین کا پابند بنا کر اس نے ان کے مقاصد میں ہم آہنگی پیدا کی ہے فرد کی خودی ہو یا قوم کی خودی دونوں رسول اکرم کے عطا کردہ آئین کی پابند ہے۔ اسی لئے دونوں میں کبھی تصادم نہیں ہوتا۔ فرد ملت کے اندر آزاد بھی ہے اور پابند بھی۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے پوری آزادی سے کام لیتا ہے لیکن جب اس کی خودی تکمیل کے مراحل طے کر لیتی ہے تو وہ بھی ملت کے آئین کی پابند ہو جاتی ہے اور ایک خاص نصب العین کے حصول میں لگ جاتی ہے۔ چنانچہ فرد جماعت کے اندر شمشاد کی طرح ہے جو آزاد بھی ہے اور پابہ گل بھی ہے۔

فرد تنہا از مقاصد غافل است قوتش آشفتگی را مائل است
قوم باضبط آشنا گرداندش نرم رو مثل صبا گرداندش
پا بہ گل مانند شمشادش کند دست و پا بندد کہ آزادش کند
چوں اسیر حلقہ آئین شود آہوئے رم خوردۂ ادشکیں شود
تو خودی از بے خودی نشناختے خویش را اندر گماں انداختے

اقبال نے خدا اور انسان کے تعلق کو ظاہر کرنے کے لئے صوفیا کی استعمال کردہ قطرے

اور سمندر کی تشبیہ کو رد کر دیا تھا اور اس کی جگہ سمندر اور قطرے کی تشبیہ ہی استعمال کرتے تھے کیونکہ فرد کو ملت میں ضم ہو جانا چاہیئے۔ جیسے قطرہ اپنے آپ کو سمندر میں ملا کر خود سمندر بن جاتا ہے۔ اسی طرح فرد ملت میں مل کر اپنا اور ملت کا وجود ایک بنا دیتا ہے۔

فرد تا اندر جماعت گم شود!
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

جس طرح تمام قطروں کے بغیر سمندر کا وجود ممکن نہیں اسی طرح افراد کے بغیر ملت نہیں بن سکتی۔ جس طرح تمام قطروں کا ربط ان کو سمندر میں بدل دیتا ہے۔ جس کی بے پناہ قوت ہے اسی طرح تمام افراد کے باہمی ربط سے ایک زبردست ملت وجود میں آتی ہے۔ ملت ایک درخت ہے اور افراد اس کی شاخیں ہیں اگر شاخ درخت سے ٹوٹ کر علیحدہ ہو جائے تو اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے اور اگر درخت سے وابستہ رہے تو خزاں کے بعد اس پر بہار کا موسم آتا ہے۔ اور برگ و بار اس کو سجاتے ہیں۔

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ — ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے
ہے لازوال عہد خزاں اسکے واسطے! — کچھ واسطہ نہیں اسے برگ و بار سے
ہے ترے گلستاں میں بھی فصل خزاں کا دور — خالی ہے جیب گل زر کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوت اوراق میں طیور — رخصت ہوئے ترے شجر سایہ دار سے
شاخ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو — نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ — پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

اسی مضمون کو اس شعر میں بانداز دیگر یوں بیان کیا ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

افراد آتے اور جاتے رہتے ہیں مگر قوم قائم رہتی ہے افراد کی بقا قوم ہی کے ذریعے ہوتی ہے ورنہ فرد کی زندگی تو مختصر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قوموں کی زندگی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ وہ قانون فطرت پر پوری اترتی رہیں۔ یا اپنی خودی کی تعمیر کرتی رہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ قوم صرف موجودہ افراد کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ اس میں گزرے ہوئے انسانوں کی تاریخ بھی ہے۔ اور آنے والی نسلیں بھی اس کا جزو ہیں اسی طرح ملت غیر محدود بن جاتی ہے۔ اقبال ایک لیکچر میں کہتے ہیں۔

"فرد فی نفسہ ایک ہستی اعتباری ہے یا یوں کہئے کہ اس کا نام ان مجردات عقلیہ کی قبیل سے ہے جن کا حوالہ دے کر عمرانیات کے مباحث کے سمجھنے میں آسانی پیدا کر دی جاتی ہے بالفاظ دیگر فرد اس جماعت کی زندگی میں جس کے ساتھ اس کا تعلق ہے بمنزلہ ایک آنی اور عارضی لمحے کے ہے۔ اس کے خیالات، اس کی تمنائیں، اس کا طرز ماندو بود اس کے جملہ قوائے دماغی و جسمانی بلکہ اس کے ایام زندگی کی تعداد تک اس جماعت کی ضروریات و حوائج کے سانچے میں ڈھلی ہوتی ہے جس کی حیات اجتماعی کا وہ محض ایک جزوی مظہر ہے۔ فرد کے افعال کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ بسبیل اضطرار و بلا ارادہ کسی ایک خاص کام کو جو جماعت کے نظام نے اس کے سپرد کیا ہے انجام دیتا ہے قوم ایک جداگانہ زندگی رکھتی ہے یہ خیال کہ یہ اپنے موجودہ افراد کا محض ایک مجموعہ ہے۔ اصولاً غلط ہے اور اسی لئے تمدن اور سیاسی اصلاح کی وہ تمام تجاویز جو اس مفروضے پر مبنی ہوں بہت احتیاط کے ساتھ نظر ثانی کی محتاج ہیں۔ قوم اپنے موجودہ افراد کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بہت کچھ بڑھ کر

بڑھ کر ہے۔ اس کی ماہیت پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ غیر محدود ولا انتہا ہی ہے اس لئے اس کے اجزائے ترکیبی میں وہ کثیر التعداد آنے والی نیلس بھی شامل ہیں جو اگرچہ عمرانی حد نظر کے منتہا کے پرلی طرف واقع ہیں۔ لیکن ایک زندہ جماعت کا سب سے اہم جز متصور ہونے کے قابل ہیں[1]

اسی چیز کو اقبال نے ستاروں کی زبان سے اس طرح ادا کیا ہے۔

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا — منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروان ہستی ہے تیز گام ایسا — قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم — داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے — جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

مگر جب قومیں پستی کے گڑھے میں گر جاتی ہیں اور عمل کی قوت سے محروم ہو جاتی ہیں تو اس وقت ان میں کوئی صاحب دل ہستی پیدا ہو کر ان کو ایک نصب العین کے حصول کیلئے تیار کر دیتی ہے۔ وہ ان افراد کو جو حروف کی مانند ہیں ایک دفتر بنا دیتی ہے جس طرح کائنات کا نظام جذب باہمی پر قائم ہے اسی طرح ملت بھی جذب باہمی سے ہی زندہ رہ سکتی ہے۔

تا خدا صاحب دلے پیدا کند — کو ز حرفے دفترے املا کند
ساز پردازے کہ از آوازہ ۂ — خاک را بخشد حیات تازہ ۂ

---

[1] ملت بیضا پر عمرانی نظر

اقبال نے یہی خیال اپنے لیکچر "ملت بیضا پر عمرانی نظر" میں بھی پیش کیا ہے۔

"جس طرح ایک جسم مریض ہونے کی حالت میں بعض دفعہ خود بخود بلا علم و ارادہ اپنے اندر ایسی قوتوں کو برانگیختہ کر دیتا ہے جو اس کی تندرستی کا موجب بن جاتی ہے، اسی طرح ایک قوم جو مخالف قوتوں کے اثرات سے سقیم الحال ہو گئی ہے بعض دفعہ خود بخود ردعمل کرنے والی قوتوں کو پیدا کر لیا کرتی ہے مثلاً قوم میں کوئی زبردست دل و دماغ کا انسان پیدا کر لیا کرتی ہے یا کوئی نئی تخیل پیدا ہو جاتی ہے یا ایک ہمہ گیر مذہبی اصلاح بروئے کار آتی ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قوم کے قوائے ذہنی اور روحانی تمام طاغی اور سرکش طاقتوں کو اپنا مطیع اور منقاد بنائے اور اس مواد فاسد کو خارج کر دینے سے جو قوم کے نظام جسمانی کی صحت کے لئے مضر تھا۔ قوم کو نئے سرے سے زندہ کر دیتے ہیں اور اس کی اصلی توانائی اس کے اعضا میں عود کر آتی ہے۔"

اب تک کی بحث سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ اقبال فرد کے ساتھ جماعت کو اہمیت دیتے ہیں۔ فرد کی تمام قوتیں قوم کی بھلائی کے لئے ہی صرف ہونی چاہئیں اب آیئے یہ دیکھیں کہ اقبال جماعت کے متعلق مزید کیا کہتے ہیں۔

جس طرح فرد کی خودی کی تعمیر ہوتی ہے۔ اسی طرح ملت کی بھی خودی ہے ملت چونکہ افراد کا ہی مجموعہ ہے اسی طرح اس کی خودی کی تعمیر بھی ہوتی ہے۔ اس کے لئے بھی عمل اور عشق کی قوتیں ضروری ہیں چونکہ ملت کا عمل افراد کے عمل پر ہی مشتمل ہوتا ہے اس لئے ایک چیز ہونی چاہئے جو افراد کے کردار کو وحدت کا روپ دے سکے۔ اقبال کے نزدیک توحید ایک ایسا مرکز ہے۔ جو ملت کے افراد کو وحدت بخشتا ہے۔ ایک خدا کی اطاعت کرنے والے

خود بھی ایک ہو جاتے ہیں۔ ایک خدا سے احکامات حاصل کرنے کی وجہ سے ان کے اعمال میں یک جہتی پیدا ہوتی ہے۔

ملت بیضا تن و جاں لا الٰہ | ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ
لا الٰہ سرمایہ اسرار ما | رشتہ اش شیرازہ افکار ما
قوم را اندیشہ ہا باید یکے | در ضمیرش مدعا باید یکے
جذبہ باید در سرشت او یکے | ہم عیار خوب و زشت او یکے

توحید ملت کے لئے ایک مرکز غیر محسوس کی حیثیت رکھتی ہے۔ قوم کے افراد کو ایک ہی راہ پر ڈالنے کے لئے ایک مرکز محسوس کی بھی ضرورت ہے۔ اور ملت اسلامیہ کے لئے مرکز محسوس خانہ کعبہ ہے۔ تمام مسلمان خانہ کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے ہیں۔ اور ہر سال نماز کے موقعہ پر اس مرکز پر جمع ہو کر کثرت میں وحدت کا جلوہ دکھاتے ہیں ہر ملک کے مسلمان کعبہ میں ایک دوسرے سے مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے مسائل سے آگاہ ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ مرکز محسوس مسلمانوں کے اعمال کو ایک مخصوص سمت عطا کرتا ہے۔

ہم چناں آئین میلاد امم! | زندگی بر مرکزے آید بہم
حلقہ را مرکز چو جاں در پیکر است | خط او در نقطۂ او مضمر است!
قوم را ربط و نظام از مرکزے | روزگارش را نظام از مرکزے
راز دار و راز ما بیت الحرام | سوز ما ساز ما بیت الحرام
چوں نفس در سینہ او پروریم | جان شیریں است او ما پیکریم

توحید کے بعد دوسری چیز قوموں کی خودی کی تعمیر کے لئے ایک آئین ہے آئین

کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی کیونکہ اس کے اعمال ایک سمت اختیار نہیں کرتے مسلمانوں کے لئے یہ آئین قرآن حکیم میں موجود ہے۔ ہم آئین بناتے اور ان کو منسوخ کرتے رہتے ہیں اس میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ مسلمانوں کو انسانوں کا بنایا ہوا آئین راس نہیں آسکتا ہے ہمارے پاس خدائی آئین موجود ہے اس کو رہنما بنانے کے بعد ہمارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ خدا نے ہماری بہتری کے لئے جو ہدایات دیں وہ اس کتاب میں موجود ہیں۔ ان خدائی ہدایات کو ہم کسی شخص کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ اور یہ شخص پیغمبر کہلاتا ہے۔ اور وہ بھی ہمارے لئے قابل احترام ہے پیغمبر اس خدائی آئین کو اپنی زندگی میں نافذ کرتا ہے اور اس پر عمل کر کے دکھاتا ہے۔ چنانچہ پیغمبر کی زندگی بھی ہمارے لئے مشعل راہ کا کام دیتی ہے اس لئے کسی ملت کو ایک مرکز پہ لانے اور ان کی خودی کی تربیت کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۔ توحید ۲۔ آئین ۳۔ رسالت

یعنی ایک خدا، ایک کتاب اور ایک رسول۔

یہ تینوں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ اور ملت کو ایک نصب العین کے حصول کے قابل بناتی ہیں اور یہ نصب العین کیا ہے؟ ایک خدا کی حاکمیت کو عام کرنا اور ایک مثالی معاشرہ پیدا کرنا جس میں حریت، مساوات اور اخوت کی بادشاہی ہو۔ جہاں کوئی کسی کا محتاج نہ ہو[1]۔ اس معاشرے میں خدا کا قانون نافذ ہوگا اور بندے اسے منسوخ یا اس میں ترمیم کرنے کے مجاز نہ ہوں گے کیونکہ انسانی فطرت میں یہ بات بھی ہے کہ وہ اپنے مفاد کے لئے قوانین وضع کر لیتی ہے خدا تمام انسانوں سے محبت کرتا ہے اور ان سب کی بہتری چا

---

[1] نکتہ شرع مبین این ست و بس کس نہ باشد در جہاں محتاج کس

کی ہدایات جاری کرتا ہے۔ اس لئے اس آئین کو کسی مخصوص گروہ کے مفادات کا نگراں نہیں بنایا جا سکتا۔ جب تک ملت اسلامیہ نے اس آئین کا دامن تھامے رکھا، کائنات اس کے سامنے لرزہ براندام رہی اور قوت و شوکت میں کوئی اس کا ہم پلہ نہ تھا۔ مسلمانوں نے اس آئین کی مدد سے دنیا میں ایک مثالی معاشرہ پیدا کیا جہاں خیر ہی خیر تھا جہاں کوئی کسی محتاج نہ تھا اور کمزور طاقت ور کے ظلم سے محفوظ تھے۔ جہاں خدا کا نائب بھی عام مسلمانوں کی سی زندگی بسر کرتا تھا اور اگر عوام کو کوئی چیز کھانے کو نہ ملے تو خود بھی نہ کھاتا تھا۔ جہاں ایک معمولی عورت بھرے جلسے میں خلیفہ کو ٹوک سکتی تھی اور خلیفہ بھی اپنی غلطی تسلیم کرنے میں عار محسوس نہ کرتا تھا جہاں خلیفہ اپنے آپ کو قوم کا حاکم نہیں بلکہ خادم سمجھتا تھا۔ جہاں کوئی بھیک مانگنے والا نظر نہ آتا تھا۔ مگر جب ملت اسلامیہ نے اس خدائی قانون سے منہ موڑ لیا تو ان کی قوت و حشمت جاتی رہی اور اب وہ دنیا کی قوموں میں کوئی مقام نہیں رکھتی اس وقت روم و ایران کی حکومتیں ان کے سامنے نہ ٹھہر سکیں اور آج روس و امریکہ آقا بنے پھرتے ہیں۔ اگر ہم اپنے ماضی کی طرف دیکھیں اور اس سے سبق حاصل کریں تو آج بھی بلند مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ قوموں کی خودی کی تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ماضی کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھیں اور حال کے آئینے میں مستقبل پر نظر رکھیں۔ اگر کوئی قوم اپنے ماضی سے رشتہ توڑ دیتی ہے تو اس کی ترقی ممکن نہیں۔ سالہا سال کے تجربات کی طرف سے آنکھ بند کر لینا بہت خطرناک ہوتا ہے۔ ماضی کے بغیر ہم ایک خلا میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ ماضی حال کی راہیں متعین کرتا ہے اور حال مستقبل کو جنم دیتا ہے۔ وہ مستقبل جو ہمارا مقصود نظر ہوتا ہے۔

رشتۂ ایام را آور بدست ... ورنہ گردی روزکور و شب پرست

سر زند از ماضی تو حال تو ... خیزد از حال تو استقبال تو

مشکن از خواہی حیات لازوال | رشتہ ماضی ز استقبال حال!
موج ادراک تسلسل زندگی ست | مے کشاں را شور قلقل زندگی است

ملت افراد سے بنتی ہے اور افراد کی تعلیم و تربیت کا انحصار ماؤں پر ہوتا ہے اگر وہ صحت مند بچے پیدا کریں اور ان کو توحید و رسالت کا پرستار بنا دیں تو قوم خود بخود ترقی کے منازل طے کرتی چلی جائے گی۔ اس لئے ملت کی تعمیر میں امومت کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ قوم کی دولت مال و زر نہیں بلکہ اس کے افراد ہوتے ہیں جو سخت کوش تر دماغ ہوں

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر | نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مال او فرزند ہائے تندرست | تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست
حافظ رمز اخوت ماوراں | قوت قرآن و ملت ماوراں

اور ماؤں کے لئے بہترین نمونہ حضرت فاطمہ کی ذات ہے اور اقبال چاہتے ہیں کہ عورتیں ان کی تقلید کریں اور بے پردہ اپنے جنسی اعضاء کی نمائش کرنے کی بجائے ان کی طرح پردے میں رہ کر کسی شبیر کی پرورش کریں۔ اقبال کو حضرت فاطمۃ الزہرا کے ساتھ اتنی عقیدت ہے کہ وہ ان کی تربت پر سجدوں کی بارش کر دیتے ہیں۔ اگر خدا اور رسول کا حکم ان کو روک نہ لیتا۔

مزرع تسلیم را حاصل بتول! | مادراں را اسوۂ کامل بتول!
بہر محتاجے دلش آں گونہ سوخت | بایہودے چادر خود را فروخت!
رشتہ آئین حق زنجیر پا است | پاس فرمان جناب مصطفےٰ است
ورنہ گرد تربتش گردیدمے | سجدہ ہا بر خاک او پاشیدمے

اقبال عورت کی آزادی کے قائل ہیں مگر اس آزادی کے نہیں جو یورپ نے اسے عطا کی

ہے۔ مرد اور عورت فرائض کے اعتبار سے یکساں اہمیت رکھتے تھے مگر دونوں کی جسمانی ساخت مختلف ہے اس لئے ان کے کاموں میں اختلاف پایا جاتا ہے اگر دونوں ایک جیسے کام کریں گے تو معاشرے کی تعمیر صحیح بنیادوں پر نہ ہو سکے گی۔ قرآن نے عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا لباس کہا ہے۔ کیونکہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ عورت جب مرد بننا چاہتی ہے یا مرد عورت تو معاشرے میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ یورپ میں عورتوں نے مردوں کے سے کام شروع کر دیئے ہیں۔ اس لئے وہاں کئی نفسیاتی اور معاشرتی الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک ماہر نفسیات[1] نے عورتوں کے اس رجحان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"میرے ایک شاگرد پروفیسر رہی سی امریکہ کے باشندے نے ایک تحقیق کی اور دوران تحقیق میں انھیں معلوم ہوا کہ جن لڑکیوں سے انھوں نے سوالات کئے ان میں سے ۴۲ فیصد نے یہ جواب دیا کہ وہ چاہتی ہیں کہ مرد ہو جائیں اور یہ کہ وہ اپنی جنس سے مایوس اور بے زار ہیں ایسی صورت میں جب کہ نوع انساں کا آدھا حصہ مایوس و شکستہ اور اپنی جنس سے ناراض ہو تو محبت اور شادی کے مسئلے آسانی سے کس طرح حل ہو سکتے ہیں۔"

انسانی معاشرے میں عورت کسی طرح بھی کم تر درجہ کی مالک نہیں ہے۔ اگر مرد کما کر لاتا ہے تو عورت خرچ کرنے کے مسائل کی نگران ہے۔ اگر عورت بھی کمانے چلی جائے تو گھر کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور بچوں کی نگہداشت تو بالکل ہی نہ ہو سکے گی۔ اگر بچوں کی پرورش کا کام ملازموں کے سپرد کر دیا جائے تو وہ ان کو کئی نفسیاتی الجھنوں کا شکار کر دیں گے۔

---

[1] ڈاکٹر اڈلر

بچے کی آئندہ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا بچپن ماں کی نگرانی میں گذرے کیوں کہ بچوں میں جو دلچسپی ماں لیتی ہے وہ کسی اور کو نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ عورت کا شمع محفل کی بجائے چراغ خانہ بننا بے حد ضروری ہے معاشرے میں اس کا مقام بیوی اور ماں کا مقام ہے۔ مشرق میں ماں کی اہمیت اس مقولے سے ظاہر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہے۔ اور مغرب میں اس کی اہمیت اس مقولے سے ظاہر کی گئی ہے کہ: The hand that rocks the cradle rules —— The world —— جھولا جھلانے والا ہاتھ ہی دنیا پر حکومت کرتا ہے۔

آنکہ نازش بر وجودش کائنات ! ذکر او فرمود باطیب وصلوٰة

گفت آں مقصود حرف کن فکاں زیر پائے امہات آمد جناں

اقبال نے اپنے ایک لیکچر میں کہا ہے کہ عورت کا کام نسل انسانی کی بقا ہے اور اسی کے مطابق اس کے تمام اجزا بنائے گئے ہیں۔ وہ عورت اور مرد کی مساوات کے ان معنوں میں قائل نہیں جو یورپ میں اس سے مراد لئے جا رہے ہیں۔

"میں عورت اور مرد کی مساوات کا مطلق حامی نہیں ہوں قدرت نے ان دونوں کو جدا جدا خدمتیں تفویض کیں اور ان فرائض جداگانہ کی صحیح اور باقاعدہ انجام دہی خانوادہ انسانی کی صحت اور فلاح کے لئے لازمی ہے مغربی دنیا میں جہاں نفسا نفسی کا ہنگامہ گرم ہے اور غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی۔ عورتوں کا آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے الٹا نقصان رساں ثابت ہوگا۔ اور نظام معاشرت میں اس سے بے حد پیچیدگیاں

پیدا ہو جائیں گی ... خاندانی وحدت کے رشتے کو جو بنی نوع انسان کی روحانی زندگی کا جزو اعظم ہے یہ حریت توڑ دیتی ہے۔"

اگر عورت اپنا نسوانی جوہر کھو دے تو اس سے بڑھ کر اور کوئی نقصان نہ ہوگا عورت کا اصل کام بچوں کی پرورش ہے اور یہ بھی بہت اہم اور مشکل کام ہے چنانچہ مغرب کے ماہرین نفسیات بھی اسی نتیجے پر پہونچے ہیں کہ امومت عورت کی بہت بڑی خدمت ہے۔ ممتاز ماہر نفسیات ڈاکٹر اڈلر لکھتے ہیں۔

"وہ عورت جو ماں بن کر نوع انسان کی بقا میں مدد کرتی ہے کام کی تقسیم میں سب سے زیادہ اور بلند تر حصہ لیتی ہے اگر کسی عورت کو اپنے بچوں سے دلچسپی ہو، وہ اچھے انسان بننے میں ان کی مدد کر رہی ہو تو یقین مانیے کہ وہ ایسی خدمت انجام دے رہی ہے کہ جس کا کوئی معاوضہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

چنانچہ عورت اور مرد کے فرائض علیحدہ علیحدہ ہونے کی وجہ سے ان کی خودی کی تربیت کا کام بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اقبال نے مرد کی خودی کا فلسفہ پیش کیا اور اسے کائنات کی تسخیر کا کام سونپا مگر عورت کو اس کا مستحق نہیں سمجھا۔ اقبال عورت کی امومت کو اتنا اہم خیال کرتا ہے کہ اس کے بغیر مرد مومن وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ خودی کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ عورت کی صلاحیتیں مرد سے مختلف ہیں۔ اس لئے عورت کی اثبات خودی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مخصوص صلاحیتوں کی نشو و نما کرے اور اقبال کے نزدیک اس کی سب سے بڑی صلاحیت امومت ہے اس کی خودی اس وقت بیدار ہوتی ہے۔ جب وہ امومت کے فرائض بہترین طریقے پر سر انجام دیتی ہے۔ اقبال کے نزدیک امومت کو نبوت سے خاص نسبت ہے۔ اس کی شفقت پیغمبر کی

شفقت ہے اور اس میں ملّت کی تقدیر پوشیدہ ہے۔

نیک اگر بینی امومت رحمت است | زانکہ او را با نبوت نسبت است
شفقت او شفقت پیغمبر است | سیرت اقوام را صورت گر است
از امومت پختہ تر تعمیر ما | در خط سیمای او تقدیر ما

گزشتہ اوراق میں ہم نے ان باتوں کا ذکر کیا ہے جو ملت کی خودی کو محکم کرنے کا باعث ہیں۔ جب ملت اپنی خودی کو آئین حق اور فرمان مصطفے کے زیر اثر تعمیر کر لیتی ہے تو وہ فرد کی طرح بلند ترین مقام کی حامل بن جاتی ہے۔ اور کائنات کی تسخیر کر کے عناصر پر حکمران ہو جاتی جس طرح فرد کی خودی کے حق میں بعض چیزیں مہلک ہیں اسی طرح ملت کی خودی کے لئے بعض اشیا خطرناک ہیں۔ ان میں سے ایک یاس یا نا امیدی ہے۔ یہ آرزو اور جستجو کی قاتل ہے۔ اور اُن کے بغیر انسان بے عمل ہو جاتا ہے۔

نا امید از آرزوئے پیہم است
نا امیدی زندگی را سم است

دوسری چیز جو خودی کے حق میں زہر ہے وہ خوف ہے۔ خوف بھی عمل کا قاتل ہے خوف زدہ شخص ہو یا قوم کوئی بھی عمل کی راہوں پر گامزن نہیں ہو سکتی۔ تسخیر کائنات کا کام آسان نہیں ہے۔ ہر قدم پر خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کے لئے بہادر انسانوں کی ضرورت ہے۔ خوف بزدلی کی نشانی ہے۔ ظاہر ہے کہ خوف سے مراد غیر اللہ کا خوف ہے۔ خدا کا خوف ہر خوف سے نجات دے دیتا ہے۔

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است
کاروان زندگی را رہزن است

غیر اللہ کا خوف نہ صرف عمل کا دشمن ہے بلکہ اس سے توحید بھی ختم ہو جاتی ہے کیونکہ یہ شرک کو جنم دیتا ہے اور اس طرح ملت کا مرکز غیر محسوس خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ خوف سے قوم میں مکاری اور جھوٹ پرورش پاتے ہیں اور اس کے افراد حق گوئی اور بے باکی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

ہر کہ رمز مصطفےٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اور ان سب سے خطرناک وطنیت کا نظریہ ہے جب قوم یا ملت کو وطن کی جغرافیائی حدود میں مقید کر دیا جاتا ہے تو نوع انسانی قبائل میں بٹ جاتی ہے اور انسان انسان کا اور قوم دوسری قوم کی دشمن بن جاتی ہے۔ میکیاولی نے "کتاب الملوک" میں بادشاہوں کو یہ نکتہ سمجھایا تھا کہ اس نظریے کو فروغ دے کر وہ نوع انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ سکتے ہیں۔ اقبال وطنیت کے اس لئے مخالف ہیں کہ اس سے آدمیت مجروح ہوتی ہے اور ایک قوم دوسری قوم کا خون بہا کر خوش ہوتی ہے۔ اگر انسان کو وطن کے ہتھکنڈوں سے نجات مل جائے اور وہ ایک عالمگیر برادری کا رکن بن جائے تو اس دنیا میں قتل و غارت کا بازار سرد پڑ جائے۔ یہاں کوئی ویتنام نہ رہے۔ اور نہ امریکہ اپنی برتری کے لئے جنگ کے شعلوں کو ہوا دے۔ اگر ہم اپنے آپ کو جغرافیائی حدود سے آزاد کر لیں تو ایک دوسرے سے نفرت کرنا چھوڑ دیں۔ اور ایٹم بم بنانے کی بجائے ایٹم سے اس دنیا کو جنت کا نمونہ بنا دیں۔ وطنیت کا جدید تصور اس دنیا کو دوزخ بنائے ہوئے ہے۔ اور ہر وقت یہ خطرہ موجود ہے کہ قوموں کی جنگ انسانیت کا خاتمہ نہ کر دے۔ چنانچہ اقبال نے اپنی شاعری میں وطن کے سیاسی تصور کے خلاف بڑے زور شور سے لکھا ہے۔

آں چناں قطع اخوت کردہ اند — بر وطن تعمیر ملت کردہ اند

تا وطن را شمع محفل ساختند — نوع انساں را قبائل ساختند
ایں شجر جنت ز عالم بردہ است — تلخی پیکار بار آوردہ است
مردمی اندر جہاں افسانہ شد — آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند — آدمیت گم شد و اقوام ماند

انسان کی فطرت میں بت پرستی ہے اور وہ ہر زمانے میں بتوں کو تلاش کرتا رہا ہے زمانہ جدید میں اس نے پوجنے کے لئے جو بت بنائے ہیں ان میں وطن رنگ و نسل اور نسب کے بت بہت بڑے ہیں۔ یہ بت اسے توحید اور خودی سے دور لے جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ تباہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔

فکر انساں بت پرستے بت گرے — ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرح آزری انداخت است — تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خوں ریختن اندر طرب — نام او رنگ است ہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند — پیش پائے ایں بت نا ارجمند

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اقبال تمام نوع انساں کو ایک کر دینا چاہتے ہیں اور ان کا پیغام انسانیت کے لئے ہے۔ تو پھر وہ اسلام قرآن اور ملت اسلامیہ کا ذکر کیوں کرتے ہیں۔ وہ قوموں کی خودی کو مستحکم کرنے کے لئے قرآن کا ذکر کر کے اسے مسلمانوں تک محدود کر دیتے ہیں۔ اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ ساری دنیا کے انسان ایک ہیں۔ کیونکہ وہ آدم کی اولاد ہیں اور ان کو ایک ہی رہنا چاہئے۔ مختلف قوموں میں تقسیم نہیں ہونا چاہئے۔[1] مگر یہ تضاد نہیں ہے کیونکہ اقبال کے نزدیک تمام انسان اگر کہیں اکٹھے ہو سکتے ہیں تو وہ اسلام کا پلیٹ فارم ہے۔ اور اگر کوئی ضابطہ زندگی تمام انسانیت کے لئے

۱؎ صفحہ ۱۴۴ پر دیکھئے

موزوں ترین ہو سکتا ہے تو وہ قرآن ہی میں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے ان خیالات کا اظہار اس لئے نہیں کیا کہ وہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے ہیں بلکہ انھوں نے تمام ادیان سے اسلام کا مقابلہ کر کے اسے بہتر پایا ہے۔

"میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوت اور طلب و جستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے۔ جس کا مقصد توحید ذات پات رنگ و نسل رتبہ و درجہ کے تمام امتیازات کو مٹا دینا چاہیئے" [1]

چنانچہ اقبال نے اپنے فلسفہ خودی اور بے خودی کی عمارت قرآنی اصولوں پر تعمیر کی ہے اور اسلام کے بے بہا خزانے سے موتی چن کر سجایا ہے کیونکہ تمام انسانیت کی بھلائی اسی میں ہے۔ اور کوئی نظام حیات ساری انسانیت کو ایک مرکز پر لانے کے قابل نہیں ہے۔ اسلام میں وہ وسیع النظری اور بلند اخلاقی ہے کہ اس سے ہر خطہ زمین کے لوگ وابستہ ہو سکتے اور ان کی عزت نفس کو ٹھیس نہیں لگتی۔ اسلام گورے کالے اور خاندانی اعتبار سے اونچ نیچ کا قائل نہیں۔ اسلام ساری دنیا کے انسانوں کو ترقی کے یکساں مواقع پیش کرتا ہے اور پھر ان کو اخوت اور محبت کی زنجیر میں باندھ کر ایک دوسرے کا رفیق بنا دیتا ہے۔

فٹ نوٹ ۱ صفحہ ۱۴۳ کا

نہ افغانیم و نے ترک تتاریم ۔۔۔ چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است ۔۔۔ کہ ما پروردہ یک نو بہاریم

[1] اقبال نامہ ص ۴۶

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا۔

"آج میں نے تمام تہذیبیں اپنے پاؤں تلے
کچل دی ہیں ——————"

اور صرف ایک تہذیب رہنے دی ہے جو انسانیت کو اعلیٰ مدارج پر پہنچا سکتی ہے یہ تہذیب جغرافیائی حدود میں مقید نہیں ہے۔ اور نہ رنگ و نسل کا امتیاز اس میں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی اور بے خودی کی ساری عمارت اسلامی تہذیب کی بنیاد پر استوار کی ہے۔

تصوّرِ عشق

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ!
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ!
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

عشق کا مطلب ہے کسی چیز کا حد سے شوق ہونا۔ عشق میں حد سے بڑھے ہوئے ہونے کا مطلب موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض صوفیوں نے خدا سے بندے کا عشق ناجائز قرار دیا ہے۔ البتہ بندے سے خدا کا عشق روا رکھا ہے مگر کچھ صوفیا ایسے بھی ہیں جو بندے سے خدا کا عشق بھی جائز نہیں سمجھتے لیکن بندے اور خدا کے درمیان محبت کو روا سمجھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں داتا گنج بخش[۱] کشف المحجوب[۲] میں لکھتے ہیں۔

---

[۱] اصل نام سید علی بن عثمان ہجویری ہے [۲] ترجمہ ابو نعیم عبدالحکیم خاں نشتر جالندھری ص ۴۹۴

"عشق کے باب میں مشائخ طریقت کے متعدد ارشادات ہیں ان میں سے ایک جماعت نے بندے کی جانب سے خدا کا عشق روا نہیں رکھا اور کہا ہے عشق اپنے محبوب سے باز رکھنے کی صفت ہے اور بندہ خدا کے ملنے سے منع کیا گیا ہے مگر خدا کو بندے کے ملنے سے منع نہیں کیا گیا پس بندے سے خدا کا عشق روا ہے اور خدا سے بندے کا عشق روا نہیں۔ ایک جماعت کہتی ہے بندے سے بھی خدا کا عشق نہیں کیونکہ عشق حد سے آگے بڑھ جاتا ہے اور خدا محدود نہیں ہے۔

" متاخرین صوفیا کا قول ہے کہ عشق دونوں جہاں میں ذات الٰہی کے طالب ادراک کے سوا درست نہیں اور ادراک اللہ تعالیٰ کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکتا لہٰذا اس سے محبت اور اخلاص تو درست ہے عشق درست نہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عشق دیدار کے سوا ممکن نہیں اور محبت سننے سے روا ہے۔ چونکہ عشق نگاہ سے ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا اطلاق خدا پر جائز نہیں کیونکہ دنیا میں کوئی شخص اسے دیکھ نہیں سکتا۔ چونکہ خدا کے متعلق یہ ایک خبر تھی کہ وہ ایسا ہے لہٰذا ہر ایک نے اس کا دعویٰ کیا کیونکہ خطاب میں تمام برابر ہیں پس خدا کی ذات ادراک کے قابل اور محسوس نہیں کہ اس سے مخلوق کا عشق درست ہو۔ چونکہ وہ افعال وصفات سے دلیوں پر احسان وکرم کرنے والا ہے لہٰذا اس کی محبت صفات سے درست ہے ... یہ بھی کہتے ہیں کہ عشق کی ضد نہیں۔ لہٰذا اس کا اطلاق خدا پر ہونا چاہیئے۔"

مگر اکثر اوقات اب عشق اور محبت ہم معنی استعمال ہوتے ہیں۔ لفظ عشق

قرآن میں موجود نہیں مگر محبت کا ذکر بار بار آیا ہے۔ محبت کا لفظ کس مادے سے نکلا ہے اور اس کے لغوی معنی کیا ہیں، ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ... حباب الماء سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں۔ انتہاہ پانی اس کا جوش شدید مینہہ کے وقت ہوتا ہے اور چونکہ محبت بھی خوشش دل کا ہے اور یہ بھی انتہاہ ہوتی ہے اس لئے اسے حب کا نام دیا گیا۔ بعض کی رائے ہے کہ حب ان چار لکڑیوں کا نام ہے جن کو جوڑ کر پانی کا لوٹا رکھتے ہیں۔ اور وہ اس کا بوجھ سہہ لیتی ہے۔ چونکہ محبت کرنے والا بھی محبوب کی دی ہوئی عزت و ذلت جفا و وفا اور شادی و غم کو برداشت کر لیتا ہے۔ اس لئے اس کیفیت کو حب کہا گیا۔ بعض کے نزدیک حب حبہ سے نکلا ہے اور حبہ سے مراد حبہ دل یا حبہ چشم ہے یعنی آنکھ اور دل کا سیاہ نقطہ۔ چونکہ محبت آنکھ یا دل ہی سے ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا نام حب رکھ دیا گیا۔ بعض کا قول ہے وہ حبہ دبکسر حا، سے نکلا ہے۔ حبہ ان بیجوں کو کہتے ہیں جو صحرائی زمین پر پڑتے ہیں اور زمین میں پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔ جب مینہہ برستا ہے اور سردی گرمی اسے پہونچتی ہے تو وہ اگ کر پودا بن جاتا ہے۔ اس بیج میں پودے کی زندگی محفوظ رہتی ہے۔ اور چونکہ حیات کی اصل محبت ہے اس لئے لوگوں نے اس کا نام حب رکھ دیا اور بعض کہتے ہیں کہ یہ حُب سے مشتق ہے۔ جس کا مطلب وہ گھڑا ہے جو پانی سے لبالب بھرا ہوا ہو اور گدلا ہو کہ نظر اس میں سے نہ گذر سکے۔ اور چونکہ محبت بھی جب اپنے کے دل کو بھر دیتی ہے تو اس میں محبوب کے سوا کسی اور کے لئے جگہ نہیں رہتی ہے۔ اس لئے اسے حب کہا گیا ہے بہر حال محبت ایک جذبہ ہے جو نفرت کے جذبہ کا ضد ہے یعنی جس سے محبت کی جائے اس کی خامیوں کی بجائے اس کی خوبیوں پر نظر رہے۔ محبت ایک طرح کی دلچسپی ہے

جو انسان کسی چیز کے اچھا معلوم ہونے کی وجہ سے اس میں لیتا ہے۔ امام غزالی نے محبت کی تعریف یوں کی ہے۔

"محبت اس رغبت کا نام ہے جو کسی چیز کی اس کے اچھا معلوم ہونے کی وجہ سے آدمی کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے یا خود آدمی اس طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہ رغبت اور دلچسپی محبت کے بعد زیادہ مستحکم ہوتے ہوتے عشق کے درجات اختیار کر لیتی ہے اسی طرح بری معلوم ہونے والی چیز سے نفرت ہوتی ہے۔"

حضرت بایزید بسطامی نے کہا ہے۔ کہ اپنے زیادہ کو کم اور دوست کے کم کو زیادہ سمجھا جائے۔ اور حضرت سہل بن عبداللہ تستری کہتے ہیں محبت یہ ہے کہ تو محبوب کی عبادت سے ہم آغوش اور اس کی مخالفت سے روگرداں ہو۔" علامہ اقبال نے محبت کے اجزاء کو ایک نظم میں بڑی خوبصورتی سے یوں بیان کیا ہے۔

عروس شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذت رم سے
قمر اپنے لباس نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئین مسلم سے
ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے ابھری ہی تھی دنیا
مذاق زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے
کمال نظم ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشم خاتم سے
سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیا گر تھا
صفا تھی جس کی خاک پا میں بڑھ کر ساغر جم سے
لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے اس کو چشم روح آدم سے
نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیا گر کی
وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسم اعظم سے
بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمنائے دلی آخر بر آئی سعی پیہم سے

پھرایا فکرِ اجزا نے اسے میدانِ امکاں میں — چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہِ حق کے محرم سے
چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغِ جگر مانگا — اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی! — حرارت لی نفس ہائے مسیح ابن مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی — ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں — مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے
مہوس نے یہ پانی ہستیِ نوخیز پر چھڑکا — گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے
ہوئی جنبش عیاں، ذروں نے لطفِ خواب کو چھوڑا — گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے

خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

محبت دو قسم کی ہوتی ہے ایک اپنی جنس کی محبت جنس سے اور دوسری جنس کی محبت غیر جنس سے ہوتی ہے۔ پہلی قسم میں جسم جسم سے مل جاتا ہے۔ اس کی تمام تڑپ اور جستجو اتصال کے لئے ہوتی ہے۔ اور یہ اتصال ممکن بھی ہوتا ہے مگر دوسری قسم میں اتصال یا ملنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے فراق کی حالت رہتی ہے۔ مرد کی عورت سے محبت پہلی قسم کی ہے۔ اور انسان کی خدا سے دوسری قسم میں شامل ہے بعض صوفیانے اپنا محبوب عورت کی بجائے مرد کو قرار دیا تاکہ جنسی محبت میں بھی وصال ممکن نہ ہو۔ اور ہمیشہ فراق کی حالت قائم رہے۔ چنانچہ فارسی اور اردو شاعری میں محبوب خواہ مجازی ہو یا حقیقی۔ وہ ظالم یا جفا کار ہی ہوتا ہے۔ اور وہ عاشق سے کبھی نہیں ملتا۔ مولانا عبد السلام ندوی لکھتے ہیں کہ فارسی اور اردو شاعری میں عاشق کے ذلیل و خوار ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں عشق کا تصور فلسفۂ اشراق کے زیر اثر رائج ہوا۔ وہ اقبال کامل میں لکھتے ہیں۔

علت میں قوت، غلبہ، اقتدار اور عز و شرف پایا جاتا ہے اور اسی نسبت سے معلول میں عجز و اطاعت اور ذلت و مسکنت پائی جاتی ہے۔ اور چونکہ علت معشوق اور معلول عاشق ہوتا ہے۔ اس لئے معشوق زیادہ معزز، صاحب اقتدار اور بلند رتبہ ہوتا ہے اس کے برعکس عاشق میں عجز، فروتنی اور پستی پائی جاتی ہے۔ اس لئے ایرانی شاعری سے زیادہ کسی شاعری نے عاشق کو ذلیل نہیں کیا اور یہ اسی فلسفہ اشراق کا اثر ہے۔

اور فلسفہ اشراق کیا ہے؟ شیخ الاشراق حکمۃ الاشراق میں رقمطراز ہیں:

"ہر بلند نور کو نیچے کے نور پر غلبہ اور اقتدار حاصل ہے! ور نیچے کا نور بلند نور سے محبت رکھتا ہے اور اسی قہر و مہر سے نظام عالم کا وجود وابستہ ہے! در جب بہت سے انوار جمع ہو جاتے ہیں تو بلند نور نیچے کے نور پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور نیچے کے نور کو اوپر کے نور کا شوق اور عشق ہو جاتا ہے۔ اس لئے نور الانوار (یعنی خدا) کو اپنے ما سوا تمام موجودات پر غلبہ حاصل ہے اور وہ اپنی ذات کے سوا کسی کا عشق نہیں کرتا[1] کیونکہ ہر چیز سے زیادہ خوبصورت اور مکمل ہے اور اس کو خود اپنا کمال نظر آتا ہے۔ اس لئے وہ عاشق بھی ہے[2]

---

[1] مگر قرآن حکیم میں ہے کہ خدا اپنے نیک بندوں سے محبت کرتا ہے کیونکہ وہ بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ "سو خدا ایک ایسی نیک قوم پیدا کرے گا جس سے وہ خود محبت کرے گا اور وہ لوگ بھی اس سے محبت کریں گے۔"

[2] عشق معشوق، عشق عاشق ہے یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق.
(میر تقی میر)

اور چونکہ خدا سے زیادہ کوئی چیز حسین اور مکمل نہیں اس لئے کسی چیز کو بھی دوسری چیز کے عشق میں وہ لطف حاصل نہیں ہوتا ہے غرض نظام عالم کا وجود قہر اور مہر سے قائم ہے اور انوار مجرد کی کثرت فنا ہوتی ہے جس قدر ان میں علّت و معلول کا سلسلہ بڑھتا ہے اسی قدر نظام عالم مکمل ہوتا ہے۔

چنانچہ فارسی شاعری میں اور اس کی تقلید میں اردو شاعری میں عاشق پست ترین مقام پر نظر آتا ہے۔ وہ دربدر مارا مارا پھرتا ہے۔ آہیں بھرتا ہے نالے کرتا ہے گریبان چاک کر کے صحرا کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ ذلالت کی یہ انتہا ہے کہ کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل جاتا ہے۔ محبوب کی گلی میں جاتا ہے تو نکال دیا جاتا ہے۔ اگر محبوب کے دروازے پر پہونچ جائے تو دربان سے گالیاں کھا کر واپس آتا ہے۔ اور اگر کسی طرح محبوب کی محفل میں بار پا بھی جائے تو وہاں سے جلد ہی نکال دیا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ عشق اسے بے موت مار دیتا ہے اور بالآخر عشق کے مصائب سے تنگ آکر عاشق پکار اٹھتا ہے۔

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

اور کبھی اسے دماغ کا خلل قرار دیتا ہے۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا (غالب)

اور خواجہ میر درد جیسا صوفی بھی چلا اٹھتا ہے۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

عشق حقیقی کا مقصود اگرچہ خدا کی ذات تھی اور یہ مقصد بڑا بلند ہے مگر اس کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے اپنے وجود کے سنگ گراں کو راہ سے ہٹایا جائے۔ خود کو مٹا کر ہی انسان خدا سے مل سکتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں۔[1]

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے مٹا، وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردہ میں اب نہ وہ پردہ نشین کوئی دوسرا اسکے سوا نہ رہا

اس لئے جسم کو طرح طرح کی تکالیف پہنچانا ضروری ٹھہرا اور عاشق کمزور، لاغر اور ناتواں بن گیا جو اس زندگی کو طوفان سمجھنے لگا۔ اور ہجوم یاس سے گھبرانے لگا۔ عاشق کی اس ناتوانی نے اس کے ہاں مسکنت اور فروتنی پیدا کی۔ چنانچہ آہ، نالہ، فریاد، آرزو جستجو، صحرانوردی، سخت کوشی جو عشق کے لوازمات ہیں، وہ عاشق کے لئے اذیت اور تکلیف کا باعث ٹھہرے اور وہ مایوسی کے اتھاہ اندھیروں میں کھو گیا۔ ان تکالیف کی وجہ سے عاشق وقت سے پہلے ہی اس دنیا سے سدھار جاتا ہے۔

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

اور

قیس فرہاد اور وامق عاقبت جی سے گئے　　سب کو مارا عشق نے مجھ خانماں ویران سمیت (میر)

مگر اقبال کے ہاں عشق موت کا باعث نہیں ہے بلکہ زندگی کی علامت ہے ہم اُن

---

[1] اور غالب کا شعر ہے: ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں ؛ ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

کی نظم "محبت" پہلے نقل کر چکے ہیں۔ اس میں انھوں نے عشق کو زندگی کے باعث قرار دیا ہے وہ شروع ہی سے اس بات کے قائل رہے ہیں کہ عشق موت کو نہیں لاتا بلکہ زندگی کا پیغامبر ہے بانگ درا کی ایک نظم "عشق اور موت" میں انھوں نے ایک تمثیل کے ذریعہ یہ بات واضح کی ہے کہ عشق کو موت نہیں آتی بلکہ موت اسے دیکھ کر خود مر جاتی ہے۔ موت کے فرشتے اور عشق کے فرشتے کی ملاقات ہوتی ہے۔ عشق کا فرشتہ موت کے فرشتے کی ملاقات ہوتی ہے۔ عشق کا فرشتہ موت کے فرشتے کی گفتگو سن کر مسکراتا ہے تو یہ برق تبسم موت کو فنا کر دیتی ہے

سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی   ہنسی اس کے لب پر ہوئی آشکارا
گری اس تبسم کی بجلی اجل پر   اندھیرے کا ہو نور میں کیا گذارا

بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ
قضا تھی شکار قضا ہو گئی وہ

اور چونکہ عشق فنا کا نہیں بلکہ بقا کا ضامن ہے۔ اس لئے عشق سے جو کام فروغ پذیر ہو وہ بھی موت کی حدود سے نکل کر لافانی ہو جاتا ہے۔ مرد مومن کا ہر کام عشق کا رہین منت ہوتا ہے اس لئے زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

اور مسجد قرطبہ بھی عشق کی بدولت وجود میں آئی اس لئے وہ بھی لافانی بن گئی۔

اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام اس میں نہیں رفت و بود

چونکہ اقبال کے ہاں عشق بے موت نہیں مارتا ہے بلکہ لافانی بنا دیتا ہے اس لئے

وہ عشق کے لوازمات سے بھی محبت کرتے ہیں۔ اوران کو تکالیف و مصائب کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتے۔ آرزو عشق کی بنیاد ہے۔ یہ ایک ایسی چنگاری ہے جو شعلہ بن کر عشق کہلاتی ہے اس لئے اس کا چراغ دل میں روشن رہنا چاہئے جب سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں تو یہ تمنا ہی ہے جو راہ محبت میں عاشق کے ساتھ رہتی ہے۔

راہ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق
ساتھ میرے رہ گئی ایک مری آرزو

زندگی کی پائندگی کے لئے آرزو آب حیات ہے فانی کے ہاں آرزوئیں دم توڑ جاتی ہیں اس لئے وہ موت کا شاعر بن گیا۔ وہ منزل عشق پہ پہونچتا ہے تو تمام تمنائیں تھک تھک کر ساتھ چھوڑ جاتی ہیں۔

منزل عشق پہ تنہا پہونچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

آرزو کی موت سے حسرت پیدا ہوتی ہے اور اقبال کے ہاں حسرت کا کوئی کام نہیں ہے۔ غالب جیسے شاعر کے گھر میں حسرت تعمیر کے سوا کچھ نہیں اور وہ عشق کی غارت گری سے شرمندہ نظر آتا ہے:

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

اور کبھی تو ان کی ناامیدی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ دامان خیال یار ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے:

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

شاعروں میں حالی قوم کو جگانے کا عزم لے کر اٹھے تھے مگر وہ بھی روایت سے مسحور رہے اور ان کی غزلوں میں بھی روایتی عشق کی پیدا کردہ مایوسی موجود رہی:

کھو دیا یاس نے ذوق خلش فکر وصال
اک مزا تھا سو وہ اب کاوش پنہاں میں نہیں

اقبال کے ہاں آرزو سے انسان کے خون میں گرمی پیدا ہوتی ہے اور اسی سے زندگی کا چراغ روشن رہتا ہے۔ یہ افعال کی شیرازہ بندی کرتی ہے اور مقاصد پر کمند ڈال کر ان کا شکار کھیلتی ہے۔

گرم خوں انساں ز داغ آرزو — آتش ایں خاک از چراغ آرزو
از تمنا مے بہ جام آمد حیات — گرم خیز و تیز گام آمد حیات
زندگی مضمون تسخیر است و بس — آرزو افسون تسخیر است و بس
زندگی صید افگن و دام آرزو — حسن را از عشق پیغام آرزو

از تمنا رقص دل در سینہ ہا — سینہ ہا از تاب او آئینہ ہا
دل ز سوز آرزو گیرد حیات — غیر حق میرد چو او گیرد حیات
آرزو صید مقاصد را کمند — دفتر افعال را شیرازہ بند
زندہ را نفی تمنا مردہ کرد — شعلہ را نقصان سوز افسردہ کرد

دوسری چیز جو عشق کا لازمہ ہے وہ آہ، نالہ اور فریاد ہے ان کی وجہ سے بھی پرانے شعرا بہت تنگ ہوئے ہیں کیونکہ آہیں بھرنے، نالے کرنے اور فریادیں کرنے کے باوجود محبوب نہیں ملتا اور یہ تمام ان کے لئے مصیبت بن جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کا دل بیٹھنے لگتا ہے اور

رات کا گزارنا محال ہو جاتا ہے۔ میر صاحب کہتے ہیں۔

تھی صعب عاشقی کی بدایت ہی میر پر | کیا جانئے کہ حال نہایت کو کیا ہوا
جی ڈھا جائے ہے سحر سے آہ | رات گزرے گی کس خرابی سے

اور میر درد فرماتے ہیں:

نالہ، فریاد، آہ اور زاری | آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی | ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا
درد کا حال کچھ نہ پوچھو تم | وہی رونا ہے نت وہی غم ہے

مگر اقبال کے نزدیک ان کی بڑی اہمیت ہے اور ان کے بغیر عاشقوں کا دل مر جاتا ہے۔ اس لئے وہ بہشت جاوداں کو پسند نہیں کرتے کہ وہاں یہ نہ ہونگے۔

دل عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے
نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

اور وہ لامکاں بھی نہیں چاہتے کیونکہ وہاں نالۂ نیم شبی نہیں ہے۔

ازاں از لامکاں گریختم من
کہ آں جا نالہ ہائے نیم شب نیست

اب آہ سحر گاہی کی اہمیت دیکھئے

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو | کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی
گنوا نہ ہاتھ سے تو اگر یہ سحر گاہی | اسی سے ہے تیرے نخل کہن کی شادابی

غزالی وگرچہ آہ کو کمتر درجہ کا مقام دیتا ہے مگر اقبال کے نزدیک آہ جگر گداز

گرچہ متاعِ عشق عقل بہائے کم نہد
من ندہم بہ تختِ جم آہِ جگر گداز را

غرضیکہ عشق کی پختگی بے اثر نالوں اور آہوں میں ہے۔

گر نہ بوالہوسی باتو نکتہ گویم
کہ عشق پختہ تر از نالہ ہائے بے اثر است

چونکہ وصل میں آہ نالہ اور فریاد کا خاتمہ ہو جاتا ہے اس لئے علامہ کے نزدیک اس سے عشق کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ وہ وصل کی بجائے فراق کے طلب گار ہیں۔ فراق ہم کو عمل پر ابھارتا ہے۔ اور آگے بڑھنے پر اکساتا رہتا ہے اس کے برعکس وصل کی علامت ہے اور آرزو کا قاتل۔ اقبال سکون کے نہیں حرکت و عمل کے شاعر ہیں۔ اس لئے فراق کو پسند کرتے ہیں[۱]

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب[۲]

گرمیٔ آرزو فراق شورشِ ہائے ہو فراق موت کی جستجو فراق، قطرہ کی آبرو فراق

[۱] اقبال قطرہ کا سمندر سے وصل پسند نہیں کرتے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "فلسفۂ خودی"

[۲] اس سلسلے میں غالب کا ایک دلچسپ شعر ہے۔ غالب کے نزدیک وصل میں بھی آرزو اور شوق برقرار رہتے ہیں۔ اس کے لئے وہ بڑی خوبصورت شاعرانہ بدیل پیش کرتے ہیں۔

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال + موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں | ناصبوری ہے زندگی دل کی.
جان مارا ساز کار آید فراق | آتش مارا بیفزائد فراق
باید آتش در تہ پا زیستن | بے خلشہا زیستن نا زیستن!

عشق کا ایک اور لازمہ سوز اور جلن ہے۔ عشق سے دل اور سینہ جلتے ہیں اور غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ غم اور سوز عشق کی پیداوار ہیں ان کی وجہ سے قدبار کے یہاں دیدہ و دل عذاب بن جاتے ہیں۔ ذیل کے اشعار سے اس تکلیف کا احساس ہو جاتا ہے اسی لئے عشق پسندیدہ چیز نہیں ہے۔ مگر چونکہ یہ وہ آگ ہے جو لگائے نہیں لگتی۔ اور بجھائے نہیں بجھتی اس لئے لوگ بے اختیار ہیں۔ ان کے لئے دل ایک بلا ہے جو ساری دنیا کے لئے مصیبت کا باعث ہے۔

دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں (میرؔ) | ایک سب آگ ایک سب پانی
اب کے شرط وفا بجا لایا! (میرؔ) | بارہا گور دل جھنکا لایا
سارے عالم کے سر بلا لایا! (میرؔ) | دل کہ اک قطرۂ خوں نہیں ہے بیش

کئی دن سلوک وداغ کا مرے در پئے دلِ زار تھا
کبھی درد تھا، کبھو داغ تھا کبھو زخم تھا کبھو وار تھا (میرؔ)

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا (غالبؔ)

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی یہ حالت کہ دم لینے سی گھبرا جائیے (غالبؔ)

یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا (میرؔ) | دل کی بربادی کا کیا مذکور ہے

اسی میں ہے خیر حضرت دل کی کہ یار بھولا ہوا ہے ہم کو
کرے وہ یاد اس کی بھول کر بھی تمنا نہ کیجیے گا (حالیؔ)

دل خستہ جو لہو ہو گیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھو سوز سینہ سے داغ تھا، کبھو درد و غم سے فگار تھا (میرؔ)

آپ تو تھیں ہی یہ اس کا بھی کیا خانہ خراب
درد اپنے ساتھ آنکھیں یہاں کو بھی لے ڈوبیاں (دردؔ)

پھٹو اسا ساری رات جو ٹپکتا رہے گا یہ دل تو صبح تک تو پھڑ لگایا نہ جائے گا! (میرؔ)

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا بس ہجوم یاس سے جی گھبرا گیا (دردؔ)

مگر اقبال کے نزدیک سوز نا تمام کا نام ہی زندگی ہے - اور یہاں ہر ایک کوشش نا تمام سے ہی زندہ ہے اس لئے سوز اور غم جو کوشش نا تمام اور عشق کا لازمہ ہیں اقبال کے نزدیک پسندیدہ ہیں - وہ خوش ہیں کہ عاشقوں کو سوز دوام بخشا گیا ہے اور آزار آرزو کا کوئی علاج پیدا نہیں کیا گیا -

شادم کہ عاشقاں را سوز دوام دادی!
درماں نیافریدی آزار جستجو را!

وہ اپنے خطوط میں ایک انگریز مصنف کا یہ قول دہراتے ہیں کہ
"دکھ دیوتاؤں کی ایک رحمت عظیم ہے تاکہ انسان زندگی کے ہر پہلو کا مشاہدہ کر سکے [1]"

چنانچہ اقبال نے دکھ اور غم کی اہمیت کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے ان کے نزدیک

---

[1] اقبال نامہ صفحہ ۹۵

دل ناشاد ایک بہت بڑی دولت ہے۔ بلکہ دل سوز اور تپش سے ہی دل بنتا ہے اس کے بغیر وہ مٹی کا ڈھیر ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں اور یہ مردہ دل عشق کے کسی کام کا نہیں۔

مری نوائے غم آلود ہے متاع عزیز — جہاں میں عام نہیں دولت دل ناشاد

چہ پرسی میان سینہ دل چیست — خرد چوں سوز پیدا کرد دل شد

دل از ذوق تپش دل بود لیکن — چو یک دم از تپش افتاد گل شد

نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے — کہ شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں

مگر ان کا عشق چونکہ پاکیزہ ہے اس لئے ان کا غم بھی دوسروں سے مختلف ہے۔ یہ غم افکار بلند سے پیدا ہوتا ہے۔

ازاں غم ہا دل من دردمند است — کہ اصل او ازیں خاک نژند است

من و تو زاں غم شیریں ندانیم — کہ اصل او ز افکار بلند است

اور یہ غم در حقیقت دین کا غم ہے کیونکہ ان کا عشق خدا اور رسول کا عشق ہے چنانچہ وہ چاہتے ہیں کہ ایسا نالۂ گرم ملے جو دین کے غم کے علاوہ ہر غم کو جلا کر خاک کر دے۔

بدہ آن نالہ گرمے کہ از وے

بسوزم جز غمے دیں ہر غمے را

عشق کی آماجگاہ چونکہ دل ہے اس لئے اقبال کے نزدیک یہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ان کے نزدیک عذاب نہیں ہے اور وہ اس سے بےزار نہیں ہوتے۔ اس کے بجائے وہ اس کی شان میں ترانے گاتے ہیں۔ اور اسے زندگی کا حاصل قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ یاد رہے کہ ہر دل ان کی مدح کا مستحق نہیں ہے وہ اسی دل کی تعریف کرتے ہیں جو عشق کا حامل ہو اور سوز و تپش سے اس نے زندگی حاصل کی ہو۔

خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے | وہ اثر رکھتی ہے خاکستر پروانۂ دل
عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے | برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید | آزاد کا دل زندہ و پر سوز و طرب ناک
آزاد کی دولت دل روشن نفس گرم | محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک

دل من! اے دل من اے دل من | یم من، کشتی من، ساحل من!
چو شبنم بر سر خاکم چکیدی؟ | دیا چوں غنچہ رستی از گل من

بیارے عشق ما، اے رہزن دل ما، | بیارے کشت ما اے حاصل ما،
کہن گشتند ایں خاکی نہاداں | دگر آدم بنا کن از گل ما!

چساں زاید تمنا در دل ما! | چساں سوزد چراغ منزل ما؟
بچشم ما کہ می بیند؟ چہ بیند؟ | چساں گنجید دل اندر گل ما!

دل درد و غم سے مرتا نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ موت صرف جسم کو آتی ہے، دل پر موت حرام ہے۔

مخور اے کم نظر اندیشہ مرگ
دمے رفت، دل باقیست غم نیست۔[1]

اس تمام بے تابی اور سوز کے باوجود دل عشق کو پسند کرتا ہے اور اس سے آرام حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ اقبال کے ہاں عشق تڑپ اور سوز کے ساتھ ساتھ نشاط کی کیفیت بھی ہے۔ "پیام مشرق" میں وہ "عشق" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

---

[1] یوں معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے روح اور دل کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک جسم تو فنا ہو جاتا ہے مگر جان یا روح ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ دیکھئے "فلسفہ خودی"

این حرف نشاط آوری گویم دمی رقصم | از عشق دل آساید با این همہ بے تابی
ہر معنیٔ پیچیدہ در حرف نمی گنجد | یک لحظہ بدل در شو شاید کہ تو دریابی

جب دل میں عشق جاگزیں ہو جاتا ہے۔ تو اسے باقی ساری دنیا سے بے نیاز کر دیتا ہے پھر دل کو کائنات کی تمام چیزوں سے زیادہ رونے اور جلنے میں راحت ملتی ہے اور وہ دنیا کی ملامت کی کوئی پرواہ نہیں کرتا، اسے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی لگن رہتی ہے۔

جز عشق حکایتے نہ دارم | پروائے ملامتے نہ دارم
از جلوہ، علم بے نیازم | سوزم، گریم، تپم، گدازم

چنانچہ عشق سخت کوشی کو پسند کرتا ہے اور آرام و سکون سے بھاگتا ہے عاشقوں کے صحرا میں جانے اور شہروں کو ترک کرنے کا یہی راز ہے۔ شہر کی زندگی ایک تو آرام و سکوں کی زندگی ہے۔ دوسرے یہ فطرت سے دور ہے یہاں تصنع ہے بناوٹ ہے ہر چیز حتیٰ کہ انسانوں کا میل جول بھی فطری نہیں اس لئے عشق کو شہر کا شور و غوغا پسند نہیں اس کا شعلہ یہاں مر جاتا ہے۔

عشق شور انگیز بے پروائے شہر | شعلہ میرد ز غوغائے شہر
خلوتے جوید بہ دشت و کوہسار | یا لب دریائے ناپیدا کنار

عشق آزاد ہے اور پابندیوں کو پسند نہیں کرتا۔ عشق پر کوئی بھی ملکیت کا دعوی نہیں کرسکتا۔ وہ ہر ملک میں اور ہر جگہ پایا جاتا ہے۔

سر عشق از عالم ارحام نیست | او ز سام و حام و روم و شام نیست
شہید محبت نہ کافر نہ غازی | محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی

بلکہ اقبال کے نزدیک ہر چیز میں جو گرمی اور رفتار پائی جاتی ہے وہ عشق کی بدولت

ہی ہے۔ چاند ستاروں کی چمک اور سبزے کا اگنا عشق کی وجہ سے ہے۔ مچھلی کا سمندر کی لہروں کو چیر کر گزر جانا بھی عشق ہے اور بجلی کا تڑپنا بھی عشق ہے۔ انسان کا اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنا بھی عشق ہے۔ اور اس کا کسی حسین چہرے کی یاد میں آہیں بھرنا بھی عشق ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی قربانی بھی عشق ہے اور بدر و حنین کی لڑائیاں بھی عشق ہیں۔ خدا کا کلام بھی عشق ہے اور اس کا رسول بھی عشق ہے۔ غرض ہر جگہ عشق کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ مگر وہ عشق کے ان تمام مدارج میں فرق پیدا کرتے ہیں۔ اگرچہ عشق ہر جگہ اچھائی کی علامت ہے مگر مقصد کے اعتبار سے اس کی قوت میں فرق پڑ جاتا ہے ان کے نزدیک مجنوں، فرہاد اور دوسرے عاشقوں کا عشق بھی اپنے اندر قوت رکھتا ہے مگر یہ اقبال کے مخصوص تصور عشق کے سامنے کم تر درجہ کا مالک ہے اگر فرہاد نے تیشہ کی مدد سے پہاڑ کاٹ لیا تو بھی تعجب کی کیا بات ہے۔ کیونکہ عشق میں تو اتنی قوت ہے کہ وہ سارے سلسلہ کوہ کو ہی اٹھا کر لے جائے۔

تیشہ اگر بہ سنگ زد ایں چہ مقام گفتگوست
عشق بہ دوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را

وہ اپنی محنت اور عمل کو فرہاد سے نسبت دینا پسند نہیں کرتے۔

گلہ ہے مجھ کو زمانے کی کور ذوقی سے
سمجھتا ہے مری محنت کو محنت فرہاد

درحقیقت وہ عورت کے عشق کو بہت کم درجہ دیتے ہیں اور جب عشق مجنوں اور فرہاد کا سا بھی نہ رہنے اور ہوس کا مقام حاصل کرلے تو بہت بری چیز ہے چنانچہ وہ ہندوستان کے فنکاروں کی اس لئے مذمت کرتے ہیں کہ ان کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

یہ درست ہے کہ عورتوں سے عشق بھی عشق ہی ہے مگر یہ عشق کی بڑی ابتدائی شکل ہے۔ اس ابتدائی عشق کی اعلیٰ ترین شکل فرہاد اور مجنوں کے ہاں نظر آتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ محبوبوں سے عشق کرنا تو صرف ابتدا ہے۔ اس کی انتہا یہ نہیں کہ انسان ان بتوں کے سامنے ہی سجدہ ریز رہے بلکہ عشق کی انتہا یہ ہے کہ ان سے آزاد ہو جائے۔ کیونکہ عشق ایک جگہ رک جانے کا نام نہیں ہے بلکہ آگے بڑھتے رہنے کا نام ہے۔ یہ ابن السبیل ہے اور اس کے ہزاروں مقام ہیں۔ عشق کا مذہب ترک مقام ہے۔ ایک جگہ رک جانا دین عشق میں کفر ہے۔

ابتدا پیش بتاں افتادگی   انتہا از دلبراں آزادگی!

عشق بے پروا و ہر دم در رحیل   در مکان و لامکاں ابن السبیل

کیش ما مانند موج تیز گام   اختیار جادہ و ترک مقام

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے مقاصد آفرینی عشق کا کام قرار دیا ہے۔ جب وہ ایک مقصد حاصل کر لیتا ہے تو دوسرے مقصد کے حصول کو اپنی منزل قرار دیتا ہے چنانچہ مقاصد اقبال کے ہاں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

زندگانی را بقا از مدعا ست   زندگانی را درا از مدعاست

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم!   از شعاع آرزو تابندہ ایم

چنانچہ تخلیق مقاصد کے ذریعے عشق آگے بڑھتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ اس عالم رنگ و بو سے آگے بڑھ کر ستاروں پر کمندیں ڈالنے لگتا ہے اور پھر ان سے آگے بڑھنے کا ارادہ باندھتا ہے۔ اس دوران میں اسے ناکامیوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے مگر وہ

ان کی پروا نہیں کرتا۔ کیونکہ اسے پتہ ہے کہ اس کام کا اتنا لمبا اور اتنا مشکل ہے کہ اس کی راہ میں مقامات آہ و فغاں آتے ہی رہیں گے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں | ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر | چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا | کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم | مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

یہیں سے ان کا مخصوص تصور عشق ابھرتا ہے ان کے خیال میں عشق کا بلند ترین مقام اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب عشق کا مقصد ارفع اور اعلیٰ ہو اور سب سے اعلیٰ اور بلند مقصد انسانیت کی خدمت ہے جو تسخیر کائنات کا فریضہ ادا کرکے سرانجام دی جا سکتی ہے اور چونکہ انسانیت کی بہترین خدمت اسلام سکھاتا ہے اس لئے اقبال کا عشق دین کا عشق ہے کبھی وہ خدا سے عشق کرتے ہیں تو کبھی رسول اکرم کی ذات سے اور رسول اور دین سے عشق بھی درحقیقت خدا ہی کا عشق ہے کیونکہ وہ انسان کو معرفت الٰہی کا طریقہ بتاتے ہیں۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

چنانچہ وہ اپنے بیٹے جاوید کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتے ہیں کہ جاوید ان کے عشق سے سرشار ہو۔

ہمیں یک آرزو دارم کہ جاوید
ز عشق تو بگیرد رنگ و بوئے

مسلمانوں کی ذلت کا باعث بھی یہ ہے کہ انھوں نے رسول اکرم سے عشق ترک کر

دیا ہے۔

شبے پیش خدا بگریستم زار ۔ مسلماناں چرا زار ند و خوار ند

ندا آمد نمی دانی کہ این قوم دلے دارند و محبوبے نہ دارند

اور

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

چنانچہ انھوں نے خودی کی تعمیر اور استحکام کا سب سے بڑا ذریعہ عشق ہی کو قرار دیا ہے اور بعض اوقات تو وہ عشق کو اس قدر اہمیت دینے لگتے ہیں کہ خودی عشق کا مترادف نظر آنے لگتا ہے۔ دراصل عشق کا جوہر ہی خودی ہے اور اس کے بغیر خودی کی ترقی ناممکن ہے پرانے شاعروں اور صوفیا کا عشق نیازمندی اور مسکنت سکھاتا ہے مگر اقبال کا عشق ہر چیز پر چھا جاتا ہے۔ اور "یزداں بکمند آور" کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ اس کی زد میں ساری خدائی ہے۔ عشق اصل حیات ہے اور موت اس پر حرام ہے جن قوموں نے کتاب عشق سے سبق پڑھا اور اسے یاد رکھا وہ زندۂ جاوید ہو گئیں۔ ذیل کے اشعار میں عشق کی قوت اور اس کی وسعت کا اندازہ لگایئے۔

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام

عشق فقیہہ حرم، عشق امیر جنود عشق ہے ابن السبیل اسکے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات

عشق ہے نورِ حیات عشق ہے نارِ حیات

صدق خلیل بھی عشق، صبر حسین بھی ہے عشق ۔۔۔ معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

کبھی تنہائی کوہ دمن عشق ۔۔۔ کبھی سوز و سرور انجمن عشق

کبھی سرمایۂ محراب و منبر ۔۔۔ کبھی مولا علیؓ خیبر شکن عشق

آہستہ آہستہ اقبال کی عشق سے شیفتگی بڑھتی گئی اور پھر انھیں عشق سے عشق ہو گیا۔ عشق ان کے ہاں محبوب بن گیا۔ اور وہ اس کی اداؤں کا ذکر لطف لے لے کر کرنے لگے اور ہر جگہ انھیں عشق کے جلوے نظر آنے لگے! ور وہ اس محبوب کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگے انھوں نے عشق کی صفات کو اپنا موضوع بنایا جیسا کہ دوسرے شاعروں نے محبوب کی صفات بیان کی تھیں۔

کبھی آوارۂ بے خانماں عشق ۔۔۔ کبھی شاہ شہاں نوشیرواں عشق

کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش ۔۔۔ کبھی عریاں و بے تیغ و سناں عشق

بیا رے عشق، اے رمز دل ما ۔۔۔ بیا اے کشتِ ما اے حاصلِ ما

کہن گشتند ایں خاکی نہاداں ۔۔۔ دگر آدم بنا کن از گل ما!

اب انھیں عشق کے بغیر ہر چیز نامکمل نظر آنے لگی ہے۔ ایمان اور بے ایمانی، کفر اور اسلام کا فرق بھی عشق بن گیا۔ اگر عشق ہو تو کفر مسلمان ہو جاتا ہے! ور عشق نہ ہو تو مسلمان کافر زندیق بن جاتا ہے۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی! ۔۔۔ نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

اقبال کے عشق میں حرکت اور توانائی پائی جاتی ہے ان کا عاشق دنیا پر حکومت کرتا ہے اور ستاروں پر کمندیں ڈالتا ہے وہ ایک جگہ بیٹھ کر نالہ و فریاد نہیں کرتا رہتا بلکہ اس کی آہیں اور

نالے ان مشکلات سے پیدا ہوتے ہیں جو اس کے مقصود کے راستے میں حاصل ہیں مگر وہ ہر دم ان مشکلات پر قابو پانے کی ترکیب سوچتا رہتا ہے۔ سر زیر بار منت درباں کئے ہوئے نہیں پڑا رہتا۔ اس کے برعکس ان سے پہلے کے عشق میں کمزوری اور لاغری ہے۔ عاشق ہجر کے مصائب سہہ سہہ کر اس قدر کمزور پڑ جاتا ہے کہ موت بھی اسے پہچان نہیں سکتی۔ وہ چاہتا ہے کہ بیکار محبوب کی گلی میں پڑا رہے۔ اس کے پاؤں ٹوٹ جائیں تو وہ خوش ہوتا ہے کہ حرکت سے نجات ملی اور اب وہ محبوب کی گلی کی زینت بنا رہے گا۔ غرض اقبال سے پہلے کا عشق حرکت کی بجائے سکون کا خواہش مند ہے۔ ذیل کے اشعار اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔

سر زیر بار منت درباں کئے ہوئے — پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں (غالب)

منتیں ہیں شکستہ پائی کی — ایسی تقریب اس گلی میں رہے (میر)

ہوا ہوں ہجر میں لاغر یہاں تک — جو موت آئے تو پہچانے نہ مجھکو (امیر مینائی)

مگر جیسا کہ بیان ہو چکا ہے اقبال محبوب کے دروازے پر پڑے رہنے کو پسند نہیں کرتے وہ تو ہر منزل سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔

بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر\
طلسم زماں و مکاں توڑ کر

اور ان کا عشق ابن السبیل ہے اور اس کے ہزاروں مقام ہیں۔

عشق کسی چیز سے بے پناہ لگاؤ کا نام ہے۔ اور جب عاشق کی محبت ترقی کرتی ہے اور اس کی سوچ صرف ایک نقطے پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے تو لوگ اسے دیوانہ کہہ کر پکارتے ہیں۔ چنانچہ عاشق کا دوسرا نام مجنوں اور عشق کا جنون قرار پایا۔ پرانے شعرا نے عشق کی اس دیوانگی کو حقیقت کا جامہ پہنایا۔ غالب جنوں میں بکتے ہوئے نظر آتے ہیں اور میر کے

جنوں کی شورش کا علاج صرف پتھر رہ گئے ہیں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!! (غالب)

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی　　اب سنگِ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا (میر)

اقبال نے بھی اپنے عشق کو جنوں کا نام دیا ہے مگر وہ اپنے جنوں اور عام دیوانگی میں فرق کرتے ہیں۔ پرانے شاعروں کے ہاں عاشق کا گریبان چاک ہو جاتا ہے اور وہ سر پر خاک ڈال لیتے ہیں۔ اور بے خودی کے دورے ان پر پڑنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ لوگ ان کو پکڑ کر زنداں میں قید کر دیتے ہیں۔ مگر اقبال کا جنوں ان سے مختلف ہے۔ ہر عاشق میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے مقصد کو دیوانگی کی حد تک بھی چاہے مگر اس کا گریبان چاک نہ ہو۔ اقبال کا جنوں اپنے آپ میں رہتا ہے۔ اور ہوش و حواس برقرار رکھتا ہے۔

باچنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم

در جنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

مگر پرانے عاشق دشت خود فراموشی کے چکر لگاتے رہتے تھے ان کے ہوش برقرار نہ رہتے تھے۔ میں صرف میر اور غالب کی مثال دوں گا۔ دونوں جنون کے ہاتھوں بے خودی کا شکار ہوئے ہیں ورنہ دوسرے شعرا کا بھی یہی حال ہے۔

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو　　دیر سے انتظار ہے اپنا (میر)

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی (غالب)

اقبال کا جنون دیوانگی میں بھی شعور رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل و جنون کی لڑائی میں انھوں نے جنوں کا ساتھ دیا۔

اک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے　　اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ — کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

عشق کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دیتا ہے اور اندیشہ ہائے دور دراز میں الجھے رہنے کی بجائے عمل کی راہوں پر گامزن ہو جاتا ہے۔ وہ مشکلات کی پروا نہیں کرتا اور حضرت ابراہیم کی طرح بے خطر کود پڑتا ہے۔ عشق کا تعلق وجدان سے ہے وہ دلیل و برہان کے چکر میں پھنس کر مصلحت پرستی کو شعار نہیں بناتا مگر انسان میں ایک قوت ایسی بھی ہے جو اسے سوچ بچار اور دنیاوی نفع و نقصان کا خیال رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ مصلحت اس کا دین ہے اور وہ فائدے کو مد نظر رکھتی ہے۔ یہ عقل کی قوت ہے چنانچہ کسی نہ کسی مقام پر عقل و عشق میں تصادم ہو جانا لازمی ہے۔ مگر چھٹی صدی ہجری تک عقل اور عشق میں آویزش شروع نہ ہوئی تھی اس وقت تک محبت اور عقل کا علیحدہ علیحدہ ذکر تو آتا ہے مگر دونوں میں حریفانہ مقابلہ نہیں ہوتا۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے کے ممد نظر آتے ہیں۔ عقل ہی سے محبت کی راہیں تلاش کی جاتی ہیں۔ حضرت داتا گنج بخش (متوفی ۴۶۵ھ) عقل کو روح کا حربہ قرار دیتے ہیں جو نیک کاموں کی طرف لے جانے والی ہے اور روح ہی محبت الٰہی کی بنیاد ہے۔

"پس معلوم ہونا چاہیئے کہ محققین کے نزدیک انسان کی ترکیب تین باتوں سے کامل ہوتی ہے۔ اول روح، دوم نفس، سوم جسم اور ان میں سے ہر ایک چیز کے لئے ایک صفت ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے چنانچہ روح کی صفت عقل، نفس کی صفت خواہش اور جسم کی صفت حس ہے .... جب تک بندہ نفس سے چھٹکارا حاصل نہیں کرتا اور حقیقی ارادت یعنی محبت خداوندی تک نہیں پہونچتا جس کی بنیاد روح ہے وہ قرب حق اور معرفت الٰہی کی حقیقت

تک نہیں پہونچ سکتا... غرض مومن کی روح اسے بہشت کی جانب دعوت دیتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں بہشت کا نمونہ وہی ہے اور اس کا نفس اسے دوزخ کی جانب بلاتا ہے کیونکہ دنیا میں دوزخ کا نمونہ وہی ہے

اس روح کی مدبر کامل عقل اور نفس کی رہنما ناقص ہوس ہے۔ عقل کی تدبیر صواب ہے اور ہوس کی تدبیر خطا۔ لہٰذا طالبان حق پر واجب ہے کہ ہمیشہ مخالف نفس کے راستے پر چلیں تاکہ اس کے خلاف روح و عقل کو مدد دے سکیں جو سر الٰہی کا محل ہے[1]

اس اقتباس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ پانچویں صدی ہجری تک عقل محبت الٰہی کو حاصل کرنے کا ذریعہ تھی۔ امام غزالیؒ (۴۵۰ھ تا ۵۰۵ھ) عقل کو چھٹی حس قرار دیتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے انھوں نے اشرف المخلوقات کہا ہے۔

"لیکن ایک چھٹی قوت انسان کو ودیعت ہوتی ہے جسے بصیرت یا نور عقل کہا جا سکتا ہے یا جو الفاظ چاہو اس کے لئے استعمال کر سکتے ہو۔ اور اسی قوت کی وجہ سے انسان کو اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے باقی تمام چیزوں میں حیوان اور انسان برابر ہیں[2]

آگے چل کے اس کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔

"اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ آدمی کی عقل جتنی بڑھتی جائے گی اتنا اتنا اس

---

[1] کشف المحجوب ترجمہ ابو نعیم عبدالحکیم خاں جالندھری صفحہ ۱۹۲

[2] کیمیائے سعادت ترجمہ نائب نقوی شائع کردہ شیخ غلام علی اینڈ سنز صفحہ ۲۰

کا علم بھی بڑھتا جائے گا۔ معرفت عقل کے مطابق ہوتی ہے انتہائی معرفت اور علوم کا جاننے والا آدمی ہی خداوند عالم کے علوم کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔[1]

چھٹی صدی ہجری میں تصوف اور فلسفہ دونوں عروج پر تھے اس زمانے میں امام رازی نے فلسفہ کو اتنا آسان بنا دیا کہ ہر شخص اس کو سمجھنے کے قابل ہو گیا۔ انھوں نے فلسفیانہ دلائل کی روشنی میں خدا تک پہونچنے کا راستہ دکھایا۔ ادھر تصوف نے عشق کو خدا کی معرفت کا ذریعہ بنایا اور یوں عقل اور عشق میں مقابلہ شروع ہوا۔ مولانا روم فلسفہ اور تصوف دونوں کے رمز آشنا تھے۔ وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ فلسفہ کی نسبت عشق بہتر ہے اور اسی کا دامن پکڑ کر خدا کو پہچانا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے عقل کے خلاف پہلی بار آواز بلند کی اور چونکہ اسی زمانہ میں امام رازی فلسفیانہ افکار کی ترویج کر رہے تھے۔ اس لئے انھوں نے امام موصوف کو تنقید کا ہدف بنایا۔ اقبال چونکہ مولانا کے روحانی مرید ہیں اس لئے انہوں نے بھی امام رازی پر نکتہ چینی کی ہے اور رازی کو عقل اور رومی کو عشق کا مظہر قرار دیا ہے کچھ عرصہ وہ اس کشمکش میں رہے کہ دونوں میں سے کس کے پیروکار بنیں

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

اور آخر کار رومی کو فتح نصیب ہوئی اور وہ اس کے مرید بن گئے۔

نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی

اسی بات کو انھوں نے بانداز دگر یوں بیان کیا ہے۔

---

[1] کیمیائے سعادت ترجمہ نائب نقوی شائع کردہ غلام علی اینڈ سنز ص ۴۲۹

آزمودم عقل دور اندیش را
بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را[1]

چونکہ وہ عقل کو آزما چکے ہیں اس لئے اس کی قوتوں سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ بعض معاملات میں عقل کی رہبری بھی کام آجاتی ہے۔ دنیا کے بے شمار کام عقل سے انجام پذیر ہوتے ہیں چنانچہ وہ عقل سے کام لے کر زندگی کو بہتر بنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔

فطرت کو خرد کے روبرو کر | تسخیر مقام رنگ و بو کر
بے ذوق نہیں ہے گرچہ فطرت | جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

عقل ہی کی وجہ سے اہرمن شعلہ زاد آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے اور خودی اس سے محکم ہو تو غیرت جبرئیل بن جاتی ہے۔

عقل بہ دام آورد فطرت چالاک را | اہرمن شعلہ زاد سجدہ کند خاک را
خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ | سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ
خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل | اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل

مگر ان کے نزدیک عقل ایک حد تک ہی کام آسکتی ہے اور اس سے آگے عشق کے شہ پروں سے پرواز کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ آستاں کے قریب لے جاتی ہے۔ مگر اندر جانے کا حوصلہ نہیں رکھتی، یہ چراغ راہ ہے مگر منزل نہیں ہے عقل اس جہاں کو فتح کر سکتی ہے مگر عشق لامکاں پر شبخون مارتا ہے۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں | اس کی تقدیر میں حضور نہیں

---

[1] اسی مضمون کا اردو شعر ہے

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں | مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

علم میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور — چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل آدم بر جہاں شبخوں زند — عشق او بر لا مکاں شبخوں زند

عقل کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں مگر جب یہ حد سے بڑھ جاتی ہے اور نیک و بد کی تمیز اٹھا دیتی ہے تو اقبال اسے رد کر دیتے ہیں۔

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے — بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے

خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے — خرد بیزار دل سے دل خرد سے

اب عشق اور عقل میں مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ عقل مختلف حربوں سے عشق پر اپنی فوقیت جتاتی ہے۔ کبھی فلسفے کی مدد لیتی ہے تو کبھی نیکی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے تو کبھی واعظ و شیخ کے روپ میں نظر آتی ہے۔

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

اب اقبال عقل اور عشق کا مقابلہ کرتے ہیں اور دونوں کی صفات کی وضاحت کرتے ہیں۔ عقل مصلحت اندیش ہے اور عشق مصلحت سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ عقل حجت و دلیل کو آلۂ کار بناتی ہے مگر عشق اس سے بے نیاز ہے۔ عقل معنی پیغام سمجھنے میں مصروف رہتی ہے اور عشق سبک گام عمل ہو جاتا ہے۔ عقل جان کو خطرے میں ڈالنے کے خلاف ہے۔ مگر عشق بے خطر آتش نمرود میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ عقل سراسر تنقید ہے مگر عشق سراپا عمل ہے۔ عقل تجربہ ہے تو عشق تفکر ہے۔ عقل علم سے بڑھتی ہے تو عشق سوز و درد و نار غم سے نشو و نما پاتا ہے۔ عقل فرنگیوں سے مات کھا جاتی ہے مگر عشق کی تیغ جگردار کا کوئی مقابلہ

نہیں کر سکتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عقل فانی ہے مگر عشق زندہ جاوید ہے۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے پاکیٔ قلب و نگاہ

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنی پیغام ابھی

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

عقل تا از عشق برخوردار نیست
جز تماشہ خانہ افکار نیست

ہے ابد کے نسخہ دیرینہ کی تمہید عشق
عقل انسانی ہے فانی زندۂ جاوید عشق

عشق کی تیغ جگردار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

اک دانش نورانی، اک دانش برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

تڑپ رہا ہے فلاطوں میان غیب و حضور
ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف

عقل اور عشق کی اس لڑائی میں اقبال بعض مقامات پر خود حد سے بڑھ جاتے ہیں اور عشق کی حمایت کرتے ہوئے عقل کو کلی طور پر رد کر دیتے ہیں۔

تازہ مرے ضمیر میں معرکہ کہن ہوا
عشق تمام مصطفےٰ، عقل تمام بولہب

مگر عام طور پر وہ عشق اور عقل دونوں کا ساتھ ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا مرد مومن عقل اور عشق دونوں میں کامل ہے۔

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقہ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

وہ عقل اور عشق دونوں کو رہنما مانتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عشق عقل سے بہتر رہنمائی کے فرائض انجام دیتا ہے۔

عقل بہ حیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں	ہر دو بہ منزلے رواں ہر دو امیر کارواں
دست دراز می کند تا بہ طناب کہکشاں	عشق زیادہ درآ در خیمہ شش جہات را

اور پیام مشرق میں "محاورۂ علم و عشق" کے عنوان سے انھوں نے جو نظم لکھی ہے اس میں انھوں نے علم اور عشق (علم عقل کا قائم مقام ہے) کو ایک ہی نغمہ کے زیر و بم قرار دیا ہے۔ اور ایک کو دوسرے کا مددگار کہا ہے۔ عقل عشق کی بدولت حق شناس بن جاتی ہے۔ اور عشق کا کام عقل کی مدد سے مستحکم بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔

ہماں یک نغمہ را زیر و بم استیم!	ز روز آفرینش ہمدم استیم!
کار عشق از زیرکی محکم اساس	زیرکی از عشق گردد حق شناس!

ہم دیکھ چکے ہیں کہ عشق میں بڑی قوت ہے اور وہ تسخیر کائنات کا سب سے بڑا ذریعہ ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ عشق جسم کی طاقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہے عشق کی قوت اعصاب کی سختی پر منحصر نہیں ہے۔

زور عشق از باد و خاک و آب نیست
قوتش از سختیٔ اعصاب نیست

یہ درست ہے کہ علامہ اقبال جسم کی مضبوطی پر بھی زور دیتے ہیں۔ اور بازوئے حیدر کو کئی مشکلات کا حل بتاتے ہیں۔ سختیاں برداشت کرنے اور سختیاں جھیلنے سے انسانی

فطرت نکھرتی ہے مگر ان کے ساتھ ساتھ نانِ حلال بے حد ضروری ہے۔ خودی کی طرح عشق بھی حرام کے مال سے مر جاتا ہے۔ اقبال پیر رومی کی زبان سے کہتے ہیں۔

عشق و رقت آید از نانِ حلال

عشق و رقت زاید از نانِ حلال!

جیساکہ پہلے بیان ہوا عشق سے اقبال رسول اکرم کی ذات یا خدا سے عشق مراد لیتے ہیں[۱] اس لئے جو چیزیں بھی رسول اکرم نے منع کی ہیں ان کے کرنے سے عشق کمزور ہو جاتا ہے مگر زاہد اور عاشق میں فرق ہوتا ہے زاہد اس دنیا کو چھوڑ دیتا ہے تو عاشق عقبیٰ سے بے پروا ہوتا ہے

زاہد اندر عالم دنیا غریب

عاشق اندر عالم عقبیٰ غریب

زاہد صرف عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ اور یہ فرشتوں کا کام ہے مگر عاشق کا فرشتوں سے بلند تر رتبہ ہے اسی لئے خدا نے اس کے ذمے فرشتوں کی نسبت مشکل کام کی انجام دہی لگائی ہے۔

مقام بندگی دیگر، مقام عاشقی دیگر

ز نوری سجدہ می خواہی ز خاکی بیش ازاں خواہی

۱؎ زندہ رود (یعنی اقبال) جاوید نامہ میں حلاج سے پوچھتے ہیں کہ عشق کیا ہے۔

کم شناسم عشق را ایں کار چیست ذوق دیدار است پس دیدار چیست

اور حلاج عشق کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نبی آخر زماں کے احکامات کی تعمیل ہی عشق ہے

معنی دیدار آن آخر زماں! حکم او بر خویشتن کردن رواں

باز خود را بیں دیدار اوست سنتِ او سرے از اسرار اوست

زاہد خلوت میں عبادت کرتا ہے مگر عشق کا مقام جلوت ہے اگرچہ خدا خلوت و جلوت میں موجود ہے مگر جلوت کا مرتبہ خلوت سے بلند ہے خلوت آغاز ہے تو جلوت اس کی انتہا ہے۔ پیغمبر ہمیشہ لوگوں سے ملتے اور ان کی اصلاح کرتے رہے ہیں انھوں نے کبھی صرف اکیلے بیٹھ کر عبادت کرنے پر اکتفا نہیں کیا۔ چنانچہ اقبال عشق کو وارث پیغمبری قرار دیتے ہیں۔ جب یہ کامل ہوتا ہے تو آدم گری کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔

خلوت و جلوت کمال سوز و ساز ہر دو حالات و مقالات نیاز
چیست آں بگذشتن از دیر و کنشت چیست ایں تنہا نہ رفتن در بہشت
گرچہ اندر خلوت و جلوت خدا ست خلوت آغاز است جلوت انتہا ست!
گفتہ پیغمبری درد سر است ! عشق چوں کامل شود آدم گر است

چنانچہ عشق سے جو کام بھی کیا جائے اس میں عظمت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی انتہا یہ ہے کہ عاشق کا گناہ بھی ایک تازہ کائنات کی پیدائش کا باعث بنتا ہے۔

از گناہ بندہ صاحب جنوں
کائنات تازہ آید بروں!

مردِ مومن

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

اقبال کا مردِ مومن وہ مثالی انسان ہے جو دنیا میں سب سے بلند مرتبت ہے اور ان کے نظریۂ خودی کے ارتقا کی آخری کڑی ہے یہ عظیم المرتبت انسان روز روز پیدا نہیں ہوتا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میر تقی میر نے کہا تھا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

لیکن جب ایسا انسان پیدا ہو جاتا ہے تو کائنات میں ایک تہلکہ مچ جاتا ہے۔ اور ستارے اس کے خوف سے

لرزنے لگتے ہیں ؎

عروج آدم سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

ابن العربی اور دوسرے صوفیا کے برخلاف اقبال کے انسان کامل کی انتہا یہ نہیں ہے کہ وہ خدا میں ضم ہو کر اپنی انفرادیت کھو دے بلکہ وہ اپنے اندر خدا کی صفات پیدا کر لیتا ہے لیکن پھر بھی اس سے الگ اپنا وجود رکھتا ہے۔ اسی طرح اقبال کا مرد مومن خدا کی صفات کا حامل ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتا ہے کیونکہ اسے دنیا میں خدا کی نیابت کے فرائض سر انجام دیتے ہیں اور نائب میں حاکم کی صفات کا ہونا لازمی ہوتا ہے، چنانچہ وہ بھی عناصر پر حکمرانی کرتا ہے۔

نائب حق در جہاں بودن خوش است
بر عناصر حکمرانی بودن خوش است

نیابت الٰہی کے اس مرتبہ پر پہونچنے کے لئے اسے اطاعت اور ضبط نفس کے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ دراصل اقبال کا مرد مومن خلافت الٰہیہ کے تصور پر مبنی ہے اس لئے وہ اپنی رہنمائی کے لئے ہمیشہ قرآن کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال نے اس خاکے میں رنگ بھرنے کے لئے اسلامی روایات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں وہ عبدالکریم جیلی کے "الانسان الکامل" سے خاص طور پر متاثر ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ "الانسان الکامل" تخلیق کائنات کا اصلی مقصد ہے۔ اور حضرت رسول کریم ؐ نے انسان کامل کا اعلیٰ نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ چونکہ حقیقت محمدی ہر زمانے میں مختلف ناموں اور لباسوں میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہے اس لئے انسان کامل بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اقتدار

حیاتِ نو کا گہرا اثبات ان کی ذات سے ہوتا رہتا ہے۔" اس کے نزدیک انسانِ کامل یا مردِ مومن کی زندگی جو آئینِ الٰہی کے مطابق ہوتی ہے فطرت کی عام اشیا میں شریک ہو جاتی ہے اور اشیاء کی حقیقت کا راز اس پر منکشف ہو جاتا ہے۔ اس منزل پر پہونچ کر اس کی آنکھ خدا کی آنکھ، اس کا کلام خدا کا کلام اور اس کی زندگی خدا کی زندگی بن جاتی ہے۔ اسی خیال کو اقبال نے بالِ جبریل میں اس طرح پیش کیا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ!
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

یہ اسلامی فلاسفہ اور قرآن حکیم کی تعلیمات ہی کا اثر تھا کہ اقبال کا مردِ مومن نطشے کے فوق البشر کے برخلاف خیر البشر بن جاتا ہے اس کے باوجود نطشے کے فوق البشر اور اقبال کے مردِ مومن میں مشابہت بھی پائی جاتی ہے اور اسی لئے غلطی سے بعض لوگوں نے اسے نطشے کے خیالات کا چربہ سمجھ لیا چنانچہ پروفیسر براؤن نے تاریخ ادب فارسی ——— (History of Persian Literature) میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

Mohammad Iqbal has set forR his aura lostrope anloka
I undeTand themare in sal nu on Oriental ad
do lalian go Hail ir slic: 8 phils o.ph hy. in a shnk
Mudhear i polme Eun Arrar of Khudi "

(محمد اقبال نے اپنے نظریات مثنوی اسرار خودی میں پیش کیے ہیں۔ جن میں (جیسا کہ میں سمجھتا ہوں)، زیادہ تر نٹشے کے فلسفہ کو مشرقی لباس میں پیش کیا گیا ہے۔)

لیکن پروفیسر براؤن کا یہ خیال حقیقت سے بہت دور ہے کیونکہ اقبال کے مرد مومن اور نٹشے کے فوق البشر میں بھی فرق ہے جو ہٹلر اور فاروق اعظم رضؓ میں ہے۔ نٹشے اندھی قوت کا پجاری ہے۔ وہ اپنے فوق البشر پر سے دوسرے لوگوں کو قربان کر دینا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک اصل مقصد فوق البشر کی پیدائش ہے۔ باقی لوگ تو اس کے غلام اور اس کی خواہشات کے پابند ہیں۔ نٹشے کا فوق البشر بے انتہا قوت کا مالک ہے اور اقبال کا مرد مومن بھی بے حد قوت رکھتا ہے اسی لئے بظاہر دونوں میں مماثلت نظر آتی ہے درحقیقت دونوں میں اختلافات کے بے شمار پہلو بھی ہیں۔ نٹشے کی اقبال نے تعریف بھی کی ہے۔ اور اس کے قلب کو مومن مگر دماغ کو کافر قرار دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نٹشے مغربی تہذیب کا بے حد مخالف تھا اور اس نے اس پر کاری ضرب لگائی ہے چنانچہ اقبال اس کے اس حد تک مدح خواں ہیں کہ اس نے مغربی تہذیب کے دل میں خنجر گھونپ دیا ہے۔

گر نوا خواہی ز پیش او گریز!	در نئے کلکش غریو تندر است
نیشتر اندر دل مغرب فشرد!	دستش از خون چلیپا احمر است
آنکہ بر طرح حرم بتخانہ ساخت	قلب او مومن دماغش کافر است
خویش را در نار آں نمرود سوز	زانکہ بستان خلیل از آذر است

یہ قوت اور طاقت انھیں ابلیس میں نظر آتی تو انھوں نے اس کی بھی تعریف کی ہے چنانچہ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ابلیس کے پیروکار ہیں۔ ابلیس کی طرح نٹشے بھی "لا" کی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گیا مگر اقبال "الا" کی منزل بھی پالیتے ہیں۔ نٹشے کا فوق البشر صرف تا ہے

مگر اقبال کا مردِ مومن قاہری اور دلبری کا مجموعہ ہے۔ نٹشے خدا کا منکر تھا اور اس کا فوق البشر بھی۔ اقبال خود خدا کے ماننے والے ہیں اور ان کا مردِ مومن بھی خدا کا پرستار ہے چنانچہ بالِ جبریل میں وہ کہتے ہیں کہ اگر نٹشے اس زمانے میں ہوتا تو وہ اسے مقامِ کبریا سے آگاہ کرتے۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں!
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

اقبال اس کے اس لئے بھی معترف ہیں کہ اس نے مغرب کے کارگہِ شیشہ گری کو توڑ دیا ہے۔ اور انسانوں کی کمزوریوں پر رحم کھا کر ایک اعلیٰ تر انسان کا تصور پیش کیا ہے وہ پیامِ مشرق میں لکھتے ہیں

از سستیِ عناصرِ انساں دلش تپید | فکرِ حکیم پیکرِ محکم ترآفرید
افگند در فرنگ صد آشوبِ تازہ | دیوانہ بکارگہِ شیشہ گر رسید

مگر یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اقبال نے نٹشے کے مافوق البشر کو سامنے رکھا ہے کیونکہ رسول اکرمؐ کی ذات کی صورت میں ان کے سامنے مکمل ترین انسان کا نمونہ موجود تھا اور اسی پر انھوں نے اپنے مردِ مومن کا تصور استوار کیا ہے۔ چنانچہ رسول اکرمؐ کو وہ آیۂ کائنات کا معنیِ دیریاب کہتے ہیں:

آیۂ کائنات کا معنیِ دیریاب تو!
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

پروفیسر براؤن کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں کہ اقبال کے مردِ مومن کے متعلق تصورات نٹشے سے ماخوذ ہیں۔ حالانکہ اقبال خود کہتے ہیں کہ

انھوں نے جب مرد مومن کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا اس وقت انھوں نے نٹشے کی کتابیں کبھی نہ دیکھی تھیں۔ وہ ڈاکٹر نکلسن کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"وہ انسان کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا یہی وجہ ہے کہ اس نے خلط مبحث کر کے میرے انسان اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے بیس سال قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نٹشے کے عقاید کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گزری تھیں یہ مضمون انڈین انٹی کیوری میں شائع ہوا۔ جب میں نے ۱۹۰۸ء میں ایرانی الہیات پر ایک کتاب لکھی تو اس میں اس کو شامل کر لیا گیا۔"

اسی خط میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

"نٹشے بقائے شخصی کا منکر ہے جو لوگ حصول ارتقاء کے آرزومند ہیں وہ ان سے کہتا ہے۔

کیا تم ہمیشہ کے لئے زمانے کی پشت کا بوجھ بنے رہنا چاہتے ہو اس کے قلم سے یہ الفاظ اس لئے نکلے ہیں کہ زمانے کے متعلق اس کا تصور غلط تھا اس نے کبھی مسئلہ زماں کے اخلاقی پہلو کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی بخلاف اس کے میرے نزدیک بقا انسان کی بلند ترین آرزو اور ایسی متاع گراں مایہ ہے جس کے حصول پر انسان اپنی تمام قوتیں مرکوز کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ میں عمل کی تمام صور و اشکال جن میں تصادم بھی شامل ہے ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے نزدیک ان سے انسان کو زیادہ استحکام و استقلال حاصل ہوتا ہے"

اقبال نامہ صفحہ ۵۸

چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر میں نے سکون وجمود اور اس نوع کے تصوف کو جس کا دائرہ محض قیاس آرائیوں تک محدود ہے۔ مردود قرار دیا ہے [1]

نٹشے کہتا ہے کہ یہ کائنات برقرار رہتی ہے اس میں کمی زیادتی نہیں ہوتی۔ انسان مختلف توانائیوں کا مجموعہ ہے اور جب یہ توانائیاں ایک خاص ترکیب سے اعلیٰ صورت پاتی ہیں تو فوق الانسان پیدا ہوتا ہے چنانچہ انسان مرتے اور پیدا ہوتے رہتے ہیں اور فوق الانسان بھی مرتے اور دوبارہ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جب بھی توانائیاں ایک خاص ترکیب سے اعلیٰ صورت پاتی ہیں تو فوق الانسان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح عمل کی طاقت ختم ہو جاتی ہے جو چیز خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ اس کے لئے کوشش اور جدوجہد کی کیا ضرورت ہے مگر اقبال کا مرد مومن تو عمل اور جدوجہد سے ہی مقام بلند حاصل کرتا ہے۔ وہ خود بخود پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر انسان میں یہ صلاحیت موجود ہے بشرطیکہ وہ اس کو بروئے کار لانے کے لئے مسلسل عمل اور ایمان کی قوتوں سے کام لے۔ ایک فقرے میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی خودی بلند کرلے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال نٹشے کے تکرار زماں کے نظریے کے متعلق اپنے خطبات میں فرماتے ہیں۔

"لیکن فوق الانسان پہلے بھی لاتعداد مرتبہ پیدا ہو چکے ہیں اور ان کی پیدائش خود بخود لازمی ہے۔ یہ صورت حال مجھ میں فوق الانسان بننے کی خواہش پیدا نہیں کرتی۔ ہم صرف اسی چیز کی خواہش کر سکتے ہیں جو بالکل نئی ہو اور بالکل نیا

---

[1] اقبال نامہ صفحہ ۴۶۵

مونا نٹشے کے خیال میں ممکن نہیں یہ تقدیر کا وہ نظریہ ہے جو اس سے بھی برا ہے جسے "قسمت" کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر فوق الانسان نے خود بخود پیدا ہو جانا ہے۔ اور پتہ نہیں کس طرح اس ..... کا ظہور ممکن ہو گا اور یہ صرف سائنسی مرکب ہی ہے تو پھر اپنی قسمت پر شاکر ہو کر بیٹھ رہے گا۔ اور کوشش و جستجو کو ترک کر دے گا مگر اقبال کہتے ہیں کہ مرد مومن دوسرے مختلف ہو گا یعنی پہلے جو ہو چکا ہے وہ فنا نہیں ہو گا۔ اور اب جو پیدا ہو چکا ہے بالکل نیا شخص ہو گا۔ ہر شخص اس مقام کو حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا ہے اور اب یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنی خودی کی تربیت کر لے۔ پھر نٹشے کا فوق البشر قوت کا پیکر ہے جو اخلاقی ضابطوں سے آزاد ہے۔ نٹشے کے خیال میں انسانوں کے دو طبقے ہیں۔ ایک امرا کا اور دوسرا غلاموں کا۔ یہ غلاموں کا طبقہ انسان کامل (Superman) کی خدمت کے لئے ہمیشہ اپنے آپ کو غلامی کی زنجیروں میں مقید رکھنے پر مجبور ہے اور طبقہ امرا کے ظلم و ستم سہتا ہے لیکن اقبال کا مرد مومن دوسروں کو غلام نہیں بناتا اور نہ اس کے معاشرے میں اس طرح کے امتیاز کی کوئی گنجائش ہے۔ اقبال بھی نٹشے کی طرح قوت کے پرستار ہیں لیکن یہ قوت انسانیت کی بہتری کے لئے صرف کی جاتی ہے پھر اقبال صرف ایک طبقہ کو قوت کا حامل نہیں بناتے بلکہ پورے معاشرے میں اسے جاری و ساری دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ کمزوری کو موت کے مترادف سمجھتے ہیں۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات!

لے ملاحظہ ہو۔ فلسفہ خودی

جو شخص زمانے کے تقاضوں کو پورا نہیں کرے گا۔ اور اس کی کسوٹی پر پورا نہیں اترے گا وہ زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ قانون ارتقا اس بات کا مقتضی ہے کہ صرف اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہی باقی رہیں اور کم تر بہتر کے لئے جگہ خالی کرتا رہے۔

تو ہے اگر کم عیار میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات موت ہے میری برات

لیکن یہ سبق کسی خاص طبقے کے لئے نہیں ہے بلکہ وہ کمزوروں کو طاقت ور بنانا چاہتے ہیں۔ انھیں زمانے کے راز سے آگاہ کرتے ہیں اور اس طرح کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور ممولے کو شاہباز سے لڑنے کے گر بتلاتے ہیں۔

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اقبال کا مرد مومن قوت کا پیکر ہوتا ہے۔ وہ دنیاوی جاہ و جلال اور شوکت و حشمت میں یکتا ہوتا ہے۔ اس کی سلطنت کی وسعت بے کراں ہوتی ہے جب وہ شمشیر بکف نکلتا ہے تو کائنات میں کوئی چیز اس کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی۔ وہ سیف اللہ بن جاتا ہے۔ پہاڑ اس کی ہیبت سے رائی ہو جاتے ہیں۔

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
پہاڑ ان کی ہیبت سے ہوتے ہیں رائی
اس کی زمین بے حدود اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دینوب و نیل
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

کیونکہ نٹشے کے برعکس اقبال کے مرد مومن کی قوت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے اس لئے اس میں جسمانی قوت ہی نہیں روحانی قوت بھی پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تنہا اور بے ساز و سامان بھی خدا کی راہ میں لڑتا ہے۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

وہ ایک بوریہ نشین فقیر ہوتے ہوئے بھی بادشاہ کو حکم دے سکتا ہے۔

بازگیر ایں عالمے بد گوہرے
ورنہ بچشم ملک تو با دیگرے

چنانچہ معلوم ہوا کہ اقبال صرف قوت جسمانی اور جسم کی فربہی کے قائل نہیں اور نہ چہرے کی سرخی کو زیادہ اہمیت ہے۔ کیونکہ وہ تو غازہ وساغر ومینا کی کرامات بھی ہو سکتی ہے۔ اور آب دنان کی بیشی کا نتیجہ بھی۔ وہ تو جان پاک کے خواہاں ہیں۔

وہ شے کچھ اور ہے کہتے ہیں جان پاک جسے
یہ رنگ ونم یہ لہو آب دنان کی ہے بیشی!

اور یہ جان پاک اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے غلاموں کی فوجیں اور شاندار قصر نہیں چاہئیں بلکہ اس کو حاصل کرنے کے لئے باقاعدہ تربیت کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ کی اطاعت، ضبط نفس اور عشق رسول میں شدت سے یہ حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لئے عدالت، شجاعت اور صداقت کا سبق پڑھنا پڑتا ہے۔ صدق ویقین پیدا کرنا ہوتا ہے حق گوئی وبے باکی کو شعار بنانا پڑتا ہے۔ دل زندہ اور نگاہ پاک رکھنی پڑتی ہے۔ فقر کی دولت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ امید وجستجو اور نئے نئے مقاصد کی تلاش میں سرگرداں ہونا پڑتا ہے تب یہ گوہر مقصود ہاتھ آتا ہے۔

سطور بالا کے مطالعہ سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ اقبال مجرد قوت کے پرستار نہیں بلکہ جلال وجمال کا امتزاج چاہتے ہیں۔ مومن گرمی وخنکی، سختی ونرمی، غفاری وقہاری کا مجسمہ ہوتا ہے۔ تبھی وہ تسخیری قوتوں کو بر سرکار لا کر اور کائنات کو مسخر کر کے بنی نوع انسان کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر وہ صرف جلالی وقاہری کا مجموعہ ہوتا تو دنیا کے لئے

رحمت کی بجائے زحمت بن جاتا اور خیر و برکت کی بجائے تباہی و بربادی کا پیغام ثابت ہوتا لیکن اقبال کا مردِ مومن تو انسانیت کے لئے خیر و برکت اور رحمت خداوندی کا مظہر ہے۔ وہ جوئے خوش خرام کی مانند ہے جس میں سخت کوشی اور نرمی کی آمیزش ہے۔ چنانچہ اگر اس کی راہ میں چٹانیں حائل ہوں تو وہ ان کا سینہ چیر کر گزر جاتی ہے لیکن راہ میں چمن زار آجائے تو نغمہ خواں ہو جاتی ہے۔ یہی حال مردِ مومن کا ہے جب وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی خاطر میدان کارزار میں کودتا ہے تو قیامت برپا کر دیتا ہے اور شر کی قوتوں کو پائمال کر کے دم لیتا ہے لیکن بزم احباب میں ریشم کی طرح نرم ہو جاتا ہے ؎

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

اور مسجد قرطبہ کو خطاب کر کے کہتے ہیں۔

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز

اس کا مقام بلند: اس کا خیال عظیم
اس کا سرور، اس کا شوق، اسکا نیاز اسکا ناز

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب، اس نگہ دل نواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

یہ تو ظاہر ہے کہ اقبال کا مردِ مومن نیابتِ الٰہی کا فریضہ انجام دیتا ہے اس کے لئے اسے تسخیر کائنات کے منصوبے پر عمل کرنا ہوتا۔ چنانچہ اسے جہاں عشق کی قوتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں عقل کے نور کی بھی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کی روشنی میں منزل کی طرف قدم بڑھایا جا سکے۔ چنانچہ ان کا مردِ کامل علم و محبت اور عقل و عشق کی انتہائی صفات اپنے اندر رکھتا ہے ؎

تیرے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی — نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ — حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ :

اقبال مردِ مومن کی صفات اور اس کے انفرادی ارتقا کی منازل ہی بیان نہیں کرتے بلکہ وہ اس معاشرے کی بھی پوری تصویر ہمارے سامنے کھینچ دیتے ہیں جس میں مردِ مومن کی تربیت کے پورے سامان موجود ہوں ان کا یہ معاشرہ اسلامی تعلیمات پر مبنی ہے جس کی تفصیلات انھوں نے "رموزِ بے خودی" میں بیان کی ہیں اور ان کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں[1]

---

[1] ملاحظہ ہو فلسفہ خودی اور بے خودی

نظریۂ فن

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اقبال اگرچہ باقاعدہ نقاد نہیں ہے مگر اس کے تنقیدی نظریات بڑی اہمیت رکھتے ہیں - اردو ادب کو اس نے تقریباً ہر پہلو سے متاثر کیا ہے. چنانچہ اس صدی کو اقبال کی صدی کہا جاتا ہے - اس سلسلے میں وہ افلاطون سے مشابہ ہے - وہ بھی باقاعدہ نقاد نہ تھا مگر اس کے تنقیدی خیالات سے تنقید ادب بڑی متاثر ہوئی ہے - افلاطون ایک فلسفی تھا اور اخلاقیات کا علمبردار، چنانچہ اس نے اپنی خیالی ریاست سے شاعروں کو دیس نکالا دے دیا کیونکہ اس کے نزدیک شاعروں کا وجود ریاست کے لئے مضر تھا - وہ تو اپنے پسندیدہ شاعر ہومر کو بھی وہاں نہ رہنے دینا چاہتا تھا - افلاطون کا خیال تھا کہ جو چیز غیر مفید ہو اسے

رد کر دینا چاہیے اس نے فلسفے کی مدد سے شاعری کو نقالی قرار دے کر مسترد کر دیا۔ اقبال بھی افلاطون کی طرح فلسفی تھا اور اس نے بھی بہترین معاشرے کا تصور پیش کیا اور جو شاعر اس معاشرے کی اندار کے فروغ کی راہ میں رکاوٹ تھے ان پر کڑی تنقید کی اس نے بھی جب خودی کا نظام پیش کیا تو حافظ کو ایک اعلیٰ شاعر ماننے کے باوجود[ا] گوسفندوں میں سے قرار دیا اور اس کے ام کو زہر ہلاہل سے بھرا ہوا پایا۔

ہوشیار از حافظ صہبا گسار
جامش از زہر اجل سرمایہ دار

نیست غیر از بادہ در بازار او!
از دو جام آشفتہ دستار او

مفتی اقلیم و مینا بردوش
محتسب ممنون پیر مے فروش

آں فقیہہ امت مے خوارگاں!
آں امام امت بے چارگاں

دلربائی ہائے او زہر است و بس
چشم او غارت گر شہر است و بس

اقبال نے حافظ کی بجائے عرفی کو پسند کیا ہے دونوں شیراز کے رہنے والے ہیں مگر دونوں کی شاعری کا اثر مختلف ہے۔ وہ دونوں کا مقابلہ یوں کرتے ہیں۔

حافظ جادو بیاں شیرازی است
عرفی آتش زباں شیرازی است

بادہ زن با عرفی ہنگامہ خیز
زندہ؟ از صحبت حافظ گریز!

بے نیاز از محفل حافظ گزر!
الحذر از گوسفنداں الحذر

ایک سی وجوہات کی بنا پر افلاطون نے ہومر اور اقبال نے حافظ کو اپنی سلطنت سے نکال دیا۔

[ا] وہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"لٹریری اصول یہ ہو کہ حسن حسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں خواہ غیر مفید تو خواجہ دنیا کے بہترین شعراء میں سے ہیں۔" (اقبال نامہ ص۵۲)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اقبال افلاطون کا ساتھی ہے اور اسی کے مسلک کو اپناتا ہے۔ اقبال افلاطون کو بھی حافظ جتنا ہی خطرناک سمجھتا ہے اور اس کو بھی گوسفندانِ قدیم میں سے خیال کرتا ہے۔

راہبِ دیرینہ افلاطونِ حکیم ! — از گروہِ گوسفندانِ قدیم !
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود — جانِ او وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت — خالقِ اعیانِ نامشہود گشت
قوم را سکر اور مسموم گشت — خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

افلاطون اور اقبال کے شعر کے متعلق نظریات میں بھی نمایاں فرق موجود ہے افلاطون کے نزدیک شاعری اور فلسفہ میں ازلی بیر ہے۔" مگر اقبال شاعری اور فلسفے کی دشمنی اور بعد کے قائل نہیں۔ وہ تو دونوں میں گہرا اشتراک محسوس کرتے ہیں ان کے ہاں فلسفہ اور شعر کی حقیقت ایک ہی ہے۔

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا !
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو !

یعنی جہاں افلاطون سرے سے شاعری کے ہی خلاف ہے۔ وہاں اقبال شاعری کو برا نہیں سمجھتے اُن کے نزدیک اس کا اچھا یا برا ہونا اس کے استعمال پر منحصر ہے ایک طرف تو وہ کہتے ہیں کہ :

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے !
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی !

اور دوسری طرف وہ شاعر کو دیدۂ بینائے قوم دیتے ہیں اور اسے ہر وقت قوم کے لئے تڑپتے اور آنسو بہاتے ہوئے دیکھتے ہیں :

محفلِ نظمِ حکومت چہرۂ زیبائے قوم   شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ   کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

وہ اس سلسلے میں حالیؔ کی پیروی کرتے ہیں۔ حالیؔ نے بھی شعر کو بنیادی طور پر نیکی کی طرف لے جانے والا قرار دیا تھا مگر بُری سوسائٹی کے زیرِ اثر اس میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور پھر شاعر قوم کے لئے زہر کا کام کرتا ہے۔ حالیؔ نے اپنی مسدس میں شاعروں پر اتنا ہی سخت حملہ کیا تھا جتنا اقبال نے حافظ پر کیا ہے[۱]۔ چنانچہ اقبال ان ہی فنون کو پسند کرتا ہے جو معاشرے کے لئے مفید بنا کر اسے اقبال کے لئے قابلِ قبول بناتے ہیں۔

اقبال افراد میں خودی کا جذبہ پیدا کر کے ان کو مردِ مومن کے بلند مقام پر لے جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک وہی فن سب سے بہتر ہے جو خودی کو بیدار کرے اور اس کی تکمیل میں مددگار ثابت ہو جو جذبات کی اصلاح کر کے انسان کو پاکباز اور پاک نگاہ بنائے۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر   گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی   بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات   نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی   خودی سے جب ادب و دین ہوئے ہیں بیگانہ

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ اقبال ادب سے بھی وہی کام لینا چاہتے ہیں جو دین سے لیا جاتا ہے یعنی ایک مثالی معاشرہ پیدا کرنا۔ اگر ادب اس کام میں مددگار ہو تو اس کا مقام ستاروں سے بھی بلند تر ہے ورنہ ان کے نزدیک مردود ٹھہرتا ہے۔ خودی کی تعمیر کا سب سے بڑا ذریعہ عمل ہے سست اور کاہل انسان سے خودی کی حفاظت ممکن نہیں چنانچہ اقبال ایسے ہی شعروں کو

---

[۱] ایک شعر ملاحظہ ہو: گنہ گار واں چھوٹ جائیں گے سارے جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

پسند کرتے ہیں۔ جو عمل کی قوت پیدا کریں اور اگر وہ بے عملی کی طرف راغب کریں تو وہ ان کو زہر ہلاہل سمجھتے ہیں انھوں نے حافظ کی شاعری کو اس لئے ہدف تنقید بنایا کہ یہ سلانے والی شاعری ہے اور افلاطون کو سفندان قدیم کا خطاب اس لئے دیا کہ ان کے نزدیک وہ ذوق عمل سے محروم تھا[1] اور اس کے فلسفہ نے قوموں سے عمل کی قوت چھین لی تھی۔ شاعر کی نوا ہو یا مغنی کا نفس ہو اگر وہ افسردگی پھیلائیں تو اقبال ان کو قبول نہیں کرتا۔ عمل کے لئے دل میں تڑپ اور آرزو کی خلش ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اقبال نے فنون لطیفہ کا مقصد سوز حیات ابدی قرار دیا ہے۔

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

چنانچہ جو فنون خودی کی نفی کرتے ہیں۔ اقبال ان کے سخت خلاف ہیں۔ ڈراما ایک ایسا فن ہے جس میں اپنی شخصیت کو ختم کر کے کسی اور کی ذات کو اپنے اندر جذب کرنا پڑتا ہے ڈرامے کے کردار اپنی ذات کی نفی کر کے دوسرے کی شخصیت کا بہروپ بھرتے ہیں ڈرامے کا ہی ایک دوسرا روپ سینما ہے۔ اقبال ان دونوں کو قومی اور ملی ترقی کے منافی خیال کرتے ہیں اور اسے کاروبار لات و منات قرار دیتے ہیں کیونکہ ان سے خودی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

حریم تیرا خودی غیر کی معاذ اللہ — دوبارہ زندہ نہ کر کاروبار لات و منات

---

[1] افلاطون کی "ریاست" Republic پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذوق عمل سے محروم نہ تھا اس نے افراد کے لئے عمل کو ضروری قرار دیا۔ یہاں اقبال سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے انھوں نے صرف اعیان نامشہود کے فلسفے پر ہی نظر رکھی ہے

یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے ! / رہا نہ تو تو نہ سوز خودی نہ ساز حیات

وہی بت فروشی وہی بت گری ہے / سنیما ہے یا صنعت آزری ہے
وہ صنعت نہ تھی شیوۂ کافری تھا / یہ صنعت نہیں شیوۂ ساحری ہے
وہ مذہب تھا اقوام عہد کہن کا / یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے
وہ دنیا کی مٹی یہ دوزخ کی مٹی
وہ بت خانہ خاکی یہ خاکستری ہے،

جہاں تک فنون لطیفہ کے مقاصد کا تعلق ہے حالی اور اقبال ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ حالی بھی ادب کا سوسائٹی کے مفید ہونا ضروری سمجھتے ہیں اور اقبال بھی۔ حالی کے معیار اخلاق پر ہندوستانی شاعر پورے نہ اترے تو انھوں نے غضب ناک ہو کر کہا تھا۔

گنہ گار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

اور اقبال نے جب ہندوستانی ادیبوں کو اپنے اخلاقی معیار پر پرکھا اور انھیں کم عیار پایا تو کہا۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا / ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں / زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند / کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس / آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اقبال کے اس مقصدی نظریۂ فن کی تعمیر میں ان کی شخصیت ان کے مزاج کی خاص افتاد اور ان کے ماحول نے حصہ لیا ہے ان کے زمانے میں انگریز ہندوستان کا حاکم تھا اور اس کے

اشارہ چشم و ابرو پر ہر شخص نا چنے کو تیار تھا۔ غالب جیسا عظیم شاعر بھی ملکہ وکٹوریہ سے ملک الشعرائی کا خطاب حاصل کرنے کے لئے اس کا قصیدہ خواں ہو گیا۔ ہمارا سارا ادب انحطاطی دور کا پیدا کردہ تھا۔ اس پر پہلی کاری ضرب حالی نے لگائی تھی۔ ہندوستان کے اس زمانے کے ادب کے متعلق اقبال کا وہی نظریہ ہے جو حالی کا ہے۔ وہ حالی کی طرح دلنوازی اور حسن کی داد دیتے ہیں حالی نے جھوٹ کو تباہی کا باعث قرار دیا تھا۔ اقبال جھوٹ اور سچ سے غرض نہیں رکھتے اور نہ اس گورکھ دھندے میں اپنے آپ کو پھنساتے ہیں۔ وہ حالی سے زیادہ صاف راستہ اختیار کرتے ہیں۔ جو کچھ بے عملی سکھاتا ہے اور عمل کا دشمن ہے اقبال اس کے دشمن ہیں وہ ادب سے اس قوت کے طالب ہیں جو زندگی کے چمن کے پھولنے پھلنے کا باعث ہو۔ وہ شاعری کو وارث پیغمبری بنانا چاہتے ہیں اور اس سے آدم گری کا کام لینا چاہتے ہیں۔ وہ لیلا کی خوش نوائی کو اسی صورت میں سراہتے ہیں، اگر اس سے کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا ہو اور ممولے میں باز سے لڑنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ غلاموں کے لئے اس سے بہتر اور کون سا فن ہو سکتا ہے جو ان کو اپنے آقاؤں کی زنجیروں کو توڑنے کے قابل بنا دے۔ اقبال نے ایک غلام کو آزادی کا سبق پڑھانا تھا اور انھیں عمل شمشیر سے مسلح کرنا تھا اس لئے انھوں نے اس نظریہ فن کو اپنایا اور بڑے زور دار انداز میں اس کی تبلیغ بھی کی۔

اپنی شاعری کے پہلے دور میں وہ نظریہ وطنیت کے قائل تھے۔ اور اسی کے زیر اثر انھوں نے ہندوستان میں فطرت کے نظاروں پر نظمیں لکھیں مگر بعد میں انھوں نے فطرت سے دل بہلانے اور اس کی شان میں ترانے گانے کی بجائے اس کی تسخیر کا نظریہ اپنایا ان کے زمانے میں ایک طرف تو فطرت کی عکاسی پر زور دیا جا رہا تھا، اور دوسری طرف عورت کو اپنی توجہ کا مرکز بنا کر اس کے گرد شعر و ادب کا ہالہ تیار کیا جا رہا تھا یہ دونوں پہلو

اقبال کے فلسفہ زندگی سے ہم آہنگ نہ تھیں۔ ہم وہ اشعار پہلے نقل کر آئے ہیں۔ جن میں انھوں نے ہندوستان کے شاعروں کو اس لئے ملامت کا نشانہ بنایا ہے کہ ان کے اعصاب پر عورت سوار ہے اب میں چند شعر ایسے نقل کرتا ہوں جن میں فطرت کی عکاسی اور پرستش کی بجائے اس کی تسخیر کا مشورہ دیا گیا ہے۔

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو! — صیاد ہیں مردانِ ہنر مند کہ نخچیر

فطرت کو خرد کے روبرو کر! — جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر!

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے — آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

چنانچہ اقبال اس نظریہ کے خلاف ہیں کہ فطرت جیسی ہے اسے ویسا ہی اپنے ادب میں منعکس کر دینا چاہئے وہ تو اپنے ہنر سے فطرت کو شرمندہ کر دینا چاہتے ہیں۔

شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے

ان کے نزدیک شاعر کا فرض فطرت کو جوں کا توں بیان کرنا نہیں بلکہ اسے جمیل تر بنا دینا ہے ؎

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہِ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادو

جس طرح وہ اپنی شاعری کے دورِ اول میں فطرت کے پرستار تھے اور بعد میں تسخیرِ فطرت کے قائل ہو گئے۔ اسی طرح حسن کے متعلق بھی ان کا نظریہ بدل گیا۔ پہلے ان کی نظر سطحی تھی اور ہر چیز میں حسن دیکھتے تھے۔ صحرا، ویرانے، اور سلمیٰ کی آنکھ سب جگہ ان کو حسن کے جلوے نظر آتے تھے اور ان کی نگاہ یہیں رک جاتی تھی۔ ابھی اس میں دل وجود پھر کر گزر جانے کی استعداد پیدا نہ ہوئی تھی اسی لئے ان کو حسن کے زوال پذیر ہونے کا یقین تھا اور وہ اس حسن سے آشنا نہ تھے جو فنا سے نا آشنا اور پایدار و دائمی ہے۔ حسن خدا ہے

سوال کرتا ہے "جہاں میں کیوں نہ تو نے مجھے لازوال کیا" اور خدا کی طرف سے جواب عطا ہوتا ہے۔

ہوتی ہے زنگ تغیر سے جب نمود اسکی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جسکی

اس وقت وہ حسن کی گہرائیوں میں اترنے کی بجائے اس کے ظاہر پر نظر رکھتے تھے ان کا نقطہ نظر ایک بچے کا سا تھا۔ وہ خود ایک طفل شیر خوار کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

میری آنکھوں کو لبھاتا ہے حسن ظاہری
کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی میری

مگر نادانی کا یہ احساس ان کی روح کو بے چین رکھتا ہے۔ وہ حسن کے اس عام جلوے سے مطمئن نہیں ہوتے اور اس گم گشتہ حسن کے متلاشی ہیں جو لازوال ہو۔

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثل جرس

حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بیتاب ہے
زندگی اس کی مثال ماہئ بے آب ہے

مگر جوں جوں ان کے خیالات میں گہرائی اور تفکر میں بلندی آتی گئی ان کا نظریۂ جمال بھی اس سے متاثر ہوتا رہا۔ اب ان کو حسن سلمیٰ کی آنکھ، پھولوں کی رعنائی اور بہار کے جوبن میں ہی نظر نہیں آتا بلکہ وہ اس سے بہت آگے دیکھتے ہیں چنانچہ اب وہ حسن کو زوال پذیر نہیں سمجھتے بلکہ لازوال جانتے ہیں۔ اب وہ جمال میں جلال کو شامل کرتے ہیں اور عظیم و جلیل چیزوں میں حسن کے جلوے دیکھتے ہیں۔ اب وہ اس حسن کو کوئی اہمیت نہیں دیتے جو جلال سے عاری ہے۔

میری نظر میں ہے یہی جمال و زیبائی
کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

نہ ہو جلال تو حسن جمال بے تاثیر
ترا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک!

مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

اس مقام پر ہم جمال اور جلال کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ جمال میں نرمی لطافت اور دلکشی پائی جاتی ہے مگر جلال میں رعب، تندی، تیزی اور ہیبت ہوتی ہے جلال میں قاہری ہے اور جمال میں دلربائی۔ اقبال نے جلال کو لا اور الا کو جمال قرار دیا ہے جس طرح لا کے بغیر الا کا کوئی فائدہ نہیں اور صرف لا کے بغیر الا کا کوئی فائدہ نہیں اور صرف لا بغیر الا کے تباہی کا باعث ہے۔ اسی طرح جمال اور جلال کا یک ہونا بھی ضروری ہے۔ تب ہی حسن کا مکمل نمونہ ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ جمال اور جلال یا لا اور الا کی صفات ملاحظہ ہوں۔

نکتہ می گویم از مردان حال
امتاں را لا جلال الا جمال

لا و الا احتساب کائنات
لا و الا فتح باب کائنات

ہر دو تقدیر جہان کاف و نون
حرکت از لا زاید از الا سکون!

تا نہ رمز لا الہ آید بدست
بند غیر اللہ را نتواں شکست

در جہاں آغازِ کار از حرف لاست
ایں نخستیں منزل مرد خداست

پیش غیر اللہ لا گفتن حیات!
تازہ از ہنگامۂ او کائنات

از جنونش ہر گریباں چاک نیست
در خور ایں شعلہ ہر خاشاک نیست

جذبۂ او در دل یک زندہ مرد
می کند صد رہ نشیں را رہ نورد!

بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز
تخم لا در مشت خاک او بریز

ہر کرا ایں سوز باشد در جگر
ہوشش از ہول قیامت بیشتر!

لا مقام ضرب ہائے پے بہ پے
ایں غو رعد است نے آواز نے

برک (BURK) کے نزدیک دہشت اور عظمت جلال کی بنیادی صفت ہے اور ہنری ہوم نے قوت کو جلال کا ضروری جز قرار دیا ہے۔ کانٹ کہتا ہے کہ جلال مغلوب کر لیتا ہے مگر اس کے نزدیک جلال اور جمال دونوں مسرت پہونچاتے ہیں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حسن کی بنیاد تصدیق ذوق ہے اور جلال جذبہ عقل سے تعلق رکھتا ہے۔ بہر حال اقبال کے نزدیک جلال اور جمال کا جو تصور ہے وہ مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے۔

انھیں مسجد قرطبہ میں عظمت فن کے نمونے اسی لئے نظر آتے ہیں کہ وہ جلال اور جمال کا مجموعہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا حسن لافانی ہے اور اقبال اسے کعبہ ارباب فن کا درجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ مسجد قرطبہ کو خطاب کر کے کہتے ہیں:

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل — وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل
کعبۂ ارباب فن! سطوت دین مبین — تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمین

اب آئیے یہ دیکھیں کہ جلال و جمال کا یہ مرقع کس طرح وجود میں آتا ہے۔ مسجد قرطبہ ہی کی تخلیق کا سبب بیان کرتے ہوئے انھوں نے اس پر روشنی ڈالی ہے۔

اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود — عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود!
قطرۂ خون جگر سل کو بناتا ہے دل — خون جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

عشق چونکہ جمال و جلال کا مجموعہ ہے اس لئے اس کی تخلیق بھی لازوال بن جاتی ہے:

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

اقبال نے عشق کو کبھی سوز دل کہا ہے اور کبھی خون جگر کہہ کر پکارا ہے۔ حکمت اور شعر

میں بھی سوزِ دل ہی سے فرق پیدا ہوتا ہے۔

حق اگر سوزے نہ دارد حکمت است
شعر می گردد چوں سوز از دل گرفت

جب تک نوا کی پرورش خونِ دل و جگر سے نہ کی جائے اور رگِ ساز میں صاحب ساز کا لہو رواں نہ ہو فن وجود میں نہیں آتا۔ خونِ جگر کے بغیر تمام نقش ناتمام رہتے ہیں اور نغمہ سودائے خام سے آگے نہیں بڑھتا۔ شاعری میں کیمیاگری سوزِ نفس اور خونِ دل سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

خونِ دل و جگر سے میری نوا کی پرورش — ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو
مقامِ گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیاگر ہوں — یہی سوزِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر! — نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

یہی دل کی تپش، سوز اور گداز ہے جو فن کار کا فن تخلیق کرتی ہے اور پھر اس فن پارے میں وہ آگ بھر دیتی ہے جو قاری کے دل کو بھی سوز اور گداز عطا کرتی ہے فنکار دل کے آئینے کو اک نئی شکل عطا کرتا ہے اور اگر اس میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ جس آگ میں وہ خود جل رہا ہے اس کی حرارت دوسروں تک بھی پہنچا سکے تو وہ فنکار نہیں ہے اس کے فن میں بلندی اور پختگی موجود نہیں ہے۔

بخود نازم، گدائے بے نیازم — تیم، سوزم، گدازم نے نوازم!
تراز نغمہ در آتش نشاندم! — سکندر فطرتم آئینہ سازم!

اور دل میں یہ سوز اور تپش آرزو سے پیدا ہوتی ہے جستجو اور آرزو عشق کے حربوں میں سے ہیں اور یہی شعر کو سوز عطا کرتی ہیں۔

جانِ ما را لذت اندر جستجو است!

شعر را سوز از مقامِ آرزو است

جستجو اور آرزو عمل کو پیدا کرتی ہیں جو محنت اور کوشش کا طالب ہوتا ہے۔ چنانچہ اقبال کے نزدیک، کوشش اور محنت پیہم ہی سے ہنر اعلیٰ مقام حاصل کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ شاعری اور فن کا مادہ فطرت کی طرف سے انسان میں ودیعت ہوتا ہے[1] شاعرانہ صلاحیت خداداد چیز ہے مگر اس کو کوشش اور محنت سے چمکایا جا سکتا ہے۔ اگر مسلسل محنت نہ کی جائے تو پھر اس مخفی صلاحیت کو اجاگر کر کے اس سے پورا کام نہیں لیا جا سکتا۔

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خداداد! ... کوشش سے کہاں مردِ ہنرمند ہے آزاد

خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر ... مے خانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا ... روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

وہ دانتے کی طرح مسلسل محنت اور پیہم کوشش کو ضروری خیال کرتے ہیں[2] ان کے نزدیک ورڈزورتھ کی طرح فن جذبات کا بے ساختہ اظہار نہیں ہے[3]۔ فن کی تخلیق کے لئے سخت محنت درکار ہے ورنہ یہ کارِ بے بنیاد ثابت ہوتا۔ علامہ اقبال خود اپنی نظموں کی تہذیب اور ترتیب میں بڑی محنت سے کام لیتے ہیں انھوں نے خضرِ راہ میں سے چند بند اس لئے نکال

---

[1] حالی کا بھی یہی نقطہ نظر ہے - وہ بھی شاعرانہ صلاحیت کو خداداد سمجھتے ہیں مگر ان کیلئے محنت ضروری قرار دیتے ہیں چنانچہ مطالعہ کائنات، تفحص الفاظ اور پیرایہ بیان پر عبور حاصل کرنا بھی شاعر کے لئے ضروری ہے۔

[2]، [3] ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "تنقیدی نظریے"، دانتے والا باب

دیئے کہ یہ نظر ثانی پران کے نزدیک نظم کے عمومی رجحان سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ شاعر ایک خاص دور میں محنت کر کے اگر یہ سمجھ لے کہ اب اس کو محنت اور تلاش و جستجو کی ضرورت نہیں تو یہ بھی غلط بات ہے۔

ہر لحظہ نیا شوق نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

اگر شاعر کسی مقام پر بھی رک کر گوئٹے کے فاوسٹ کی طرح قرار حاصل کر لے تو یہ اس کی موت ہو گی۔ جب شاعر ایک خوبصورت چیز حاصل کر لیتا ہے تو دوسری زیادہ خوبصورت چیز حاصل کر لیتا ہے تو دوسری زیادہ خوبصورت کی جستجو میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو حور و شاعر کے مکالمہ میں بیان کیا ہے۔ حور شاعر سے کہتی ہے کہ کیا وجہ ہے کہ تجھے کہیں بھی قرار نہیں تو شاعر جواب دیتا ہے۔

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوب روئے ۔ تپد آں زماں دل من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے ۔ سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

اقبال شاعر سے جان کاہی کے طالب تھے۔ وہ شعر و ادب کو آسان بنانا نہ چاہتے تھے۔ قافیہ اور ردیف اور بحروں پر عبور حاصل کرنا ان کے نزدیک ضروری ہے اس کے ساتھ طرز بیان اور طرز ادا کو بھی ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ لان جائی نس[1] (Longinus) کے ہم خیال ہیں کہ رفعت تک پہنچنے کے لئے اسلوب بڑی مدد دیتا ہے اقبال ایک خط میں لکھتے ہیں

"شعر کا تخلیقی اور ارتقائی اثر محض اس مطالب اور معانی کی وجہ سے نہیں

---

[1] لان جائی نس کے نظریہ شعر کے لئے ملاحظہ ہو تنقیدی نظریے از ملک حسن اختر

ہے بلکہ اس میں شعر کی زبان اور زبان کے الفاظ کی صوت اور طرز ادا کو بھی بڑا دخل ہے۔[1]

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں:

"کیا عجب ہے کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں اس واسطے کہ آرٹ (فن) غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ موجودہ وقت میں میرے لئے ممکن نہیں۔"[1]

مولانا حالی نے ردیف اور قافیے کی جکڑ بندیوں کے خلاف آواز بلند کی تھی اور کہا تھا کہ اگر غیر مردف غزلیں لکھی جائیں تو بہتر ہے مگر اقبال ردیف کو شعر کا حسن بڑھانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ نظم معریٰ یا نظم آزاد کو پسند نہ کرتے تھے۔

"سنئے غزل اور رباعی کے لئے قافیہ کی شرط لازمی ہے اگر ردیف بھی بڑھا دی جائے تو ان میں اور بھی لطف بڑھ جاتا ہے۔ البتہ نظم ردیف کی محتاج نہیں۔ قافیہ تو ہونا چاہئے۔ اب کچھ عرصہ سے بلا ردیف او رقافیہ نظمیں لکھی جاتی ہیں اور یہ انگریزی نظموں کی تقلید ہے جس کا نام انگریزی میں بلینک ورس ہے جس کو شتر گربہ کہنا چاہئے۔ اگرچہ پبلک مذاق کچھ ایسا ہو چلا ہے مگر میرے خیال میں یہ روش آئندہ مقبول نہ ہو گی۔"[2]

اقبال نے جدید اور قدیم کی بحث لکھی کی ہے وہ جدت ماحول سے اثر پذیر ہونے میں دیکھتے ہیں۔ عروض کے قواعد کی خلاف ورزی جدت نہیں ہے بلکہ اس کو وہ شاعری کے خلاف سازش قرار دیتے ہیں ان کے نظریہ جدید و قدیم کے مطابق میر، غالب، ولی، دکنی سب جدید شاعر بن جاتے ہیں۔ دراصل اقبال کا نظریہ ہے بھی درست حالی کی شاعری کو جدید

---

[1] اقبال نامہ ص۱۰۱ [2] اقبال نامہ ص۱۰۹

کہا گیا تھا مگر وہ بھی قدیم بنتی جارہی ہے ۔ یہ درست ہے کہ جو شاعر بھی عصری تقاضوں سے عہدہ برآ ہو رہی جدید ہے اور جو ان سے بے خبر رہے وہ قدیم ہے آج رنگ میر، رنگ غالب میں شعر کہنے والے قدیم شاعر ہیں ۔ خواہ وہ اسی زمانے میں سانس لے رہے ہیں ۔

اقبال کہتے ہیں ۔

"میں فقط فرسودہ مضامین کی حد تک جدید اور قدیم کی بحث کو مانتا ہوں، شاعری کی جان تو شاعری کے جذبات ہیں جذبات انسانی اور کیفیات قلبی اللہ کی دین ہے ۔ ہاں یہ ضرور ہے اس کے ادا کرنے کے لئے پر اثر الفاظ تلاش کرے ۔ نظم کے اصناف کی تقسیم جو قدیم سے ہے ہمیشہ رہے گی اور انسانی جذبات ماحول کے تابع رہیں گے ۔ بس یہ سمجھ لیا جائے کہ جس شاعر کے جذبات ماحول سے اثر پذیر ہیں ۔ وہ شاعر جدید رنگ کا حامل متصور ہو سکتا ہے نہ کہ نفس شعری ! اگر ہم نے پابندی عروض کی خلاف ورزی کی تو شاعری کا قلعہ ہی منہدم ہو جائے گا اور اس نقطہ خیال سے یہ کہنا پڑیگا ۔ اور یہ کہنا درست ہے کہ موجودہ شعرا کا کام تعمیری ہونا چاہئے نہ کہ تخریبی"[1]

اقبال کا یہ کہنا درست نہیں کہ عروض کی پابندی لازمی ہے ۔ ان کا نظم معریٰ ....

..... (اور نظم آزاد تو اس سے بھی آگے ہے) کے خلاف اس قدر غم و غصہ جائز نہیں اگر غزل کا ایک شعر الگ کر لیا جائے تو وہ بھی دل پر گہرا اثر کرتا ہے حالانکہ وہاں ردیف اور قافیہ کا احساس نہیں ہوتا ۔ دراصل بحریں، ردیف اور قافیے شعر موثر بنانے کے لئے ایجاد ہوئے تھے اور اگر ان سے ہٹ کر بھی نظم میں تاثیر پیدا کی جا سکے تو وہ بھی اسی طرح قابل قبول ہوگی

---

[1] اقبال نامہ ص۲۰

جیساکہ ردیف اور قافیہ والی نظم - اسی طرح بحریں بھی ایک وزن میں جس سے تاثیر پیدا کی جاتی ہے - ان اوزان کو بدلا بھی جا سکتا ہے - بہر حال کوئی نہ کوئی وزن تو ضرور اختیار کرنا ہوگا خواہ وہ مروجہ بحروں میں نہ ہو - موجودہ زمانے کے شعرا کا ردیف قافیہ اور بحروں کو اس لئے ترک کرنا کہ ان کے لئے آسانی پیدا ہو جائے غلط ہے - پرانے عروضی قواعد پر عبور حاصل کر کے ہی ان کو توڑا جا سکتا ہے - وہی شاعر کامیاب آزاد نظم کہہ سکتا ہے جو اچھی پابند نظمیں لکھنے پر قادر ہو - اعلیٰ ادب تن آسانی کی پیداوار نہیں بلکہ اس کے لئے بے حد ریاض کی ضرورت ہے -

تصوّرِ تعلیم

علم را بر تن زنے مارے بود
علم را بر دل زنے یارے بود

پیشتر اس کے کہ ہم اقبال کے تصور تعلیم کا ذکر کریں۔ ہمیں یہ جاننا چاہئے کہ تعلیم سے ہماری کیا مراد ہے۔ یوں تو تعلیم کا مطلب علم کا پہنچانا ہے۔ یہ علم خواہ کسی قسم کا بھی ہو مگر تعلیم کے اعلیٰ مقاصد یہ ہیں کہ وہ اشخاص کی فطری صلاحیتوں کو ابھارے اور ان کی نشوونما کے مواقع فراہم کرے اور ان کو معاشرے کے لئے مفید شہری بنائے جوزف ٹی شپلی نے تعلیم کی تعریف یوں کی ہے۔

"تعلیم علم کے ذریعے انسان کو ان قوتوں کے استعمال کے قابل بناتی ہے جو اس میں ودیعت کی گئی ہیں۔"

اور برٹرینڈ رسل نے تعلیم کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"مستقبل میں ہم کو اس طرح کا نظام تعلیم پیدا کرنا چاہئے جو ہر لڑکے اور لڑکی کو بہترین چیزوں کے حصول کے مواقع فراہم کرے۔

چنانچہ ہر قوم ایک ایسا نظام تعلیم پیدا کرنے کی سعی کرتی ہے جو اس کی ضروریات کو پورا کرے اور اس کے فلسفہ زندگی سے ہم آہنگ ہو کیونکہ یہ وہ کارخانہ ہے جہاں ملک و قوم کی مشین کے لئے پرزے تیار ہوتے ہیں۔ اگر یہ پرزے ناقص ہوں تو ظاہر ہے کہ مشین اپنا کام تسلی بخش طریقے پر نہیں کر سکتی۔ نظام تعلیم نظام زندگی کا ایک ماہر تعلیم نے کہا تھا کہ اگر اسے چند سال کے لئے وزارت تعلیم سونپ دی جائے تو وہ جس طرح کی قوم چاہے تیار کر سکتا ہے۔

انگریزوں نے جب اس ملک پر قبضہ کیا تو انھیں بہت جلد احساس ہو گیا کہ بزور شمشیر وہ یہاں زیادہ دیر قابض نہ رہ سکیں گے چنانچہ انھوں نے ہندوستانیوں کے ذہنوں کو غلام بنانے کا منصوبہ تیار کیا۔ جس کی ایک جھلک میکالے کی رپورٹ میں مل سکتی ہے۔ انھوں نے ہندوستان میں جو نظام تعلیم رائج کیا وہ ان کی ضروریات کے عین مطابق تھا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ہمارا ایک بہت بڑا دماغ بھی اسی لائحہ عمل کو اپنانے پر تیار ہو گیا انگریز کی سیاست اور شاعرانہ چالیں سر سید احمد خاں کی دیانت اور ذہانت پر غالب آگئیں سر سید نے یہ تو کہا تھا کہ اس تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ایک ہاتھ میں قرآن دوسرے ہاتھ میں سائنس اور سر پر لاالہ الا اللہ کا تاج ہو گا مگر ان کا یہ نقطہ نظر انگریز کی چالاکی اور عیاری کے سامنے کامیاب نہ ہو سکا۔ اکبر الٰہ آبادی نے انگریزی چالوں کے پھیلتے ہوئے جال اور مسلمانوں کی کس مپرسی کو محسوس کیا انھوں نے اپنے طنزیہ تیروں سے اس تیر تسمہ پا کو ہلاک کرنا چاہا مگر یہ طوفان ان سے نہ رک سکا۔ ذیل میں اکبر کے چند اشعار درج ہیں جن سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ انھیں انگریزی تعلیم کے نتیجہ سے مذہب کا گلا کاٹنے اور اسلامی روح کے پرواز کر جانے کا کس قدر دکھ تھا۔

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر | گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر
نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے | مگر یونہی کہ گویا آبِ زمزم مے میں داخل ہے
اب رہی تعلیم کون اس امر کا مفتون نہیں | بیبیوں پر مغربی سانچا مگر موزوں نہیں
حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی | اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر | شوہر پرست بیوی پبلک پسند لیڈی
راہِ مغرب میں یہ لڑکے لٹ گئے | واں نہ پہونچے اور ہم سے چھٹ گئے
تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے | جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

اکبر تعلیم کے مخالف نہ تھے۔ ان کو رونا تو اس بات کا تھا کہ کالجوں میں سرکاری اور بازاری تعلیم کے سوا کچھ نہیں۔ وہ انجن چلانا تو سکھاتے مگر انجن بنانا نہیں سکھاتے

انجن آیا نکل گیا زن سے! | سن لیا نام آگ پانی کا
بات اتنی سی اس پہ یہ طومار | غل ہے یورپ کی جانفشانی کا
علم پورا ہمیں سکھائیں اگر! | تب کریں شکر مہربانی کا

اس پر طرہ یہ کہ انگریز کالج میں آزادی کا گلا گھونٹ کر غلامی کا درس دے رہا تھا نوجوانوں کو خوگر تسلیم اور انگریزی برکات کا ثنا خواں بنا رہا تھا یہ کام سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ جسم کی بجائے روح کا قاتل ہے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا | افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اکبر کی اس طنزیہ شاعری کا اثر اقبال نے بھی قبول کیا ہے اس نے اکبر کے ان خیالات کی نہ صرف تصدیق کی بلکہ اپنے بے پناہ مطالعے اور فلسفیانہ ذہن کی مدد سے ان میں نیا رنگ بھی بھر دیا۔ بانگ درا کے آخر میں اقبال نے "ظریفانہ کلام" کے عنوان سے جو اشعار

قلم بند کئے ہیں وہ اکبر کی پیروی میں لکھے گئے ہیں۔ ان کے بعد کے کلام میں بھی انگریزی نظام تعلیم کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے مگر یہاں انداز بدل گیا ہے۔ یہ ان کا اپنا رنگ ہے۔ ذیل میں دونوں قسموں کے شعر درج کئے گئے ہیں۔

مرشد کی یہ تعلیم تھی اے مسلم شوریدہ سر — لازم ہے رہرو کیلئے دنیا میں سامانِ سفر
اس دور میں تعلیم ہے امراض ملت کی دوا — ہے خون فاسد کیلئے تعلیم مثل نیشتہ
لیکن نگاہ نکتہ بیں دیکھے زبوں بختی مری! — رفتم کہ خار از پاکشم محمل نہاں شد از نظر

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — قوم نے سیکھ لی فلاح کی راہ!
روش مغربی ہے مدنظر — وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین — پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

یہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں — نہ ادائے کافرانہ نہ تراش آذرانہ
شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے — سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں! — ساحرِ افرنگ کا صید زبوں

انگریزی نظام تعلیم کی فرعونی صفات سے وہ پوری طرح آگاہ تھے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
اب کہاں سے آئے صدائے لا الٰہ الا اللہ

انگریز کا دیا ہوا نظام تعلیم مسلمانوں کے حق میں زہر قاتل کا درجہ رکھتا تھا۔ ایک تو وہ

بے مقصد تعلیم دے رہا تھا اور دوسرے مسلمانوں کے فلسفہ زندگی کی نفی کر رہا تھا۔ نہ معلوم اس نے کتنے سفینے ڈبو دیئے تھے اور کتنوں کو زندہ لاشیں بنا کر رکھ دیا تھا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ ہر قوم کا تصور تعلیم اس کی نظریاتی زندگی کے بطن سے جنم لیتا ہے مسلمانوں کا تمدن اور ان کی تہذیب اقوام عالم میں اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ بقول اقبال:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی!

چنانچہ اس کے لئے نظام تعلیم بھی خاص ہونا چاہئیے۔ اقوام مغرب کا دیا ہوا تصور تعلیم مسلمانوں کے مفید نہیں ہو سکتا۔ پھر انگریز تو یہاں آقا بن کر آئے تھے وہ ہمیں شاہینی کا سبق کیسے سکھاتے مگر افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ جس طرح ہم نے انگریز کے دیئے ہوئے نظام حکومت کو قبول کیا اسی طرح اس کے عطا کردہ فلسفہ تعلیم پر عمل پیرا رہے۔ ہم نے اس سبق کو بھلا دیا جو قائد اعظم نے دیا تھا اور اس علاج سے موڑ لیا جو حکیم الامت نے تجویز کیا تھا۔ ہمارے دل کی نامحکمی اسی طرح قائم رہی اور آب نشاط انگیز ہمیں نہ مل سکا۔ کوتاہی ہماری ہو یا ساقی کی مگر سزا ہمیں مل کر رہی ہم جہاں سے چلے تھے آج بھی وہیں پر کمیشن بیٹھتے ہیں اور اٹھ جاتے ہیں نہ معلوم ہماری سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ غلاموں کا نظام تعلیم آزاد بندوں کے لئے موزوں ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا! — موزوں ہی نہیں مکتب کیلئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بے چارے ممولے کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال! — کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی — موسیقی و صورت گری و علم نباتات

آج ہم صرف سائنس پر زور دے رہے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ اس طرح ادبار کے بادل چھٹ جائیں گے تو یہ ممکن نہیں۔ اس کا علاج وہی آب نشاط انگیز ہے جس کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا ہے آج بھی ہمارے ہاں سائنس پڑھے ہوئے لوگوں کی کمی نہیں ہر فن کے جاننے والے یہاں مل جاتے ہیں مگر سب کو شکایت ہے کہ ملک کی رفتار ترقی بہت سست ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل ہنر تو ہیں مگر اہل دل موجود نہیں ہیں۔ کتاب خواں تو ہیں مگر صاحب کتاب نہیں ملتے افرنگی صوفے ہیں، تن آسانی ہے مگر طبیعت نظر پسند نہیں اور روح بیدار نہیں ہم دولت کے انبار لگا کر تسکین حاصل کرنا چاہتے اور اقبال ہم کو دولت سے بے نیاز کر کے خطروں میں جینا سکھانا چاہتے ہیں۔ میدانوں میں خراماں خراماں چلنا چاہتے ہیں اور وہ ہمیں طوفانوں اور کوہساروں سے ٹکرانا چاہتا ہے۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

ہر مفکر اور فلسفی جو زندگی کے لئے ایک نظام تجویز کرتا ہے تعلیم اس کے اس نظام کا جزو اعظم ہوتی ہے کیونکہ تعلیم ہی کے ذریعے اس نظام کو نافذ کرنے والے کارندے پیدا کئے جا سکتے ہیں افلاطون نے اپنی جمہوریہ میں نظام تعلیم کا پورا ڈھانچہ تیار کیا ہے۔ کیونکہ اسی کے ذریعے اس کا فلسفی بادشاہ پیدا ہوتا ہے اقبال نے بھی مسلمانوں کو زندگی گذارنے کا نظام دیا ہے ان کا یہ نظام قرآن کے زریں اصولوں سے تیار ہوا ہے اور اس کا مرکزی نقطہ خودی ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ ان کا فلسفہ تعلیم بھی ان کے فلسفہ خودی کا ہی ایک حصہ ہے ان کے نزدیک بہترین نظام تعلیم وہی ہے جو خودی کی تکمیل کرے۔ عشق کی قوتوں کو سرگرم کار رہے۔ عمل پیہم کا درس دے، تخلیق مقاصد کا اہل بنائے اور شعاع آرزو کو تابندہ رکھے۔ اندیشہ

ہائے گوناگوں سے نجات دے اور یقین کی دولت سے مالا مال کرے روباہی کی بجائے حق گوئی اور بے باکی کا سبق پڑھائے مگر بے ادب نہ بنائے۔ جہاں متعلم کی امیدیں قلیل مگر مقاصد جلیل ہوں۔ وہ نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو کی تصویر ہو۔

طبیب عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا | ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی
علاج ضعف یقیں ان سے ہو نہیں سکتا | غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق
آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی | اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل | اگر عشق سے محکم تو صور اسرافیل!
اس کی امیدیں قلیل اسکے مقاصد جلیل | اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو | رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

ان صفات کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم بے ایمانی کو ترک کریں اور ایمان داری کو مشعل راہ بنائیں۔ اس کے بغیر ہماری قوم نہ علم و حکمت میں کمال حاصل کر سکتی ہے اور نہ اسے اقوام عالم میں باعزت مقام مل سکتا ہے۔ تعلیم کا فائدہ اسی وقت ہے جب وہ صالح نوجوان پیدا کرے۔ نان حرام تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کے لئے زہر ہلاہل ہے۔ اقبال مولانا روم سے پوچھتے ہیں:

علم و حکمت کا ملے کیوں کر سراغ!
کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ

اور وہ جواب دیتے ہیں۔

علم و حکمت زاید از نان حلال
عشق و رقت آید از نان حلال

اقبال کے تصور تعلیم کے مطابق جو نظام تعلیم ڈھالا جائے گا اس میں اس بات کا خاص

خیال رکھا جائے کہ بچے کی فطری صلاحیتوں کی نشوونما ہو اور وہ اپنے آپ کو پہچانے کہ خود شناسی ہی خودی کی پہلی منزل ہے۔

"استاد طالب علم کی صرف رہنمائی کرتا ہے طالب علم خود اپنی ذات کے پردوں کو ہٹاتا چلا جاتا ہے اور بالآخر ایک دن اس سے پوری طرح آشنا ہو جاتا ہے۔ سقراط نے کہا تھا۔" میں دوسروں سے اس لئے افضل ہوں کہ میں جانتا ہوں کہ میں جاہل ہوں اور وہ نہیں جانتے کہ وہ جاہل ہیں۔

طالب علم پر جبر کرنا، اسے اسباق رٹوانا اور ہمارے موجودہ طریقہ امتحان کے لئے تیار کرنا اس کی فطری صلاحیتوں کو ختم کر دیتا ہے۔ وہ خودی کے بلند بام پر چڑھنے کے قابل نہیں رہتا اور مادیت کی اتھاہ تاریکیوں میں کھو جاتا ہے۔ شروع ہی سے طالب علم کو عمل پیہم عادت ڈالنی چاہیے۔ کیونکہ اس سے وہ زندگی کے راز سے آگاہ ہوتا ہے۔

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی بے خبر راز دوام زندگی

گردش پیہم یا مسلسل عمل کے لئے ضروری ہے کہ طالب علم اپنے سامنے ایک مقصد رکھے اور اسے پورا کرنے کے بعد دوسرا مقصد پیدا کرے یعنی وہ تخلیق مقاصد کرتا رہے استاد اگر ایک دم اسے آخری زینے پر پہنچانا چاہے تو کبھی کامیاب نہ ہوگا۔ بچے یا لڑکے کے دل میں آرزو مکمل تڑپ پیدا کرنا استاد کا کام ہے کیونکہ

زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو صید مقاصد را کمند! — دفتر افعال را شیرازہ بند
ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم! — از شعاع آرزو تابندہ ایم!

اس کے بعد وہ خود بخود آگے بڑھتا چلا جانے گا۔ صرف گاہے بگاہے استاد اسے غلطیوں سے بچاتا رہے گا۔

آپ کہیں یہ تو ایک فلسفی کا خواب اور شاعر کی بڑ ہے ان افکار کی عملی تشکیل کی کوئی صورت نہیں چنانچہ میں مغرب کے ماہرین تعلیم کی تحریروں سے چند اقتباسات پیش کروں گا جنہوں نے عمل کو تعلیم کا اولین زینہ قرار دیا ہے انھوں نے ایسے مدرسے بھی بنائے ہیں جن کو مدرسہ عمل کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں بچے کو کتابی کیڑا بنانے کی بجائے کتاب فطرت کا مطالعہ کے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ ایسے مدرسے عام نہیں ہیں البتہ ان کی ضرورت پر زور دیا جا رہا ہے۔

ایم۔ اے جولین کہتا ہے۔

"بچہ خود اپنی کتاب ہے۔ وہ پڑھنے کی بجائے عمل کرتا ہے اور اس کے مشاہدات اور تجربات کی روح خود قدرت ہے قدرت کی لامحدود تجربہ گاہ میں وہ سبق پڑھتا ہے قدرت بیک وقت استاد بھی ہے اور مواد تعلیم بھی۔"

علامہ اقبال بھی قدرتی مناظر کے مطالعے پر زور دیتے ہیں کیونکہ فطرت کبھی جھوٹ نہیں بولتی اور وہ اپنے دامن میں بے شمار سچائیاں رکھتی ہے۔ کتابوں کے ذریعے غلامی کا درس دیا جا سکتا ہے مگر فطرت دھوکا نہیں دیتی وہ شاہینی صفات پیدا کر دیتی ہے۔

فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اور روسو کہتا ہے:

بچے کو کتاب نہ دو۔ صرف دنیا کی کتاب اسے پڑھنے دو، کوئی تعلیم نہ دو۔

صرف سچائیاں اور واقعات بتاؤ۔ جو بچہ پڑھتا ہے وہ سوچتا نہیں صرف پڑھ رہا ہوتا ہے جو کوئی واقفیت حاصل نہیں کر رہا بلکہ الفاظ یاد کر رہا ہے۔"

ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں لڑکے صرف الفاظ یاد کرتے ہیں کوئی واقفیت حاصل نہیں کرتے۔ وہ طوطے کی طرح رٹ کر امتحان پاس کر لیتے ہیں جو تعلیم کے اصل مقاصد کے خلاف ہے اقبال نے تعلیم کے اس رجحان پر نکتہ چینی کی ہے کیونکہ روسو "لفظ مارتا ہے روح روشنی دیتی ہے۔" ڈاکٹر دیوی مانڈرات کے قول کے مطابق پیہم اور منظم مصروفیت تعلیم کی اصلی بنیاد ہے۔ ایم اے جولین کے نزدیک "قدرتی قابلیتوں اور قوتوں اور ہر بچے کی انفرادی شخصیت کی تکمیل کی آزادی" بے حد ضروری ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ استاد کو بچے کی دماغی کمزوری بھی ہمارے معیار کے مطابق ہے۔ سے مایوس نہ ہونا چاہئے۔ اسے دیکھنا چاہئے کہ وہ صاحب دل ہے یا نہیں کیونکہ الفاظ کو رٹنے والا دماغ حقیقی کامیابی کا ضامن نہیں ہو سکتا۔

ترا نومید از طفلاں روا نیست چہ پروا گر دماغ شاں رسا نیست
بگوائے شیخ مکتب گر بدانی! کہ دل در سینہ شاں ہست یا نیست

روسو کہتا ہے۔ "امیل کی واقفیت زیادہ نہیں لیکن جو بھی اس کی اپنی حاصل کردہ ہے ...... وہ واقفیت نہیں بلکہ واقفیت حاصل کرنے کی قابلیت میں وسیع القلب ہے اور جیسا کہ مونٹین کہتا ہے کہ اگرچہ وہ وسیع استعداد نہیں رکھتا لیکن پڑھنے کی قابلیت رکھتا ہے۔" ڈاکٹر اولف خیربر کا خیال ہے کہ اخلاقی تعلیم بھی عمل کے ذریعے دی جاتی ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں "تعلیم میں ہمیشہ آنکھ کی تیزی، ہاتھ کی چستی اور قوت ایجاد کو وسعت دی جاتی ہے۔"

اقبال بھی اپنے بچوں کو شاہین بنانا چاہتا ہے جو عمل کا پیکر، آنکھ کا تیز اور استغنا کی مثال ہے وہ عمل اور یقین کی دولت سے انھیں مالامال کر کے خودی کا سبق پڑھاتا ہے۔ چنانچہ اقبال کا تعلیم یافتہ نوجوان مردِ مومن کی مثال بن جاتا ہے جو عقل کی انتہا اور عشق کا حاصل ہوتا ہے۔

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقہ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

اور پھر وہ جو کچھ تخلیق کرتا ہے وہ غیر فانی بن جاتا ہے کیونکہ:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

مگر اہل کلیسا نے جو نظام تعلیم ہم کو دیا وہ دین و ہنر کی موت اور عشق و محبت کا قاتل ہے ؎

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم ایک سازش ہے دین و مروت کے خلاف
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

اس وقت آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہوگا کہ علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر اور دوسرے حضرات بھی اسی تعلیم کے پروردہ تھے مگر آپ یہ بھول رہے ہیں کہ ان کا رشتہ کسی نہ کسی اپنی روایات اور اسلامی تعلیمات سے قائم رہتا ہے اور اگر جوہر میں لا اللہ کی روشنی موجود ہو تو فرنگیانہ تعلیم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتی۔ اس کے گھر کی تعلیم بھی اس پر اثر کرتی ہے اور بعض اوقات والدین کا دیا ہوا سبق اہل مدرسہ کی تعلیم پر غالب آجاتا ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ علامہ اقبال جاوید سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو | ہے اس کا مذاق عارفانہ
جوہر میں ہو لاالٰہ تو کیا خوف | تعلیم ہو گو فرنگیانہ

اقبال انسان کی تربیت کے لئے عقل کے ساتھ وجدان کو ضروری سمجھتے ہیں وجدان عشق سے عطا ہوتا ہے اور عشق کے بغیر کوئی چیز مکمل نہیں۔ وہ عشق کو عقل کا رہنما بنانا چاہتے ہیں۔

عقل تا از عشق برخوردار نیست!
جز تماشہ خانۂ افکار نیست!

عقل اور عشق ایک دوسرے کے معاون ہوں تو انسان کی تکمیل ہوتی ہے عشق کا کام زیرکی سے مستحکم ہو جاتا ہے۔

زیرکی از عشق گردد حق شناس | کار عشق از زیرکی محکم اساس
خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل | اگر عشق سے محکم تو صور اسرافیل

علم اور عشق ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ ایک ہی ساز کی مختلف آوازیں اس لئے ان کو مدرسوں میں بھی ساتھ ساتھ ہی رہنا چاہئے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ روحانیات کی تعلیم ممکن نہیں ہے اگر مدرسوں میں وجدان اور روحانیات کو بھی اہمیت دی جائے تو دنیا کا نقشہ بدل جائے اور وہ ایسے انسان پیدا کریں جن پر زمانہ فخر کرتا ہے کہ مغرب کے ماہرین تعلیم بھی اس کی ضرورت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں سائنسی ترقی کی امریکی ایسوسی ایشن کے صدر جیروم ایس۔ برونر رقم طراز ہیں۔

"ہمیں مان لینا چاہئے کہ فکر وجدانی اور فکر تحلیلی کا باہمی تعاون ضروری ہے۔ فکر وجدانی کے ذریعے مسائل کے ایسے حل دریافت ہو جاتے ہیں جو

"دوسری طرح یا تو دیر میں دریافت ہوتے ہیں یا ہوتے ہی نہیں البتہ تاریخ کو پرکھنے کے لئے ضروری ہے کہ فکر تحلیلی سے کام لیا جائے گا۔ (بشرطیکہ یہ ممکن ہو) ...... بدنصیبی یہ ہے کہ مدرسوں میں تعلیم کا نظام ہی ایسا ہے کہ وجدان کو کم اہمیت دی جاتی ہے ...... یہ بات بہت ضروری ہے کہ طلبا وجدانی کو کم اہمیت دی جاتی ہے ...... یہ بات بہت ضروری ہے کہ طلبا وجدانی سطح پر کسی مخصوص علم سے آگاہی حاصل کریں اور پھر اس کے بعد روایتی انداز اور اصلاحی انداز میں استخراج اور اثبات کے طریقوں سے کام لیا جائے ...... سائنس دان ان رفقائے کار کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ جو وجدان کی سطح پر کام کرتے ہیں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سائنس میں وجدان بہت موثر ہے اور طلباء کو بھی اس سے بہرہ یاب کرنا چاہئے۔ فنون اور علوم معاشرتی کے دائرے میں بھی وجدان کی ضرورت ہے"[1]۔

اس امریکی سائنسدان کا خیال اقبال سے کس قدر قریب ہے اقبال نے بھی عشق اور عقل کے لئے دانش نورانی اور دانش برہانی (فکر وجدانی اور فکر تحلیلی جیسا کہ برونر صاحب نے کہا ہے) کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اور وہ بھی دانش نورانی کو ہی حقیقت کے پانے کا ذریعہ گردانا کرتے ہیں ؎

اک دانش نورانی اک دانش برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

---

[1] تعلیم کا عمل از جیروم۔ ایس برونر۔ ترجمہ سید عابد علی عابد

اقبال نے علم وعقل اور عشق کے تعلق پر جو کچھ کہا ہے اس کا تفصیلی ذکر ہم "تصورِ عشق" کے تحت کر چکے ہیں یہاں اس قدر کہنا کافی ہے کہ وہ علم کو وجدان کے ذریعے حاصل کرنے کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ علم عشق کا مددگار ہو نہ کہ ابلیسی قوتوں کا۔ ان کا نظریۂ تعلیم مولانا روم کے اس شعر سے واضح ہے۔

علم را بر تن زنی مارے بود

علم را بر دل زنی یارے بود

علامہ اقبال اگرچہ عورتوں کی تعلیم کے مخالف نہیں ہیں لیکن وہ ان کو ایسی تعلیم دینا چاہتے ہیں جو ان کے صنفی تقاضوں کو پورا کرے تاکہ وہ اپنے مخصوص فرائض ادا کر سکیں اور ان فرائض میں سے امومت کا فرض سب سے اہم ہے کیونکہ مرد کی تعلیم صرف اس کے لئے ہے مگر عورت کو دی گئی تعلیم سارے خاندان کے کام آتی ہے عورت کی تعلیم

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت ۔۔۔ ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن ۔۔۔ کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

اب مغربی مفکرین بھی اقبال کے اس نظریہ کو اپنا تے جا رہے ہیں اور تعلیم کا نظام مرتب کرتے ہوئے اس امر کی طرف خاص توجہ دے رہے ہیں کہ عورت اپنے صنفی فرائض اچھی طرح ادا کر سکے۔ ڈاکٹر اولف فیر اپنی کتاب "مدرسہ عمل" میں لکھتے ہیں۔

"لڑکیاں صرف سینا پرونا، کپڑے دھونا اور مرمت ہی نہیں کرتیں بلکہ انھیں ایک فرض شناس شفیق ماں بننے کے فرائض بھی سکھائے جاتے ہیں۔ وہ ماؤں کی طرح بہت چھوٹی بچیوں کی پرورش اور ہر روز ان کی ضروریات کی نگہبانی کرتی ہیں۔"

اگر مائیں اپنے بچوں کی تربیت عمدہ طریقے سے کریں تو ان کے جسم تندرست.....
..... اور دماغ رسا ہوں گے۔ ماں بچوں پر ہر پہلو سے اثرانداز ہوتی ہے اور یہ بچے ہی قوم کے دولت ہیں اور آئندہ قوم کی تعمیر انھیں سے ہوتی ہے اگر وہ شروع ہی میں بچے کو لا الٰہ کا پرستار بنا دیں۔ قرآن پر اس کا یقین پختہ کر دیں انھیں احترام آدمی کا سبق پڑھا دیں اور با عمل بنا دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ قوم سربلند نہ ہو اسی لئے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر! نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مال او فرزند ہائے تندرست تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست
حافظ رمز اخوت مادراں قوت قرآن و ملت مادراں

میں نے مختصر طور پر ان عناصر کی نشاندہی کر دی ہے جن سے علامہ اقبال کا تصور تعلیم تعمیر ہوا ہے۔ اقبال تصور پاکستان کے خالق بھی تھے انھوں نے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مملکت کا خواب دیکھا۔ اور ساتھ ہی اس مملکت کی بنیاد جس فلسفے پر رکھی جاتی تھی وہ بھی بیان کر دیا۔ پاکستان ہمیں مل گیا مگر ہم ان نظریات سے کوسوں دور ہیں جن کو اقبال نے اس اسلامی مملکت کی اساس قرار دیا تھا۔ ان نظریات کا ایک حصہ تعلیمی افکار پر مشتمل ہے آپ خود غور کریں کہ ہمارا موجودہ نظام تعلیم اور وہ تعلیمی ڈھانچہ جس کا تصور علامہ اقبال نے پیش کیا ہے کہاں تک ہم آہنگ ہیں موجودہ نظام تعلیم کی بنیاد انگریز نے رکھی تھی اور اسی پر ہم عمارت تعمیر کر رہے ہیں ظاہر ہے کہ یہ عمارت ہمارے لئے عاقبت کا نشان نہیں بن سکتی۔

تصوّرِ ابلیس

مزے اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد!

اقبال کا تصورِ ابلیس بھی ان کے فلسفۂ زندگی سے ہم آہنگ ہے اور اسی روشنی میں انھوں نے اس کا مقام متعین کیا ہے اس سلسلے میں انھوں نے عام لوگوں کے خیالات کی پروا نہیں کی۔ عام لوگ ابلیس کو ناکارہ اور راندۂ درگاہ سمجھتے ہیں اور اس کے سائے سے بھی بھاگتے ہیں۔ ان کو ابلیس کی ذات میں کوئی کشش نظر نہیں آتی۔ ان کے نزدیک وہ سراپا لعنت ہے۔ مگر اقبال کو ابلیس کی ذات میں عظمت کے پہلو بھی نظر آئے ہیں۔ اور ان کا شاعر دل اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ شاید اسی لئے گوئٹے نے کہا تھا "ہر شاعر کا تھوڑا بہت بے دین ہونا ضروری ہے۔" خود گوئٹے نے ابلیس کی قوت کو محسوس کیا اور "فاوسٹ" کا شیطان عمل و حرکت کا نمونہ بن گیا ہے اس کے مقابلے میں انسان کے پاس تحمل کی قوت ہی مگر وہ شیطان کا دامن پکڑ کر عمل کے میدان میں اتر آتا ہے اور وہ دنیا کی تسخیر کے لئے شیطان سے مدد مانگتا ہے جب اس کا دستِ عمل سو جاتا ہے

توشیطان اسے حسین لگتا ہے ڈاکٹر عابد حسین ”فاؤسٹ“ کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

شیطان سراپا عمل ہے کبھی تھک کے بیٹھا نہیں وہ انسان کو سکھاتا ہے کہ نشیب و فراز کا اعلیٰ تجربہ حاصل کرکے مادی لذتوں سے آشنا ہو اس کے خلاف انسان کی اپنی فطرت یہ ہے کہ نظام ہستی کا منشا معلوم کرکے اس طرح کائنات کی حقیقت کو سمجھے اور اس سے اتحاد پیدا کرے۔ یہ فطرت انسان کے دل میں بلند اور برتر آرزوئیں پیدا کرتی ہے مگر راہ عمل نہیں دکھاتی۔ دوسری اسے ذوق عمل سے آشنا کرتی ہے مگر اس کے ساتھ خودی اور لذت پرستی میں مبتلا کر دیتی ہے پہلی قوت کا نمائندہ فاوسٹ ہے اور دوسری کا شیطان۔ انسان کامل کے لئے دونوں کے امتزاج کی ضرورت ہے۔“ خود اقبال نے پیام مشرق کی نظم ”جلال اور گوئٹے“ میں مولانا رومی کی زبان سے فاوسٹ پر تبصرہ کیا ہے بہشت میں رومی اور گوئٹے کی ملاقات ہوتی ہے۔ رومی کہتا ہے۔

نکتہ دان المنی راہ ارم !	صحبتے افتاد با پیر عجم
شاعرے کو ہمچو آن عالی جناب	نیست پیغمبر و لے دارد کتاب
خواند بر دانائے اسرار قدیم!	قصہ پیمان ابلیس و حکیم !
گفت رومیؒ اے سخن را جاں نگار	تو ملک صید استی و یزداں شکار
فکر تو در کنج دل خلوت گزید!	این جہاں کہنہ را باز آفرید!
سوز و ساز جاں بہ پیکر دیدہ !	در صدف تعمیر گوہر دیدہ !
ہر کسے از رمز عشق آگاہ نیست	ہر کسے شایان این درگاہ نیست

داند آں کو نیک بخت و محرم است
زیر کی ز ابلیس و عشق از آدم است

چونکہ گوئٹے نے انسان کے امکانی نشوونما کی داستان اس قصے میں سنائی ہے اس لئے اقبال نے اس کو خراج عقیدت پیش کیا ہے آخری شعر میں رومی کی زبان سے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ فاوسٹ یا آدمی عشق کا پرستار ہے اور ابلیس تو عقل کا پتلا ہے۔ یوں انسان ابلیس سے بلند تر ٹھہرتا ہے۔ اقبال کا تصور ابلیس گوئٹے کے بہت قریب ہے۔ ان کا انسان بھی گوئٹے کے فاوسٹ کی طرح قرار کو اپنے لئے موت سمجھتا ہے۔ گوئٹے کے فاوسٹ نے شیطان سے کہا تھا۔ اگر وہ کسی ایسے مقام پر لے جائے یا کوئی ایسی چیز دکھا دے کہ وہ کہہ دے کاش یہ لمحہ جاوداں ہو جائے تو فاوسٹ شرط ہار جائے گا۔ اقبال بھی کہتے ہیں کہ انسان کی فطرت کو قرار نہیں اور جب بھی اس نے ایک جگہ رک کر کہا کہ یہی اس کی منزل ہے تو موت سے ہم کنار ہو جائے گا۔

چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام در نہ سازد ۔۔۔ دل ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئے ۔۔۔ تپد آں زماں دل من پئے خوبتر نگارے

ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے ۔۔۔ سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

اقبال ابلیس کو عقل کا نمائندہ قرار دیتے ہیں وہ اپنی نظم تسخیر فطرت میں خدا کے سامنے انسان کی یہ عذر خواہی پیش کرتے ہیں کہ فطرت کی تسخیر کے لئے اور ابلیس سے سجدہ کروانے کے لئے اسے ابلیس کا ہتھیار (عقل) استعمال کرنا پڑا۔

تا شود از آہ گرمم ایں بت سنگیں گداز! ۔۔۔ بستن زنار او بود مرا نا گزیر

عقل بہ دام آورد فطرت چالاک را ۔۔۔ اہرمن شعلہ زاد سجدہ کند خاک را

مگر اقبال کا مرد مومن گوئٹے کی طرح ابلیس سے معاہدہ نہیں کرتا کہ وہ اسے ذوق عمل سے آشنا کرے تو وہ اس کو اپنی زندگی دے دے گا بلکہ وہ ابلیس کی حرارت یعنی عقل کو

بھی ہتھیا لیتا ہے اور عشق کے ساتھ اس کی آمیزش کر کے ابلیس کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے

اقبال ابلیس کی عقل سے زیادہ اس کی قوت اور زورِ بازو کو سراہتے ہیں، اقبال نے قوت اور طاقت کو ہمیشہ پسند کیا ہے۔ وہ کوہکن کے زورِ بازو کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ دنیا کو جنت کا نمونہ بنانے کے لئے تیشۂ فرہاد کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پرویز کا جلال بھی قابلِ قدر ہے۔ انھوں نے مسولینی کی تعریف بھی اسی نقطۂ نظر سے کی ہے اور اشتراکیت پسندیدگی کا بھی یہی پہلو ہے کہ اس نے مملوکوں میں شاہیں سے ٹکرانے کی قوت پیدا کی اور غلاموں نے آقاؤں کے خیموں کی طنابیں کاٹ ڈالیں۔ نپولین اور تیمور کا سیلِ ہمہ گیر بھی اسی لئے تعریف کا مستحق ٹھہرا ہے اقبال کو جہاں کہیں قوت کا جلوہ نظر آیا انھوں نے اس کی ثنا خوانی کی ہے۔ کیونکہ قوت کے بغیر انسان تسخیرِ کائنات کے منصوبے پر عمل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ مسلمان کی تعمیر میں صرف ہونے والے چار عناصر میں سے دو قہاری اور جبروت ہیں۔ جو قوت اور طاقت کا پیکر ہے۔ اس کی ایک ہو، کلیسا کے شیوخ اور امامانِ سیاست کو دیوانہ بنا سکتی ہے۔ زمین مہر و ماہ اور آسمان سب اس کے تصرف میں ہیں۔ "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں ابلیس اپنی طاقت کا اعلان یوں کرتا ہے۔

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو   کیا زمیں کیا مہر کیا آسمان تو بہ تو
دیکھ لیں اپنی آنکھوں سے تماشہ شرق و غرب   میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست کیا کلیسا کے شیوخ!   سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو

اور پیامِ مشرق" کی نظم "تسخیرِ فطرت" میں ابلیس خدا سے اپنی برتری کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت   یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

می تپد از سوز من خون رگ کائنات — من بہ دو صرصرم من بہ غو تندرم!

رابطۂ سالمات، ضابطۂ امہات — سوزم و سازم دہم، آتش مینا گرم

پیکر انجم ز تو گردش انجم ز من! — جاں بجہاں اندرم، زندگی مضمرم

تو بہ بدن جاں دہی شور بجاں من دہم — تو بہ سکوں رہ زنی، من بہ تپش رہبرم

من ز تنک مائیگاں گدا نہ کردم سجود — قاہر بے دوزخم، داور بے محشرم

ان اشعار میں ابلیس نے اپنی قوت سے مقابلہ خدا کی قوت سے کیا ہے اور وہ کسی طرح اپنے آپ کو خدا سے کم تر خیال نہیں کرتا - وہ کہتا ہے کہ کائنات کی رگوں میں میرے سوز سے تپش ہے - میں تند و تیز ہواؤں اور دریاؤں میں ہوں - جوہر (ایٹم) کی تب و تاب کا باعث ہوں - تو نے ستارے بنائے تو میں نے ان کو گردش دی، تو نے بدن کو جان دی تو میں نے جان میں ہنگامہ پیدا کیا تو سکون کے راستے پر چلاتا ہے - تو میں آگ کی طرف لے جاتا ہوں - میں تیری طرح کم تر اور ذلیل ہستی (انسان) سے سجدہ کا خواہش مند نہیں - میں بھی قاہر ہوں مگر دوزخ کے بغیر اور تیری طرح داور ہوں مگر محشر کے بغیر - چنانچہ اسی لئے شیطان انسان کو سجدہ کرنے سے انکار کرتا ہے ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال نے انسان اور خدا کے درمیان بھی ایسا ہی مقابلہ کرایا ہے - جہاں انسان کسی طرح اپنے آپ کو خدا سے کم تر نہیں سمجھتا - وہ خدا سے کہتا ہے کہ تو نے رات پیدا کی تو میں نے اسے روشن کرنے کے لئے چراغ بنایا تو نے مٹی پیدا کی تو میں نے اس سے پیالا بنا دیا - تو نے بیابان، کوہسار اور جنگل پیدا کئے تو میں نے ان کے مقابلے میں خیابان، گلزار اور باغ تیار کئے تو نے پتھر بنایا تو میں نے اس میں سے آئینہ تیار کر لیا، تو نے زہر پیدا کیا تو میں نے میٹھا شربت تیار کیا سو یہاں بھی خدا کے مقابلے میں انسان کی بنائی ہوئی چیزوں میں زیادہ دلکشی دکھائی

گئی ہے۔ مگر ذکر ہو رہا تھا شیطان کی قوت اور طاقت کا۔ بال جبریل میں "ابلیس اور جبریل" کے عنوان سے ایک نظم ہے اس میں ابلیس جبریل سے اپنا مقابلہ یوں کرتا ہے۔

میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح

تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو !!

یہ نظم پوری طرح پڑھ جائیے اس میں ابلیس کے مقابلے میں جبریل بڑی کمتر ہستی دکھائی دیتا ہے۔ اقبال ابلیس کے مقابلے میں جبریل کو اہمیت نہیں دیتے اس کی وجہ یہ ہے کہ جبریل جلال نہیں ہے اور دوسرے کے ارادے کا پابند ہے اس کی ذات سوز و مستی سے کوسوں دور ہے وہ تن آسان ہے اور تن آسانی پسندیدہ نہیں ہو سکتی۔

نہ کر تقلید اے جبریل میرے سوز و مستی کی

تن آسان عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

بگو جبریل را از من پیامے — مرا این پیکر نوری نہ دادند

دلے تاب و تب این خاکیاں بیں — بنوری ذوق مهجوری نہ دادند

اقبال کا ابلیس قوت و شوکت میں ملٹن کے ابلیس سے کسی طرح کم نہیں ہے ملٹن کا ابلیس بھی جاہ و جلال اور قوت و شوکت کا سرچشمہ ہے وہ جب اٹھتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ طوفان آگئے ہیں! ور جب چلتا ہے تو زمین و آسمان تھراتے ہیں۔ وہ خدا کی بے پناہ قوت کے مقابلے میں ڈٹا رہتا ہے اس کے نزدیک کی غلامی سے دوزخ کی حکمرانی بہتر ہے۔ "اقبال کا ابلیس بھی دل یزداں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا ہے۔ اگر ابلیس اپنی طاقت اور شان و شوکت کھو دے تو اقبال کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ رہے۔ وہ صرف

لہ محاورہ مابین خدا و انسان (پیام مشرق)

اس ابلیس کو جانتے ہیں جو خدا سے ہم کلام ہوا تھا اور جو یہ کہہ سکتا ہے کہ

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا

میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو

ایسے ابلیس سے لڑائی میں اگر انسان ہار بھی جائے تو کوئی پروا نہیں۔ کم از کم یہ تو ہے کہ حریف کمزور و ناتواں نہیں ہے۔ اصیل وہ ہے جو ابلیس خاکی سے جو کمتر درجہ کا مالک ہے شکست نہ کھائے بلکہ ابلیس نوری کو مقابلے کے لئے پکارے خاکی ابلیس تو اصل ابلیس کے مقابلے میں پرکاہ کی وقعت بھی نہیں رکھتے اس لئے ان کا شکار ہونے ہی میں بڑی ذلت ہے اقبال نے ان خیالات کا اظہار ان اشعار میں کیا ہے۔

گنہ ہم می شود بے لذت و سرور | اگر ابلیس تو خاکی نہاد است

اصیلاں را ہماں ابلیس خوشتر | کہ یزداں دیدہ و کامل عیار است

حریف ضرب او مرد تمام است | کہ آں آتش نسب والا مقام است

نہ ہر خاکی سزاوار رخ اوست | کہ صید لاغرے بر وے حرام است

اس آخری رباعی میں ابلیس کی عظمت یہ بتائی گئی ہے کہ اس کو لاغر شکار پسند نہیں گوئٹے کا شیطان بھی اسی طرح عام انسانوں کا شکار کھیلنا پسند نہیں کرتا اسے زندگی کے گرم اور رنگین خون سے دلچسپی ہے گوئٹے کا ابلیس اپنا تعارف یوں کرواتا ہے۔ "وہ قوت جو ہمیشہ برائی چاہتی اور نیکی پر عمل کرتی ہے" اقبال بھی ابلیس کی قوت کو نیکی کی پیداوار کا ذریعہ بتاتے ہیں۔ اگر ابلیس انسان کی راہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں پیدا نہ کرے تو انسان اپنی خودی کی تکمیل نہ کر سکے۔ اقبال کے خیال میں آدم کو جنت سے اس لئے نکالا گیا تھا کہ وہاں اس کی خودی کی پرورش مناسب طور پر نہ ہو سکتی۔ شر کی قوتیں خودی کی تکمیل میں مددگار

ثابت ہوتی ہیں۔ یاد رہے کہ اقبال کے نزدیک آدم کا جنت سے دنیا میں آنا بطور سزا کے نہیں ہے۔

اقبال کو ابلیس کی ایک صفت جو بہت پسند ہے وہ اس کا ہر وقت حالت فراق میں رہنا ہے اقبال خود وصل سے فراق کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں! اور ابلیس کو تو انھوں نے "خواجہ اہل فراق" کا خطاب دیا ہے۔ ہر وقت تمنا اور جستجو کی آگ میں جلتے رہنا اور سوز و ساز اور درد و داغ کی تصویر نظر آنا اقبال کو بھا گیا ہے۔ ابلیس کو اپنے مقصد سے عشق ہے اور وہ اس کے حصول کے لئے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ وہ خدا کا مدمقابل ہے اور ہر وقت اپنی برتری جتانے کے لئے سعی پیہم اور کوشش ناتمام کرتا ہے۔ اقبال کو اس کی یہ ادا پسند آگئی ہے اور اس نے جاوید نامے میں اسے فلک مشتری پر حلاج، غالب اور قرۃ العین کے ساتھ جگہ دی ہے اس کے برعکس دانتے نے نہ صرف اسے فلک مشتری پر بٹھایا ہے بلکہ وہ اس سے سبق بھی سیکھنا چاہتے ہیں۔ رومی اقبال سے شیطان کا تعارف یوں کرواتے ہیں۔

اندکے در واردات او نگر ! مشکلات او ثبات او نگر

غرق اندر رزم خیر و شر ہنوز صد پیمبر دیدہ و کافر ہنوز!

اور پھر کہتے ہیں کہ ابلیس کی طرح تقلید کے پیراہن کو چاک کر دو تاکہ اس سے توحید سیکھ سکو۔

چاک کن پیراہن تقلید را
تا بیاموزی ازو توحید را

ابلیس جستجو اور آرزو کا پیکر ہے اور اقبال کا فلسفہ زندگی بھی درد و داغ و سوز و ساز و آرزو سے وجود میں آتا ہے ابلیس ایک عاشق کی طرح ہمیشہ حالت فراق میں رہ کر

تگ و دو کرتا رہتا ہے۔ اس لئے اقبال نے اسے اس درجہ بلند مقام عطا کیا کہ اس زبان سے زندگی کے رموز بیان کئے ہیں۔ "تسخیر فطرت" میں شیطان حیات دوام کو سوختن ناتمام کہتا ہے دیتا ہے

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیات؟ سوختن ناتمام

اور یہی اقبال کا بھی نظریہ ہے وہ ایک جگہ کہتے ہیں

زار حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے　　زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

یہی نہیں اس نظم میں شیطان آدم کو جن باتوں کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ ساری کی ساری اقبال کے فلسفہ زندگی سے ہم آہنگ ہیں۔ وہ آدم کو بتاتا ہے کہ زندگی سکون دوام نہیں بلکہ سوز و ساز سے عبارت ہے۔ وہ اسے نشاط عمل اور لذت کردار سے آگاہ کرتا ہے[۱] وہ آدم کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ آشیانے میں زندگی گزار دینا باز کے لئے موت کا درجہ رکھتا ہے۔ آخر میں اس کی تان اسی شعر پر ٹوٹتی ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں اس سارے بیان میں ایک نفسیاتی نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ شیطان کی مخالفت کی وجہ سے ہی انسان ذوق عمل سے آشنا ہوتا۔ اور باز کی زندگی بسر کرتا ہے۔

زندگی سوز و ساز بہ ز سکون دوام　　فاختہ شاہیں شود از تپش زیر دام
ہیچ نیاید ز تو غیر سجود نیاز　　خیز چو سرو بلند اے بعمل نرم گام

---

[۱] یہ بات غور طلب ہے کہ صوفیا نے انسان کو قطرے سے اور خدا کو سمندر سے تشبیہہ دی تھی۔ اقبال نے خدا کے لئے تو وہی تشبیہہ اختیار کی مگر انسان کو قطرے کی بجائے تابندہ گوہر بنا دیا۔ (ملاحظہ ہو فلسفہ بیخودی)

کوثر و تسنیم برد از تو نشاط عمل — گیر ز مینائے تاک بادۂ آئینہ فام
زشت و نکو زادۂ وہم خداوند تست — لذت کردار گیر گام بنہ جوئے کام
خیز کہ بنمائمت مملکت تازہ! — چشم جہاں بیں کشا بہر تماشا خرام
قطرۂ بے مایہ گوہر تابندہ شو! — از سر گردوں بیفت گیر بدریا مقام
تیغ درخشندہ جان جہانے گسل — جوہر خود را نما آئے بروں از نیام
بازوئے شاہیں کشا خون تذروان بریز — مرگ بود باز را زیستن اندر کنام

تو شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیات دوام؟ سوختن ناتمام

اور جب جبریل ابلیس سے سوال کرتا ہے کہ "اے ہمدم دیرینہ کیسا ہے جہان رنگ و بو" تو ابلیس کا جواب اقبال کے نظریہ حیات کے عین مطابق ہے یعنی

سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو!

یہ تو ابلیس نے زندگی کی حقیقت بیان کی تھی۔ اب دیکھئے اقبال بھی اپنی زبان سے یہی کچھ کہتے ہیں۔

چیست جان؟ جذب و سرور و سوز و درد
ذوق تسخیر سپہر گرد گرد!!

چنانچہ اقبال ابلیس کو اپنا رفیق بنا لینا چاہتے ہیں۔ ابلیس اور آدم کا درد بھی مشترک ہے اور جرم بھی ایک سا تھا۔ اقبال خدا کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ ہمارا جرم دانہ کھا لینا تھا اور ابلیس کا جرم سجدہ نہ کرنا۔ تیری نہ اس بیچارے سے بنی اور نہ تو نے ہمارے ساتھ اچھا سلوک کیا حالانکہ دونوں کی نافرمانی ہی آزادی کی طرف ان کا پہلا قدم ہے۔

جرم ماز دانہ تقصیر اور سجدہ!

نہ باؤ بےچارہ می سازی نہ باما ساختی

انھوں نے ابلیس کے لئے بےچارہ کا لفظ استعمال کر کے اس مظلوم ٹھہرایا اور اس کیساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ اور خدا کو دونوں کیساتھ برا سلوک کرنے والا قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ ابلیس کو اپنا رفیق کار بنا لینا چاہتے ہیں۔ وہ اسے کہتے ہیں کہ آؤ دونوں مل کر اس دنیا کو بہشت بنا دیں تاکہ یہ افسوس نہ رہے کہ ہم کو بہشت سے نکالا گیا ہے یہ ایک طرح سے خدا کو چیلنج بھی ہے کہ تو نے ہمیں جنت سے نکالا تو ہم نے اسی دنیا میں اپنی جنت تعمیر کر لی۔

بیا تا طرح راشاہانہ بازیم   جہان چارسو را درگدازیم

بافسون ہنر از برگ کاہش   بہشتے ایں سوئے گردوں بسازیم

بھی نہیں بلکہ اقبال ایسی بہشت میں رہنا پسند نہیں کرتے جہاں صرف خدا ہو۔ اور شیطان نہ ہو۔ کیونکہ قصہ آدم کی تمام ترنگینی ابلیس کی ذات ہے اگر وہ نہ ہو تو زندگی کی دلکشی ختم ہو جائے۔ ایسی جنت جو ابلیس کے بغیر ہو وہ جہاں کور ذوقے ہے۔

مرے اندر جہان کور ذوقے!

کہ یزداں دارد شیطاں نہ دارد!

اسی طرح اقبال کے ابلیس کو بھی الشان سے محبت معلوم ہوتی ہے جب جبرئیل ابلیس سے کہتا ہے کہ وہ اپنے چاک دامن کو رفو کرے اور خدا سے معافی مانگ کر پھر فرشتوں کی صف میں داخل ہو جائے اور ان مقامات بلند کو حاصل کرلے جن کو اس نے انکار سے کھو دیا تھا تو ابلیس اس کی اس تجویز کو رد کر دیتا ہے کیونکہ عالم بالا اتنا خاموش ہے کہ ابلیس اس کی خاموشی برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ تو آدم کے ساتھ زندگی کے ہنگاموں میں پھنسا

رہنا چاہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی نومیدی ہی سوز درون کائنات کا باعث ہے۔

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو
اب یہاں میری گذر ممکن نہیں ممکن نہیں
جس کی نومیدی سے ہے سوز درون کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا

ابلیس اس عالم بے کاخ و کو کو اس لئے پسند نہیں کرتا کہ اس میں بہشت کی سی عافیت ہے زندگی کے ہنگامے نہیں۔ پھر جب وہ اپنی خدا سے ناامیدی کو اس لئے قائم رکھنا چاہتا ہے کہ اس دنیا کی رونق برقرار رہے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ آدم کی خاطر اتنی بڑی قربانی دے رہا ہے اس نے اپنے لہو سے آدم کے قصے میں رنگ بھرا ہے وہ جبریل کو مشورہ دیتا ہے کہ

گر کبھی فرصت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصہ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو!

ایک جگہ اور ابلیس نے واضح طور پر کہا ہے کہ وہ خدا کا منکر نہیں ہے کیونکہ اس

۱؎ اقبال بھی اس عالم بے کاخ و کو میں جانا پسند نہیں کرتے کیونکہ وہاں خاموشی ہی خاموشی ہے اور وہ نالہ ہائے نیم شب سے خالی ہے وہ انسان کی نمائندگی کرتے ہوئے انسان سے کہتے ہیں: ترا ایں کشمکش اندر طلب نیست — ترا ایں درد و داغ تاب و تب نیست
ازاں از لامکاں بہ گریختم من — کہ آں جا نالہ ہائے نیم شب نیست
کیونکہ درد و داغ تاب و تب کی صفت خدا میں نہیں مگر ابلیس میں پائی جاتی ہے اس لئے وہ انسان سے قریب معلوم ہونے لگتا ہے۔

نے خدا کو دیکھا ہے اور خدا کو دیکھ لینے کے بعد اس کا انکار نا ممکن ہے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی نہیں میں ہاں پوشیدہ تھی تو پھر اس نے خدا کی بات کیوں نہ مانی؟ ابلیس کہتا ہے کہ اس نے تمام سختیاں اور خدائی قہر آدم کی خاطر برداشت کیا ہے۔

از وجود حق مرا منکر مگیر — دیدہ بر باطن کشا ظاہر مگیر
گر بگویم نیست این از ابلہی ست — زانکہ بعد از دید نتوان گفت نیست
من بلے در پردہ لا گفتہ ام — گفتہ من خوشتر از نا گفتہ ام
تا نصیب از درد آدم داشتم — قہر یار از بہر او نگذ اشتم

ابلیس شر کی قوتوں کا نمائندہ ہے مگر شر بھی زندگی کا ایک حصہ ہے اس کے بغیر زندگی مکمل نہیں۔ ہم اس شر کو شر ناگزیر کہہ سکتے ہیں مسلسل عمل کے لئے ضروری ہے کہ انسان شر کی قوتوں سے برسر پیکار رہے اگر شر ختم ہو جائے تو حرکت ختم ہو جائے۔ ہر طرف سکون ہی سکون ہو اور سکون اقبال کے نزدیک موت کی علامت ہے۔ شر انسانی عمل کے لئے تحریک پیدا کرتا ہے۔ اقبال نے زندگی کی حقیقت یوں بیان کی ہے۔

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

یہاں زندگی کے لئے تین چیزوں کو ضروری قرار دیا گیا ہے جوئے شیر مقصد ہے اس کے حصول کے لئے تیشہ کی ضرورت پڑتی ہے اور مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سنگ گراں کو ہٹانا ضروری ہے جو راستے میں حائل ہے سنگ گراں سے مراد شر کی قوتیں ہیں۔ جن سے برسر پیکار ہوئے بغیر انسان اپنی منزل کو نہیں پا سکتا۔ یہ سنگ گراں یا شر کی قوتیں تیشے کو مصروف عمل رکھتی ہیں۔ تیشہ یہاں کوشش اور عمل کی علامت ہے۔ چنانچہ اقبال کے

نزدیک سنگ گراں یا شر زندگی کے تین اجزا میں سے ایک ہے۔ جس کے بغیر وہ مکمل نہیں کہلا سکتی۔ لہٰذا اس کی اہمیت بھی دوسرے اجزا کی طرح ہے۔ اگر سنگ گراں نہ ہو تو تیشے کی ضرورت نہ رہے گی یعنی انسان عمل سے محروم ہو جائے گا اور اس صورت حال کو اقبال پسند نہیں کرتے ابلیس انسان کو طاقت ور اور جری دیکھنا چاہتا ہے۔ خود ابلیس کو اپنی اس صفت کا علم نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کوئی پختہ کار آئے اور اس کی گردن توڑ کر رکھ دے تاکہ وہ شکست کی لذت سے آشنا ہو کر زندگی کا مقصد پورا کر دے وہ آدم کو بلندیوں پر پرواز کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے وہ اس کے راستے کی باد مخالف بن جاتا ہے تاکہ اسے اور اونچا اڑا سکے وہ خدا سے مرد مومن یا انسان کامل کی تخلیق کی دعا مانگتا ہے۔

بندۂ صاحب نظر باید مرا ‏ ‏ ‏ ‏ یک حریف پختہ تر باید مرا!
بندۂ باید کہ پیچد گردنم ‏ ‏ ‏ ‏ لرزہ انداز و نگاہش در تنم
اے خدا یک زندہ مرد حق پرست ‏ ‏ ‏ ‏ لذتے شاید کہ یابم در شکست

مرد مومن لا اور الا کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ابلیس نے لا کی منزل طے کی ہے مگر الا کی طرف نہیں آیا۔ اس لئے اقبال تمام تر توصیف کے باوجود اس کو اپنا مقصود قرار نہیں دیتے۔ اس کی عقل اس کی قوت، اس کی بے باکی، اس کی آزادی۔ سب کو اقبال نے پسند کیا ہے مگر وہ زندگی کی زلفوں کو سنوارنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے قاہری کے ساتھ ساتھ دلبری کی ضرورت ہے۔ عشق کی ابتدا قاہری سے ہوتی ہے مگر اس کی انتہا دلبری ہی ہے [1] وہ اندھی قوت کے پجاری نہیں بلکہ آنکھوں والی قوت کو چاہتے ہیں۔ جو نیکی اور بدی میں

---

[1] ابتدائے عشق و مستی قاہری است ‏ ‏ ‏ ‏ انتہائے عشق و دلبری است

تمیز کر سکے اور اپنی منزل کا تعین کر سکے۔ نفی عمدہ چیز ہے بشرطیکہ اثبات بھی اس کے ساتھ ہو بغیر الا کے لا دنیا کے لیے تباہی اور بربادی کا موجب ہوتا ہے۔ لہٰذا ابلیس کی منزل پر رک جانا ہلاکت کا باعث ہے۔

نکتہ ای گویم ز مرداں حال	امتاں را لا جلال الا جمال

در جہاں آغاز کار از حرف لاست	ایں نخستیں منزل مرد خداست

لا و الا ساز و برگ امتاں	نفی بے اثبات مرگ امتاں

چنانچہ اقبال چاہتے ہیں کہ انسان اپنی منزل کو پانے کے لیے قرآن کی بتائی ہوئی راہ[۱] چلے اور ابلیس کی گردن مروڑ کر اسے شکست آشنا کر دے۔ حامل شرع پیمبر ہو کر ہی انسان خودی کو بلند کر سکتا ہے ابلیس کی بجائے مرد مومن یا انسان کامل کا پیروکار ہونا چاہیے اور انسان کامل کا بہترین نمونہ رسول اکرمؐ کی ذات ہے۔ ابلیس تو انسان کامل کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں۔[۲]

مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہ مصطفےؐ رو

چنانچہ ابلیسی میں فساد ہی فساد ہے۔ اور وہ تعمیر کی بجائے تخریب کا آلہ کار ہے۔

ابن آدم دل بہ ابلیسی نہاد	من ز ابلیسی ندیدم جز فساد

---

[۱] گر تو می خواہی مسلماں زیستن	نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

[۲] ابلیس کا فراق اور سوز بھی انسان ہی کا دیا ہوا ہے۔ اگر انسان پیدا نہ ہوتا تو وہ سوز کی دولت سے محروم رہ جاتا۔

بغیر از جان ما سوزے کجا بود	ترا از آتش ما آفریدند

یورپ کی اس ترقی کے باوجود وہاں جو پستی ہے وہ ابلیس کی کارگذاری کا نتیجہ ہے کیونکہ انھوں نے ابلیس کی زیرکی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر عشق کو نظر انداز کر دیا جو رحمان تک پہونچانے کا ذریعہ ہے۔ جو معاشرہ ابلیس کے زیر اثر وجود میں آئے گا۔ وہ اپنی تمام ترقی کے باوجود فساد اور مصیبت کا باعث بن جائے گا۔ یہ معاشرہ اخلاق سے بے نیاز ہو گا۔ اور کئی ابلیس خود پیدا کرے گا۔

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے یورپ نے صد ہزار ابلیس

اور خود ابلیس کی زبان سے کہلواتے ہیں۔

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہ افلاک

اقبال نے ابلیس کو حقائق کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے جہاں انھوں نے زندگی کی حقیقت اس کی زبان سے بیان کی ہے، وہاں اس حقیقت کا اعلان بھی اسی نے کیا ہے کہ اسلام ہی اس کے نظام کو تہ و بالا کر سکتا ہے وہ اگر ڈرتا ہے تو شرع پیمبر سے ڈرتا ہے۔ یہ بات وہ اعلانیہ تو نہ کہہ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس حقیقت کو اپنے مشیروں کے سامنے بیان کیا ہے۔ اسی کی زبان سے اقبال نے مسلمانوں پستی کی وجوہات بھی گنوادی ہیں ابلیس اپنی مجلس شوریٰ میں کہتا ہے۔

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دین
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستین
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرع پیمبر کہیں!

الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوع غلامی کیلئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیر راہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
مفلسوں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں!
چشم آدم سے رہے پوشیدہ یہ عالم تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں
ہے یہی بہتر الہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

کس خوبصورتی سے اقبال نے مسلمانوں کی پستی کے اسباب کو گنوایا ہے۔ آخر میں ابلیس اپنے چیلوں کو حکم دیتا ہے۔

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

غور کیجئے اقبال جس نے ابلیس کے متعلق ہمدردانہ رویہ اختیار کیا وہ ابلیس کے اس حکم کے لئے خود ایک چیلنج بن گیا ہے اور اس کے خلاف اس نے اپنی تمام شاعرانہ اور فلسفیانہ صلاحیتوں کو صرف کر دیا ہے۔ اس نے ابلیس کا نفسیاتی مطالعہ کرکے اس کی حقیقت سے آگاہی حاصل کی ہے اس لئے وہ خوب جانتا ہے کہ اس کی چالوں کا مقابلہ کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ اس کی عقل کا جواب عقل اور عشق سے دیا ہے۔ اور اس کے بے پناہ عمل کا توڑ اتنے ہی تند و تیز عمل سے کیا ہے۔ مگر ملا جو ہر وقت ابلیس کے گلے میں لعنت کا طوق ڈالتا ہے اور اس کے سائے سے بھی بھاگتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو مزاج خانقاہی میں پختہ کر کے اور ذکر و فکر صبح گاہی میں مست رکھ کر ابلیسی منصوبے پر عمل درآمد کر رہا ہے اقبال ابلیس سے بھاگنا نہیں چاہتے۔ وہ دشمن کی صلاحیتوں سے آگاہ ہو کر

اس کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جانتے کہ اس شر سے خیر پیدا کیا جا سکتا ہے اور قدرت الہٰی کا مقصد شیطان کی پیدائش سے یہی ہے۔ وہ جاوید نامے میں شاہ ہمدان سے پوچھتے ہیں کہ خدا نے شیطان کو کیوں پیدا کیا۔

از تو خواہم سِرّ یزداں را کلید
طاعت از ما خواست و شیطاں آفرید!

اور شاہ ہمدان جواب دیتا ہے کہ جو شخص حقیقت آشنا ہے وہ جانتا ہے کہ خدا ضرر سے ہی منفعت پیدا کرتا ہے چنانچہ شیطان کا شر خیر میں بدل سکتا ہے اگر انسان اس کے ساتھ نبرد آزما ہو کر اپنی خودی کی تکمیل کرے۔

بندہ کز خویشتن دارد خبر — آفریند منفعت را از ضرر
بزم با دیو است آدم را زوال! — رزم با دیو است آدم را جمال

انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ ابلیس کے کہنے پر نہ چلے بلکہ اس سے جنگ کر کے اس کو اپنے قابو میں کر لے۔ مارنے کے بجائے مسلمان بنا لے تاکہ اس کی قوتیں بھی انسان کے تسخیر کائنات کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کام آ سکیں۔ یوں بھی ابلیس کو قتل کرنا ناممکن ہے اسے مسلمان بنا کر اپنا رفیق بنا لینا چاہیئے۔

کشتن ابلیس کارے مشکل است — زانکہ او گم اندر اعماق دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی — کشتۂ شمشیر قرآنش کنی!

چنانچہ ابلیس کی عقل، اس کی آزادی و بے باکی اور اس کی قوت سب سے مرد مومن فائدہ اٹھاتا ہے۔ مگر وہ ان کو انسانیت کو گمراہ کرنے کی بجائے انسانیت کی بھلائی میں صرف کرتا ہے۔

اقبال اور سوشلزم

صاحب سرمایہ از نسل خلیل
یعنی آن پیغمبر بے جبرئیل
زاں کہ حق در باطل او مضمر است
قلب او مومن دماغش کافر است

دین آن پیغمبر حق ناشناس
بر مساوات شکم دارد اساس

آج کل اسلام اور سوشلزم کے تعلق پر بڑی گرما گرم بحثیں ہو رہی ہیں کچھ لوگ اسلامی سوشلزم کی حمایت میں لکھ رہے ہیں اور کچھ اسلام کے ساتھ سوشلزم کے جوڑ کو پسند نہیں کرتے اور یہ کہ اسلامی سوشلزم کا نام لینے والے گردن زدنی ہیں اس کے مقابلے میں پہلا گروہ یہ کہتا ہے کہ قائداعظم علامہ اقبال اور لیاقت علی خاں نے بھی اسلامی سوشلزم کی ترکیب استعمال کی ہے۔ دوسرا گروہ یہ جواب دیتا ہے کہ ان حضرات کی نیت ٹھیک تھی اور وہ دراصل اسلام کے معاشی نظام کو ہی

رائج کرنا چاہتے تھے مگر اب جو لوگ یہ ترکیب استعمال کرتے ہیں ان کی نیت درست نہیں۔ ہم نیت کا حال تو نہیں جانتے اور نہ اسلامی سوشلزم کی ترکیب کے حق یا مخالفت میں کچھ کہنا چاہتے ہیں کیونکہ ہمارا مسلک بقول اقبال یہ ہے کہ :

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا!

اس مضمون میں قائد اعظم یا لیاقت علی خاں سے قطع نظر ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اقبال نے سوسلزم کے متعلق کیا رویہ اختیار کیا کیونکہ وہ پاکستان کے تصور کے خالق تھے! اور ان کے خیالات ہمارے لئے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ سب سے پہلے آئیے یہ دیکھیں کہ سوشلزم یا کمیونزم کی اصلاحوں کا مفہوم کیا ہے کیونکہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ سوشلزم تو جائز ہے مگر کمیونزم جائز نہیں اور دوسرے گروہ کا موقف ہے کہ یہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ پیش کرتے ہیں۔ ویبسٹر ورلڈ یونیورسٹی ڈکشنری (Webster world University dictionary) میں سوشلزم کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

"ایک نظریہ جس کے تحت زمین صنعت اور اشیائے پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں۔ اور وہی ان کا انتظام کرے اور ان کی تقسیم کرے ہر وہ نظام جو اس نظریہ پر مبنی ہو۔ سوشلزم کہلائے گا"

اور کمیونزم کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

"ایک سماجی نظام جس کے تحت جائیداد، سرمایہ اور صنعت، سماج کے کنٹرول میں ہو اور جو فوائد کی یکساں تقسیم کے لئے کوشاں ہو"

ان دونوں تعریفوں کو سامنے رکھنے سے جو بات واضح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں سوشلزم ایک نظریہ Theory ہے۔ وہاں کمیونزم ایک سماجی نظام ہے اسی لئے سوشلزم کا لفظ

مختلف تراکیب میں استعمال کیا جاتا ہے مگر کمیونزم کا لفظ کسی تراکیب کے ساتھ استعمال نہیں جاتا خود کارل مارکس کمیونسٹ مینی فیسٹو میں جاگیری سوشلزم "جرمن سوشلزم" خیالی سوشلزم اور مسیحی سوشلزم کی تراکیب کو استعمال کرتا ہے۔ گروہ سوشلزم کی ان تمام اقسام کو رد کر دیتا ہے[1]۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہ سب اصل سوشلزم کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں۔ مارکس، اینگلز اور لینن تینوں نے سوشلزم کو کمیونزم کی ابتدائی صورت قرار دیا ہے۔ لینن کہتا ہے۔

"سوشلزم کی جدوجہد میں ہم اس بات کے قائل کہ یہ ترقی کر کے کمیونزم بن جائے گا اور عام طور پر عوام کے خلاف تشدد کی، ایک آدمی کی دوسرے آدمی پر اور آبادی کے ایک حصے کی دوسرے پر محکومی کی ضرورت ختم ہو جائے گی کیونکہ لوگ تشدد اور محکومی کے بغیر سماجی زندگی کے لوازمات پر عمل کرنے کے عادی ہو جائیں گے[2]

سوشلزم اور کمیونزم کے بنیادی مقاصد ایک ہیں مگر سوشلزم منزل کی طرف پہلا قدم ہے جبکہ کمیونزم خود منزل ہے۔ سوشلزم کے دور میں سماجی اور ثقافتی عدم مساوات برقرار رہتی ہے۔ کمیونزم ایک مثالی نظام ہے۔ جس میں حکومت کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور لوگ خود ہی کاروبار حکومت چلاتے ہیں۔ کارل مارکس کی مثالی ریاست وہ تھی جہاں تمام خرابیاں دور ہو جائیں افراد مساوی حقوق کے مالک ہوں اور ان کے ذوق کے مطابق ان کو ہر چیز مہیا ہو۔ جرائم کا نام ونشان نہ ہو۔ ایسی مثالی ریاست ابھی تک وجود میں نہیں آئی۔ اگرچہ روس اور چین میں یہ نظام رائج ہے۔ ہم روس اور چین اور دوسرے ممالک کو اشتراکی ممالک کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ خود روس کے نام سے ظاہر ہے۔ U.S.S.R.

---

[1] اگر کارل مارکس اسلامی سوشلزم کی ترکیب سنتا۔ تو اسے بھی رد کر دیتا۔

[2] منتخبات از لینن ج ۲۰۷۔ صفحہ ۲۵۶۔

Unian of soviet socialist Reppablics یعنی سوسلسٹ ریاست ہائے متحدہ روس - یہ کمیونسٹ ممالک نہیں ہیں بلکہ کمیونزم کے حصوں کی طرف رواں ہیں - مگر سہولت کی خاطر ہم ان ممالک کو کمیونسٹ ممالک قرار دے دیتے ہیں - کارل مارکس نے سب سے پہلے کمیونزم نظام کو سائنسی اصولوں پر استوار کیا اور دنیا میں ایک نئے دین کی بنیاد رکھی اس نے مزدوروں کو جغرافیائی حدود سے آزاد کر کے ایک قوم بنانے کی کوشش کی اور ایک ایسا معاشی فلسفہ پیش کیا - جس کی رو سے اس کے خیال کے مطابق دنیا سے معاشی ناہمواریوں کو دور کیا جا سکتا ہے - کارل مارکس نے سرمایہ داری نظام پر ایک کاری ضرب لگائی اور اس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا - کمیونسٹ مینوفیسٹو کے آخر میں اس نے لکھا ہے -

" اپنے خیالات اور مقاصد کو چھپاتے پھرنا کمیونسٹوں کی شان نہیں - وہ برملا اعلان کرتے ہیں کہ ان کا اصلی مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے کہ موجودہ سماجی نظام کا تختہ بزور الٹ دیا جائے - حکمراں طبقے کمیونسٹ انقلاب کے ہونے کا نام سے ہولا تو ہوں، مزدوروں کو اپنی زنجیروں کے سوا کھونا ہی کیا ہے - اور جیتنے کو ساری دنیا پڑی ہے - ساری دنیا کے مزدور ایک ہو جاؤ "

کارل مارکس نے سرمایہ داری کے خلاف اپنی کتاب " سرمایہ " میں ایک نیا نظام پیش کیا ہے اس کے دل میں افلاس و غربت کو ختم کرنے کا جو جذبہ پایا جاتا تھا - اقبال کو اس نے بہت متاثر کیا - اور انھوں نے جاوید نامہ میں اس کو حضرت ابراہیم کی نسل سے اور ایک ایسا پیغمبر قرار دیا جو حق ناشناس تھا جس کا دل مومن مگر دماغ کافر تھا۔

اور جس کے باطل میں حق پوشیدہ تھا۔

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل — یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است — قلبِ او مومن دماغش کافر است
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس — بر مساواتِ شکم دارد اساس

مگر خرابی یہ ہے کہ اس نے مساوات کی بنیاد صرف پیٹ کو بنایا اور اخلاقیات کو خارج کر دیا کارل مارکس نے مذہب سے بے زاری کا جو اظہار کیا ہے اقبال اس سے متفق نہیں ہیں وہ جسم کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ روح کے تقاضوں کا بھی خیال رکھتے ہیں البتہ وہ خود ایسے مذہب کے خلاف ہیں جو افیونی صفات رکھتا ہو۔ جو جگانے کی بجائے سلانے کی کوشش کرے اور عمل کی بجائے بے عملی کا درس دے۔ بندہ مزدور کو سرمایہ داری کو زنجیروں میں جکڑ دے اور اس کی آنکھیں کھولنے کی بجائے بند کر دے اور خواب گراں کا عادی بنا دے۔

وائے آں دینے کہ خواب آرد ترا! — باز در خوابِ گراں دارد ترا!
سحر و افسون است یا دین است ایں — حب افیون ست یا دین است ایں

مگر اسلام ایسا دین نہیں ہے کارل مارکس نے عیسائیت اور یہودیت کو دیکھا تھا اس لئے اس نے مذہب کو افیون قرار دیا۔ اسلام کے پاس ضابطہ زندگی قرآن ہے جو دوسری چیز ہے۔ چنانچہ اقبال روسیوں سے کہتے ہیں کہ اگر اس کتاب پر غور کرو گے تو لادینی کو ترک کر دو گے کیونکہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو حرکت و عمل کو جنم دیتا ہے۔ سرمایہ دار کے لئے پیغامِ مرگ ہے افسوس تو یہ ہے کہ مسلمان اس کی اصلی روح سے ناواقف ہیں ورنہ وہ دنیا کو ایک ایسا نظام عطا کر سکتے تھے جس کی نظیر تہ گردوں نہ ملتی۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

آفریدی شرع و آئینے دگر !! اندکے با نور قرآنش نگر!

از بم و زیر حیات آگہ شوی

ہم ز تقدیر حیات آگہ شوی

کارل مارکس کی طرح علامہ اقبال کو بھی اقتصادیات سے دلچسپی تھی۔ انھوں نے ۱۹۰۳ء میں ایک کتاب علم الاقتصاد پر لکھی تھی۔ اور انھیں مسلمانوں کی معاشی حالت کے خراب ہونے کا بھی بڑا دکھ تھا۔ ان کے اس کرب کا اظہار ان خطوط میں ہوا ہے جو انھوں نے قائداعظم کے نام لکھے ہیں ان خطوط میں انھوں نے قائداعظم کی توجہ مسلمانوں کی معاشی ابتری کی طرف دلائی ہے۔ ان کے خیال میں اسلام کے قوانین کو جدید خیالات کی روشنی میں نافذ کرنے سے افلاس کی لعنت ختم ہو سکتی ہے[۱] ان کے نزدیک اسلام اشتراکی نظریات کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کی ہندومت سے زیادہ اہلیت رکھتا ہے۔ بلکہ اسلام کی صحیح اسپرٹ یہی ہے کہ اشتراکی جمہوریت قائم ہو وہ لکھتے ہیں۔

"یہ بات میرے ذہن میں بالکل صاف ہے کہ اگر ہندو مذہب اشتراکی جمہوریت قبول کرتا ہے تو وہ یقیناً ہندو مذہب نہ رہے گا[۲] مگر اسلام کے لیے[۳] اشتراکی جمہوریت کی کسی مناسب صورت کو قبول کرنا جو اسلام کے آئینی اصولوں کے کے مطابق ہو انقلاب نہیں ہے بلکہ خالص اور حقیقی اسلام کی طرف لوٹنا ہے"

چنانچہ اقبال نے چین میں بیداری کے آثار دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا ہے۔ وہ سرمایہ داری

---

۱ اقبال کا خط قائداعظم کے نام مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء (انگریزی)

۲ اشارہ ہے نہرو کے سوشلزم کی طرف

۳ Letters of Iqbal to Jinnah Pag 19-

کے خاتمے اور اشتراکیت کے ابھرنے کو اچھی نظر سے دیکھتے ہیں۔

پرانی سیاست گری خوار ہے ۔۔۔ زمیں میر و سلطان سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا ۔۔۔ تماشا دکھا کر مداری گیا!
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے ۔۔۔ ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے!

اور اکتوبر ۱۹۱۷ء میں جب زار روس کا تختہ الٹ کر اشتراکی حکومت پر قابض ہو گئے تو اقبال نے انقلاب روس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور کمیونسٹوں کی گرمیٔ رفتار اور جوش کردار کی تعریف کی جو کام مسلمانوں کو کرنا چاہئے تھا۔ وہ روسیوں نے کر دکھایا۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم ۔۔۔ بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور ۔۔۔ فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر ۔۔۔ کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار!
قرآن میں غوطہ زن ہو اے مرد مسلماں ۔۔۔ اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار
جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک ۔۔۔ اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

روس کی تعریف کرنے کے بعد اقبال نے مسلمانوں کو اس سے سبق سیکھنے کی تلقین کی ہے ساتھ ہی اسے مشورہ دیا ہے کہ وہ قرآن کے اسرار رموز میں جھانک کر دیکھے تو اسے معلوم ہو کہ سرمایہ داری کا خاتمہ مسلمان کا فرض تھا انھوں نے مزید وضاحت کے لئے ایک آیت کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ اس پوری آیت کا مطلب یہ ہے۔

"وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ اپنی کمائی کا کتنا حصہ دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہو کہ جتنا تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔"

علامہ اقبال کا مطلب اس آیت کی طرف اشارہ کرنے کا یہ ہے کہ کسی شخص کو اپنی

ضرورت سے زیادہ اپنے پاس رکھنے کا حق نہیں۔ لیکن اس ضرورت کا تعین کون کرے گا؟
صاف ظاہر ہے کہ مملکت اس بات کا تعین کرے گی کہ اس کے افراد کی حدود کیا ہیں۔ مگر قرآن
کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ضرورت کو ان تنگ محدود نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی ملک میں
خوشحالی زیادہ ہو۔ تو تمام افراد کی ضروریات اس سے بڑھ جاتی ہیں۔ چنانچہ حکومت کا فرض
ہے کہ ضرورت کا تعین کرے اور باقی لوگوں کو چاہیے ضرورت سے زیادہ خود بخود حکومت کے
حوالے کر دیں تاکہ وہ اس کو ضرورت مندوں میں تقسیم کر دے۔ آپ کہیں گے کہ یہ حکم تو کہیں نہیں
ہے کہ ان سے چھین لو مگر زکوٰۃ کے متعلق بھی تو یہ نہیں کہا گیا کہ لوگوں سے چھین لو، مگر زکوٰۃ کے
متعلق بھی تو یہ نہیں کہا گیا کہ وہ لوگوں سے چھین کر لی جائے لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی نے زکوٰۃ
نہ دینے والوں کے خلاف جنگ کی۔ جو لوگ قرآن کے احکام پر رضامندی سے عمل نہیں کرتے
ان سے زبردستی ان کی پابندی کرانا ضروری ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی حکومت کی قوانین
برضا و رغبت پابندی نہ کرنے والوں طاقت کے بل پر پابندی کروائی جاتی ہے۔ ہاں تو میں یہ
کہہ رہا تھا کہ علامہ اقبال کو روس کے اشتراکی نظام سے بڑی دلچسپی ہے اور وہ ان سے ہمدردی
رکھتے ہیں کیونکہ علامہ اقبال کو مسلمانوں اور روس کے عوام میں مشابہت نظر آتی ہے مسلمانوں
نے بھی قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کو تباہ کر دیا تھا اور مساوات کا سبق دیا تھا۔ انھوں نے
بھی اپنے زور بازو سے عدل و انصاف کو عام کیا تھا خدا کی حکومت قائم کی تھی مگر آہستہ
آہستہ اسلامی جمہوریت آمریت کا لباس پہننے لگی اور ایک وقت ایسا آیا کہ سلطان اور بادشاہ
مسلمانوں پر مسلط ہو گئے چنانچہ وہ روسی عوام کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اسلامی تاریخ سے
سبق حاصل کریں اور ان غلطیوں کو نہ دہرائیں جو مسلمانوں سے سرزد ہوئیں۔ مسلمانوں کی
موجودہ حالت کو دیکھ کر یہ رائے قائم نہ کریں کہ اصل اسلام یہی ہے۔ بلکہ اس وقت مسلمان

قرآن کی تعلیمات سے کوسوں دور ہیں۔ قرآن کی تعلیمات مقاصد کے اعتبار سے سرمایہ داری اور عدم مساوات کی اتنی ہی مخالف ہیں جتنی کہ اشتراکیت، قرآن، سرمایہ دار کے لئے موت اور مزدور کے لئے شادمانی اور مسرت کا پیغامبر ہے۔ وہ جمال الدین افغانی کی زبان سے ملت روسیہ کو پیغام دیتے ہیں۔

منزل و مقصود قرآں دیگر ست   رسم و آئینِ مسلماں دیگر است
در دل او آتش سوزندہ نیست   مصطفےٰ در سینہ او زندہ نیست
بندہ مومن ز قرآں بر نخورد   در ایاغ او نہ مے دیدم نہ دُرد
خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست   خود سر تخت ملوکیت نشست
تا نہال سلطنت قوت گرفت   دین او نقش از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر
عقل و ہوش و رسم و راہ گردد دگر
تو کہ طرح دیگرے انداختی   دل ز دستور کہن پرداختی
تا بر افروزے چراغے در ضمیر!   عبرتے از سر گذشت ما بگیر

روسیوں نے تمام خداؤں کا خاتمہ کر دیا مگر ایک خدا کی طرف نہ آسکے یہیں سے علامہ اقبال کا اشتراکیت سے اختلاف شروع ہوتا ہے مضبوط بنیادوں پر استوار نظام کے لئے ضروری ہے کہ وہ دین کا دامن پکڑے وہ ملت روسیہ سے کہتے ہیں کہ اب اسے لا کی منزل سے الا کی منزل کی طرف آنا چاہئے۔

کردہ کار خداوندان تمام   بگزر از لا جانب الا خرام
در گذر از لا اگر جوئندہ   تا رہِ اثبات گیری زندہ

انھوں نے فرانسس ینگ ہزبنڈ Francis Younghusband
کے نام ایک خط میں بھی اشتراکیت اور اسلام میں لا اور الا کا فرق بتایا ہے۔

"برطانیہ عظمیٰ کی طرف سے آئندہ گول میز کانفرنس میں ہندوستان میں مختلف قوموں کے اختلاف سے فائدہ اٹھانے کی ہر کوشش آخر کار دونوں ملکوں کے لئے مہلک ثابت ہوگی۔ اگر آپ ہندوؤں کو سیاسی اقتدار منتقل کر دیں گے تاکہ برطانیہ تاکہ برطانیہ اس سے مادی فوائد حاصل کر سکے تو آپ ہندوستانی مسلمانوں کو مجبور کر دیں گے کہ وہ اینگلو ہندو گورنمنٹ کے خلاف وہی ہتھیار استعمال کریں جو گاندھی نے انگریزی حکومت کے خلاف کئے تھے۔ اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ آپ کا یہ فعل تمام ایشیا کو روسی کمیونزم کی گود میں ڈال دے جو مشرق میں برطانوی بالادستی کے لئے coup de grace ثابت ہوگا۔ میں خود یہ یقین نہیں رکھتا کہ روسی فطری طور پر لا مذہب ہیں۔ اس کے برعکس میں سمجھتا ہوں کہ روسی مرد اور عورتیں شدید مذہبی میلانات رکھتے ہیں۔ روسیوں کی موجودہ منفی ذہنی حالت ہمیشہ نہیں رہے گی کیونکہ سوسائٹی کا نظام لادینی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتا۔ جوں ہی اس ملک میں امن کو استقلال نصیب ہوتا ہے اور وہاں کے لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقع ملتا ہے تو وہ مجبور ہوں گے کہ اپنے نظام زندگی کے لئے مثبت بنیاد تلاش کریں۔ چونکہ بالشویک ازم جمع خدا تقریباً اسلام ہی ہے، اس لئے یہ بات میرے لئے حیران کن ہوگی۔ اگر اسلام روس کو ہڑپ کر جائے یا روس اسلام کو

بہر حال نتیجے کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو نئے آئین میں کیا حیثیت دی جاتی ہے۔"

اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ اقبال کے صاحبزادے ڈاکٹر جاوید اقبال رقمطراز ہیں۔

"اس خط کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال حکمتِ عملی سے کام لے کر انگریزوں کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اگر وہ سیاسی اقتدار کلی طور پر ہندو اکثریت کو منتقل کر دیتے ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں کو نئے آئین میں علیحدہ قومی حیثیت تسلیم نہیں کرتے تو تمام مسلم ایشیا روسی کمیونزم کی گود میں جا گرے گا۔ اقبال انگریزوں کی ذہنیت کو سمجھتے ہیں کہ کس طرح ان سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے ...... اقبال کے اس طرح کے بیانات مسائل حاضرہ کے متعلق Topical ہیں اور ان کی کوئی مستقل اہمیت نہیں۔"

افسوس کا مقام ہے کہ یہ سطور علامہ اقبال کے فرزند کے قلم سے نکلی ہیں۔ اسی طرح انھوں نے اقبال کے کلام کی اہمیت بھی ختم کر دی ہے وہ اس خط کے مندرجات کو Topical کہہ کر ٹالنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ بات ہو تو اقبال کی کتاب "ضربِ کلیم کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ اس کا ذیلی عنوان ہے "اعلان جنگ دورِ حاضر کے خلاف"۔ یہ کتاب بھی خود علامہ اقبال کے نزدیک مسائل حاضرہ کے متعلق ہے انھوں نے خود اس کے لیے Topical کا لفظ استعمال کیا ہے۔

"باقی رہی یہ کتاب سو یہ ایک Topical چیز ہے اس کا مقصود یہ تھا ہے

کہ بعض خاص خاص مضامین پر میں اپنے خیالات کا اظہار کروں یہ ایک اعلان جنگ ہے دورِ حاضر کے خلاف۔۔ ۔ لمۂ

اس خط کی روشنی میں ڈاکٹر اقبال کا یہ کہنا کہ اس طرح کے بیانات کی کوئی مستقل اہمیت نہیں۔ قابل افسوس ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اقبال کی یہ کتاب ان کے خیالات کو جاننے کا کتنا اہم ذریعہ ہے۔ اگر ہم اس کتاب میں بیان کردہ انکار کو کوئی اہمیت نہ دیں تو پھر ان کی ساری شاعری کو نظر انداز کرنا پڑے گا۔ دوسری بات جو ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے والد انگریزوں کی ذہنیت کو سمجھتے تھے اس لئے حکمت عملی سے کام لے کر فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے ان کے نزدیک روس کے متعلق ان کے خیالات خلوص پر مبنی نہیں ہیں اور صرف برطانیہ کو ڈرانے کے لئے انھوں نے یہ سب کچھ لکھا ہے اس سے بڑا الزام اور اقبال پر کیا لگایا جا سکتا ہے کہ وہ موقع پرستی اور مصلحت کے خلاف لکھا ہو لے اسے اس کا بیٹا ہی زمانہ ساز کہہ سکتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ "اگر زمانہ با تو نسازد تو باز مانہ بہ ستیز" اور ان کے صاحبزادے کہہ رہے تھے کہ وہ یہ زمانہ لبساز کی پالیسی پر عمل پیرا تھے اقبال نے ہمیشہ عقل مصلحت اندیش کے خلاف اور عشق شورہ انگیز کی حمایت میں لکھا۔ پھر وہ خود اس کے خلاف کیسے اس خط میں لکھ سکتا ہے ڈاکٹر جاوید اقبال کا یہ خیال تو درست ہو سکتا ہے کہ انھوں نے برطانیہ کو تنبیہ کیا ہے کہ اگر انھوں نے نئے آئین میں مسلمانوں کو مناسب جگہ نہ دی تو کمیونزم مسلم ایشیا پر چھا جائے گا مگر ان کی یہ تنبیہہ بھی ان کے خلوص نیت پر مبنی ہے اور وہ اسلام اور کمیونزم کے قریبی تعلق پر یقین رکھتے ہیں۔ اور دونوں کا ایک دوسرے کی طرف

بڑھنا ایک فطری عمل ہے۔ کمیونزم لا الہ ہے اور اسلام نہ صرف یہ کہ لا الہ ہے الا اللہ بھی اور کائنات کی ہر چیز لا سے الا کی طرف بڑھتی ہے اس لئے روس کا اسلام کی طرف آنا ناگزیر ہے۔ میں پہلے وہ اشعار نقل کر چکا ہوں جن میں اقبال نے ملت روسیہ کو لا سے الا کی طرف آنے کی دعوت دی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

ہم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ — بندگی با خواجگی آمد بجنگ
روس را قلب و جگر گردیدہ خوں — از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں!
آں نظامِ کہنہ را برہم زد است — تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
کردہ اند اندر مقاماتش نگاہ — لا سلاطیں[1]، لا کلیسا، لا الٰہ
فکرِ او در تندبادِ لا بماند — مرکبِ خود را سوئے الا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں — خویش را زیں تندباد آرد بروں
در مقامِ لا نیاساید حیات — سوئے الا می خرامد کائنات

ان اشعار کا مقابلہ نیک ہر نیند کے تمام خطبے سے کیا جائے تو روس کے متعلق اقبال کا نظریہ یہاں بھی وہی ہے نہ معلوم ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس خطبے کی یہ توجیہ اور اقبال کی باقی شاعری کو نظر انداز کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی دراصل ڈاکٹر جاوید اقبال نے لا اور الا کے وسیع تر مفہوم پر نظر نہیں رکھی۔ اگر کوئی امت لا سے الا کی طرف نہ آئے تو وہ تباہ ہو جائے گی۔ اگرچہ لا میں قوت و طاقت ہے۔ مگر الا کے بغیر یہ شر کی علامت بن جاتی ہے

نکتہ می گویم از مردانِ حال! — امتاں را لا جلال الا جمال
لا و الا احتسابِ کائنات — لا و الا فتحِ بابِ کائنات

---

[1] سلطان کا مطلب بادشاہ نہیں بلکہ ہر وہ شخص ہے جو غیر کی کھیتی یا محنت پر نظر رکھے
مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو — ہے وہ سلطان غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

ہر دو تقدیر جہاں کاف و نون — حرکت از لا زاید از الا سکون

تا نہ رمز لا الہ آید بدست — بندہ غیر اللہ را نتواں شکست

در جہاں آغاز کار از حرف لاست — ایں نخستیں منزل مرد خداست

لا مقام ضرب ہائے پے بہ پے — ایں غو رعد است نے آواز نے

لا و الا ساز برگ امتاں — نفی بے اثبات مرگ امتاں

نہاں ہے زندگی میں ابتدا لا انتہا الا — پیام موت ہے جب لا ہوا الا سے بیگانہ

وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی — یقیں جانو ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ

بات صرف اتنی سی ہے کہ جب تک لا کی منزل سے نہ گزر جائے اور جلال حق کو نہ اپنایا جائے اس وقت تک الا کی منزل اور جمال حق نہیں مل سکتا۔ اگرچہ جمال یا الا، لا یا جلال سے بہتر ہے۔ مگر بغیر جلال یا لا کے جمال یا الا مل ہی نہیں سکتا۔

تا نگیری از جلال حق نصیب — تا نیابی از جمال حق نصیب

ابتدائے عشق و مستی قاہری است — انتہائے عشق و مستی دلبری است!

اقبال سوشلزم کے لیے ہی نہیں بلکہ ابلیس کے لیے بھی لا کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس سے بھی بڑی ہمدردی دکھائی ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ابلیس کے پیروکار اسی طرح انھوں نے نٹشے[1] کو بھی لا کی قوتوں کا نمائندہ کہا اور خواہش ظاہر کی کہ کاش، وہ الا کی طرف بھی آتا اگر وہ رسول اکرم کے زمانے میں پیدا ہوتا تو ضرور اسے بھی سرور حق نصیب ہو جاتا۔

زندگی شرح اشارات خودی است — لا و الا از مقامات خودی است

او بہ لا در ماند تا الا نہ رفت — از مقام عبدہ بیگانہ رفت

---

[1] نٹشے مراد ہے

یا تجلی ہمکنار و بے خبر　　دور تر چوں میدہ از بیخ شجر

کاش بودے در زمان احمدے　　تا رسیدے بر سرور سرمدے

اسی لئے انھوں نے کہا تھا کہ " بالشویک خیالات رکھنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہے۔" مگر جہاں تک اشتراکیت کے اقتصادی نظام کا تعلق ہے ان کا خیال یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات کے مطابق ہے۔ خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط میں انھوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ سوشلزم کے اس حد تک مخالف ہیں کہ وہ اس کے ماننے والے روحانیات کے قائل نہیں مگر ان کے معاشی نظام کو پسند کرتے ہیں کیونکہ وہ قرآنی ہے۔

" سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیات کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے تھے۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے روحانیات کا میں قائل ہوں مگر روحانیات کے قرآنی مفہوم کا جس کی تشریح میں نے اپنی تحریروں میں جا بجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی جو روحانیت میرے نزدیک منفی ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے باقی رہا سوشلزم سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔"

اس خط کا آخری فقرہ اس لحاظ سے بڑا اہم ہے کہ اس میں اسلام کے معاشی نظام کے متعلق اقبال کے نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے خیال میں اگر قرآن پر غور کیا جائے تو

تو معلوم ہوگا کہ اسلام کا معاشی نظام اشتراکیت سے ملتا جلتا ہے وہ کہتے ہیں کیونکہ انسان سارے کے سارے نفس واحد سے ہیں اس لئے ان کے رہنے سہنے اور کھانے کے انتظامات بھی یکساں ہونے چاہئیں۔ انھوں نے جاوید نامے میں جس مثالی حکومت کا نقشہ پیش کیا گیا وہ کارل مارکس کے مثالی تصور سے ملتا جلتا ہے۔ مریخ سیارے پر مرتدین کے شہر میں یہ انتظام موجود ہے کہ وہاں کوئی حکومت نہیں۔ وہاں نہ لشکر ہے اور نہ پولیس ہے۔ کیونکہ ان کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ کوئی بھی وہاں ناجائز ذرائع اور کشت و خون کو روزی کا ذریعہ نہیں بناتا۔ وہاں کسی کو قلم گھسنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور نہ کوئی جھوٹ کا طومار باندھ کر شہرت کا طلبگار ہوتا ہے۔ وہاں کے بازاروں میں بے کاروں کا ہجوم نظر نہیں آتا۔ ہر شخص اپنے کام میں مصروف ہے۔ چونکہ کوئی بے کار نہیں اس لئے وہاں گداگروں کا وجود بھی نہیں ہے وہاں کے رہنے والے خوب اور نرم خو اور سادہ پوش ہیں ان کے علم کا مقصد خدمت ہے کسی پر حکومت کرنا یا کسی کو آزار پہونچانا نہیں۔ وہاں اس بات کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی کسی کا حصہ مارے گا۔ کیونکہ ہر شخص کو اس کی خواہش کی چیز مل جاتی ہے چنانچہ کوئی کسی کا حاجت مند نہیں۔ وہاں دہقان اپنی زمین کی پیداوار کا خود مالک ہے اور کسی کو حصہ نہیں دیتا جاگیرداروں کے ظلم کا گذر نہیں وہاں کوئی آقا ہے اور نہ کوئی بندہ ہے۔ مگر اس مثالی ریاست کا حصول اقبال سمجھتے ہیں۔ کہ کمیونزم کے ذریعے نہیں بلکہ قرآن کے ذریعے ممکن ہے۔

چیست قرآں خواجہ را پیغام مرگ — دستگیر بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردک زرکش مجو[1] — لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوا
از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن — کس نہ داند لذت قرض حسن

[1] آیت کا ترجمہ ہے تم اس وقت تک نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک ان چیزوں کو خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ   آدمی درندبے دندان و چنگ
لذت خود را از زمین بروں روا است   ایں متاع بندہ و ملک خدا است
بندہ مومن امیں حق مالک است   غیر حق ہر شے کہ بینی ہالک است
رایت حق از ملوک آمد نگوں!   قریہ ہا از دخل شاں خوار و زبوں

آب و نان ماست از یک مائدہ
دودہ آدم "کنفس واحدہ"!

ان اشعار میں علامہ اقبال نے بتایا ہے۔ کہ قرآن سرمایہ داری کے خلاف ہے یہ زمین خدا کی ہے اور اس سے پیدا ہونے والی ہر چیز بھی خدا کی ہی ہے۔ مومن تو فقط اس دولت کا جو زمین سے پیدا ہوتی ہے امین ہے۔ اور اسی وقت تک اس کا حق دار ہے۔ جب تک امانت میں خیانت نہ کرے۔ اور ظاہر ہے کہ جب وہ ان چیزوں کو جائز میں خرچ نہیں کرتا تو وہ بد دیانتی کا مرتکب ہوتا ہے۔ اقبال نے بال جبریل میں بھی الارض للہ کے عنوان سے ایک الگ نظم لکھی ہے۔ جس میں بتایا ہے کہ خدا نے یہ زمین پیدا کی اس نے سورج کی گرمی اور بارش عطا کی تاکہ زمین سے پودے اگیں اور پھر ان پودوں کی جیب ان کے پھل سے بھر دی تاکہ انسان اس سے فائدہ اٹھائے چونکہ خدا کی زمین ہے اور اس سے وہی اشیاء کو پیدا کرتا ہے تو پھر ایک انسان کا ان پر حق نہیں ہے بلکہ سب انسانوں کا حق ہے۔ اور اگر کوئی جاگیردار اس پر قبضہ کر کے اس کا مالک بن بیٹھا ہے۔ اور لوگوں کو ان کی ضروریات سے محروم کر رہا ہے۔ تو وہ بھی کارل مارکس کی طرح اس سے سب کچھ چھین لینے کے حق میں ہیں کیونکہ اگر کوئی امین امانت میں خیانت کرے تو پھر وہ امانت ان کے پاس نہیں رہنی چاہیئے۔ انسانوں پر استحصال کا ذریعہ بننے والی اشیاء کو رکھ

ارض حق را ارض خود دانی بجو!!   چیست شرح آیہ لا تفسدوا!

کردینا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ وہ ایک نظم میں یہ فرمان خدا سناتے ہیں۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

حق را بسجودے صنماں را بہ طوافے
بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو

اقبال کا دل مزدوروں اور کسانوں کی زبوں حالی پر کڑھتا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ان کو ان کا جائز حق مل جائے۔ وہ لینن کو خدا کے حضور میں لے جاتے ہیں اور وہاں وہ خدا سے سوال کرتا ہے کہ:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

اور وہ حضرت خضر کی زبان سے مزدور پر ہونے والے ظلم اور سرمایہ دار کی مکر کی چالوں کو بیان کرتے ہیں اور پھر مزدور کو پیغام دیتے ہیں کہ تو اٹھ اور دنیا پر چھا جا اور اپنے دھوکا دینے والوں کی زنجیروں کو توڑ دے۔

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے، ہے پیام کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر!
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کیلئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اور چونکہ سوشلزم نے مزدور کی حق رسی کی کوشش کی اور ظالموں کو ان کے ظلم کا مزا چکھا دیا اس لئے وہ اقبال کے نزدیک تعریف کا مستحق ٹھہرا۔ وہ سوشلزم کو اسلام سے قریب تر خیال کرتے ہیں اسی لئے سوشلزم کی وجہ سے ابلیس کے مشیروں کو یہ خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں ابلیسی نظام ہی ختم نہ ہو جائے۔ یہ تو بڑا غضب ہے کہ آقاؤں کے خیموں کو غلاموں نے توڑ دیا ہے اور کوے نے باز کی ہمسری شروع کر دی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ابلیس کی دنیا تباہ و برباد ہو جائے۔

روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب

وہ کلیم بے تجلی، وہ مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کیلئے روزِ حساب

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

وہ یہودی فتنہ گر وہ روحِ مزدک کا بروز
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار

زاغِ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ
کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار

چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر
جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

میرے آقا یہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

اقبال بھی سوشلزم کی طرح یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی آقا نہیں ہونا چاہئے اور کسی کو کسی کا استحصال نہیں کرنا چاہئے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ نکتہ شرع مبین یہی ہے کہ کوئی دوسرے کا محتاج نہ ہو۔

نکتۂ شرع مبیں ایں است و بس!
کس نہ گردد در جہاں محتاج کس!

وہ اس اعتراض کو غلط قرار دیتے ہیں کہ اگر کوئی کسی کا محتاج نہ رہا تو دنیا کا نظام کیسے چلے گا۔ یہ اعتراض کرنے والے سرمایہ داروں کے حاشیہ بردار ہیں اور ان کی دولت کا فرض سرانجام دیتے ہیں جس نے محنت ہی نہیں کی اسے اپنے پاس اتنی ساری دولت رکھنے کا کیا حق ہے۔ چنانچہ جب پیام مشرق میں حکیم فرانسوی اگسٹس کومٹ مزدور کو یہی دلیل دے کر خاموش کرنا چاہتا ہے تو مزدور اسے کہتا ہے کہ اے حکیم تو اپنے فلسفہ کے زور پر میرا حق سرمایہ دار کو دینا چاہتا ہے تو مجھے فریب دے کر سرمایہ داری کو قائم رکھنا چاہتا ہے! افسوس ہے کہ اتنے علم اور عقل کے ہوتے ہوئے بھی تو سرمایہ دار کے جرم پر پردہ ڈال رہا ہے۔

فریبی بہ حکمت مرا اے حکیم — کہ نتواں شکستن ایں طلسم قدیم
حق کوہکن دادمی اے نکتہ سنج — بہ پرویز پرکار نابردہ رنج!

بہ جرم ادیورش آوردہ!
بایں عقل و دانش فسون خوردہ!

اقبال سوشلزم کے صرف اس حد تک حامی ہیں کہ اس نے غریبوں کو ان کا حق دلایا ہے اور مغرب کے جمہوری نظام کو جو دراصل لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے ہے پاش پاش کر دیا ہے۔ اقبال خود بھی مغرب کی جمہوریت سے مطمئن نہیں ہیں کیونکہ وہاں ایک فرد

کو آزادی ہے کہ وہ جمہوریت کا نام لے کر غریبوں کو لوٹے۔ ذرا مغرب کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیں کیا کبھی کوئی غریب بھی اس جمہوریت کا وزیر بنا ہے امریکہ کا صدر ہمیشہ کروڑپتی ہوتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے جمہوریت کا مطلب یہ لیا ہے کہ چند افراد مل کر پوری قوم کو غلام بنائے رکھیں جب غریب آدمی الیکشن کے اخراجات ہی برداشت نہیں کر سکتا تو وہ الیکشن کیسے لڑے گا۔ خود ہمارے ہاں بھی یہی کیفیت ہے۔ چنانچہ اقبال سوشلزم کی طرح مغرب کے اس نظام کو رد کر دیا۔

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

مجلس آئین و اصلاح رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

اس راز کو اک مرد فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے

جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ اسمیں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اور سوشلزم پر ان کو یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے دین کو چھوڑ دیا ہے اور اس لئے ان میں قاہری تو ہے دلبری موجود نہیں ہے۔

روسیاں نقش نوی انداختند
آب و نان بردند و دیں در باختند

اس وقت دنیا میں یہی دو نظام ہیں یعنی سرمایہ داری اور سوشلزم جن پر عمل ہو رہا ہے مگر یہ دونوں انسانیت کو برباد کر دیں گے۔ یہ دو پتھر ہیں جن کے درمیان انسان شیشے کی طرح پس رہا ہے۔

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج! درمیان ایں دو سنگ آدم زجاج

ملوکیت کی روح سرمایہ داری جمہوریت اور سوشلزم دونوں میں ہے مگر ایک تیسرا نظام بھی ہے جو اقبال کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ اور دونوں کی خامیوں سے اور وہ ہے اسلام کا نظام۔ مسلمان ممالک کی تعداد تو بہت زیادہ ہے۔ مگر کسی میں بھی اسلامی نظام رائج نہیں۔ دراصل مسلمانوں نے قرآن کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اگر وہ جدید زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر قرآن کا مطالعہ کریں تو وہ دیکھیں گے کہ اس کتاب کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ اشتراکیت کے سارے اقتصادی اصول موجود ہیں مگر اس کی خامیوں سے پاک ہیں۔ یہ قاہری اور دلبری کا مجموعہ ہے۔ اقبال کے اس خیال پر کچھ لوگ یہ اعتراض کریں گے کہ ہم قرآن کو اشتراکیت یا کسی اور نظام سے ہم آہنگ کیوں۔ قرآن کو جس طرح ہم نے سمجھا ہے۔ وہی ٹھیک ہے! اس کو جدید زمانے کے مطابق بدلنا نہیں چاہئے۔ اقبال کہتے ہیں کہ دراصل ہم قرآن کی اصلی روح سے ناآشنا ہیں۔ اسی لئے تو اردو زبوں ہیں وہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”عہد جدید کا ایک مسلمان اہل علم جب ان مسائل کو مذہبی تجربات اور افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے جن کا مبدا اور سرچشمہ قرآن ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں پیش کیا جا رہا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ پرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔“

اور پرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کرنے سے شرع پیمبر آشکار ہو سکتی ہے وہ شرع پیمبر جس سے خود ابلیس ڈرتا ہے ہم بیان کر چکے ہیں کہ ابلیس کی مجلس شوریٰ میں اس

کے مشیروں نے اشتراکیت کو بہت بڑا خطرہ بنا کر پیش کیا تھا۔ ابلیس کہتا ہے کہ وہ اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے۔

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد — یہ پریشاں روزگار آشفتہ مغز آشفتہ مو
جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے! — مزدکیت فتنہ فردا نہیں اسلام ہے

ابلیس کی زبان سے علامہ اقبال کئی حقائق بیان کرواتے ہیں چنانچہ اسلام کے ایک اعلیٰ نظام زندگی ہونے کا اعلان بھی وہی کرتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ مسلمان اس وقت اسلامی تعلیمات کو بھولے ہوئے ہیں مگر اب زمانہ کے تقاضوں کے لیے خوف پیدا ہو چلا ہے کہ کہیں مسلمان قرآن کی روح سے آشنا ہو کر انقلاب برپا نہ کر دیں۔ ابھی تو بندہ مومن بھی سرمایہ داری کی زنجیروں میں بندھا ہوا ہے مگر سرمایہ داری کی زنجیروں میں بندھا ہوا ہے مگر سرمایہ داری کا طلسم ٹوٹ رہا ہے! اور اب عین ممکن ہے کہ مسلمان حامل قرآن ہو کر ابلیس کا تختہ الٹ دیں اور دنیا کی حکومت خود سنبھال لیں چنانچہ وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کو بیدار نہ ہونے دو یہی سب سے بڑا کام ہے جو اس کے مریدوں کو کرنا ہے۔

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دیں
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں
الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر — حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں!
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب — یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے — یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

اور پھر وہ الہیات کے ان مسائل پر روشنی ڈالتا ہے جن میں الجھ کر مسلمان اپنا مقصد

زندگی اور شرع پیمبر بھول گیا ہے۔

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسم شش جہات — ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے — ہیں صفات ذات حق، حق سے جدا یا عین ذات

آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے — یا مجدد جس میں ہوں فرزند مریم کے صفات

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم! — امت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات

کیا مسلماں کیلئے کافی نہیں اس دور میں — یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے — تا بساط زندگی میں اسکے سب مہرے ہوں مات

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام — چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر — جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں — ہے حقیقت جسکے دیں کی احتساب کائنات

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے — پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

علامہ اقبال نے ایک ایک کر کے ان امراض کا ذکر کیا ہے جو مسلمانوں کو لاغر اور کمزور کئے ہوئے ہیں اور اس سے انھوں نے کردار کی دولت چھین لی ہے چنانچہ اس بحث میں الجھے رہنا کہ اسلامی سوشلزم جائز ہے یا ناجائز اور قرآنی اصولوں پر زور دینا ابلیس کے منصوبے پر عمل کرنا ہے۔ خود اقبال نے کہا ہے کہ اشتراکی جمہوریت اسلامی اصولوں کے مطابق ہو گی ہمیں اسوقت کمیونزم یا سوشلزم کی نسبت سرمایہ داری سے زیادہ خطرہ ہے جو دولت کو چند ہاتھوں میں مقید کر کے اور ملک میں غربت پھیلا کر بالواسطہ سوشلزم کو دعوت دے رہے ہیں اگر وہ خدا کی امانت کا صحیح استعمال کرتے تو سوشلزم خود بخود مر جاتا سوشلزم کو ختم کرنے کا طریقہ یہ نہیں کہ اسکی گردن مارنے پر تلے رہیں بلکہ یہ ہے کہ ان اسباب کو ختم کیا جائے جو سوشلزم کو پیدا کرتے ہیں ادھر ہمیں جسطرح اقبال نے ابلیس کو مارنے کی بجائے مسلمان کر لیا تھا سوشلزم کو مارنے کی بجائے اسے مسلمان کر لینا چاہئے اور اقبال کا یہی نظریہ ہے۔

اردو غزل

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز!
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

مولانا حالی مجموعہ نظم حالی کے دیباچہ میں فرماتے ہیں "طرز جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا البتہ میں نے اردو زبان میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائیدار بنیاد ڈالی اس پر عمارت چننی اور اس پر قصر رفیع الشان بنانا ہماری آئندہ ہونہار اور مبارک نسلوں کا کام ہے جن سے امید ہے کہ اس بنیاد کو ناتمام نہ چھوڑیں گے۔"

حالی جن کے متعلق مشہور ہے کہ وقت کی راگنی الاپتے رہتے تھے مستقبل پر گہری نظر رکھتے تھے چنانچہ ان کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور اردو ادب میں انھوں نے جس نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائیدار بنیاد ڈالی تھی اس پر قصر رفیع الشان بنانے کا کام اقبال کے مبارک ہاتھوں انجام پایا۔ اردو شاعری کو سماجی، عمرانی اور قومی مسائل کے بیان کا ذریعہ بنانے کی طرف سب سے پہلے حالی نے توجہ دلائی۔ اور خود بھی اپنی نظموں اور غزلوں کو نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق لکھنا شروع کیا۔ اگرچہ وہ اپنے اس کام میں پوری طرح کامیاب نہ ہوئے لیکن اردو شاعری کو ایک نئی راہ ضرور دکھا گئے اور اس طرح حالی نے غزل میں نئے نئے مضامین

داخل کر کے اسے وسعت دی لیکن بسا اوقات تغزل کی اپنا دامن چھڑا کر ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس کے باوجود ان کے ہاں اچھی غزلوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ لیکن ایک تو ان کی نظموں کی شہرت نے کسی کو ان کی غزلیات کی طرف توجہ کرنے کی مہلت نہ دی دوسرے دین بزرگان سے انحراف کی وجہ سے ان کے خلاف ارتداد کا فتویٰ جاری کر دیا گیا حالی نے جس کام کی ابتدا کی تھی اس کی تکمیل اقبال کے ہاتھوں ہوئی اور انھیں بھی تقریباً ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ حالی کی طرح اقبال کی غزلیات کو بھی ایک عرصہ تک نظر انداز کیا جاتا رہا لیکن اب ان کی طرف کچھ توجہ دی جا رہی ہے اقبال بھی ایک نظم گو حیثیت سے مشہور ہوئے اور ایسا ہونا چاہئے تھا کیونکہ بانگ درا کا شاعر غزل کی بجائے نظم کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے اور نظم کے گیسو سنوارنے میں اتنا منہمک ہے کہ غزل کی طرف بس کبھی کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتا ہے۔ شاید اقبال بھی حالی کی طرح وقت کی ضرورت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ بانگ درا کے پہلے حصے میں صرف بارہ غزلیں دوسرے میں چھ اور تیسرے حصے میں آٹھ غزلیں ملتی ہیں۔ ان چھبیس ۲۶ غزلوں میں بھی ہمواری اور پختگی نہیں پائی جاتی اور ان میں خون جگر کی وہ آمیزش نظر نہیں آتی جس پر علامہ نے بعد میں اتنا زور دیا پہلے حصے میں وہ داغ سے متاثر نظر آتے ہیں۔

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہوشیار کیا تھی

یہ اور اس قسم کے اشعار پر داغ کی چھاپ واضح طور پر نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو ان کے اپنے میلان طبع کو ظاہر کرتے ہیں۔

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

دوسرے حصے میں بھی وہ روایتی شاعروں کی تقلید میں اسیر نظر آتے ہیں ابھی حسن وعشق کے نظریات میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی ۔

حسن کی تاثیر پہ غالب نہ آسکا علم !!
اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

انھیں اس بات کا خود بھی احساس ہے کہ ابھی وہ موضوعات اور اسالیب دونوں میں وہ اجداد پر گامزن ہیں چنانچہ اعتراف کرتے ہیں کہ

ع تمام مضمون مرے پرانے کلام میرا خطا سراپا

لیکن یہی احساس انھیں نئی نئی راہیں تلاش کرنے پر اکساتا رہتا ہے ان کا فن برابر ترقی کے مراحل طے کرتا رہتا ہے اور ان کی گرفت شاعری پر بڑھتی رہتی ہے۔ تیسرے حصے میں وہ اس مقام پر آپہونچتے ہیں جہاں سے کہہ سکیں۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں !
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

لیکن یہ ان کی منزل نہیں ہے ۔ منزل پر پہونچنے کے لئے بال جبریل کی ضرورت ہے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ انھوں نے بانگ درا میں غزلیہ شاعری پر زیادہ توجہ نہیں دی اور تغزل کی پری کو شیشے میں اتارنے کے لئے ان تمام حربوں سے کام نہیں لیا جو ان کے فن کی زنبیل میں پوشیدہ تھے - ان غزلوں میں ان کی شخصیت کا جادو نہیں ملتا آگے چل کر بال جبریل کی غزلوں میں ان کا فکر تخیل اور ساتھ ساتھ ان کا حسن بیان ارتقا کے بہت سے

مدارج طے کر کے اپنی حد کمال کو پہونچ گیا ہے۔ بال جبریل میں اقبال کی غزلیں اک نئے انداز اور اک نئی شان سے جلوہ گر ہوئی ہیں۔ جس سے دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں غزل کو اس انداز اور اس سج دھج سے انھوں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسی لئے بعض نے تو ان کی غزلیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس گروہ کی نمائندگی کرتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب کی چند غزلیں (لفظ چند غور طلب ہے) بال جبریل کے شروع میں ہیں اور یہ ان کی غزل گوئی کا چوتھا دور ہے۔ لیکن زبان اور مضمون دونوں حیثیتوں سے ہم ان کو بہ مشکل غزل کہہ سکتے ہیں غزل کی ایک خاص زبان ہوتی ہے۔ جو نرم، لطیف، شیریں، خوشگوار اور لوچدار ہوتی ہے لیکن ان غزلوں کی زبان ان اوصاف سے خالی ہے۔"

مولانا کی یہ رائے پڑھ کے مجھے بے اختیار اقبال کے یہ شعر یاد آجاتے ہیں۔

آئے عشاق گئے وعدہ فردا لے کر ۔۔۔ اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لیکر
تھا جنہیں ذوق تماشا وہ تو رخصت ہو گئے ۔۔۔ لیکے اب تو وعدہ دیدار عام آیا تو کیا
آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ ۔۔۔ صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال ۔۔۔ اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دلنشیں

آپ کہیں گے "یہ تو نظموں کے شعر ہیں"۔ جی ہاں! یہ نظموں ہی کے شعر ہیں لیکن ان میں تغزل اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ شاعر جس کی نظموں میں بھی تغزل کی یہ رچی ہوئی کیفیت پائی جاتی ہو۔ اس کی غزلیں تغزل کے رس سے کیسے خالی ہو سکتی ہیں؟ لیکن یہاں نظموں سے بحث نہیں ہے اس لئے آپ بال جبریل کی غزلوں کے چند شعر سنیئے اور خود ہی

فیصلہ کیجئے کہ کیا انھیں "بہ مشکل" غزل کے شعر کہا جا سکتا ہے؟

گیسوئے تابدار کو اور بھی تاب دار کر — ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

نظر آتیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں — نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے وہ چشم سرمہ سا کیا ہے

حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو — مری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی — یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ دور پیمانہ — فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزم جانانہ

وہ ملتفت ہوں تو کنج قفس بھی آزادی — نہ ہوں تو صحن چمن بھی مقام مجبوری

ان اشعار میں مجاز اور حقیقت اس طرح ہم آغوش ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں یہاں اقبال نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے انھیں رنگوں سے کام لیا ہے جو محبوب کی تصویر کے نقش بنانے میں صرف ہوتے ہیں یہی ان کا اعجاز ہے اور یہی ان کی کیمیاگری ہے جو فلسفہ کو شعر بنا دیتی ہے۔

لیکن ذکر ہو رہا تھا اقبال کی غزلوں میں ایک خاص مضمون اور ایک خاص زبان کے نہ ہونے کا۔ کیا غزل کے لئے کسی خاص مضمون یا زبان کا ہونا ضروری ہے؟ اس سوال کا جواب پانے کے لئے ہمیں اردو اور فارسی یا زبان کا ہونا ضروری ہے۔ اس سوال کا جواب پانے کے لئے ہمیں اردو اور فارسی کے غزلیہ سرمایہ پر ایک نظر ڈالنی ہوگی اس سلسلے میں ہماری سب سے بہتر رہنمائی مولانا عبدالسلام ندوی کے استاد گرامی مولانا شبلی کر سکتے ہیں، وہ شعرالعجم میں تفصیل سے بتاتے ہیں کہ غزل میں عاشقانہ مضامین کے علاوہ فلسفہ الہیات، اخلاق اور تصوف کے مضامین کو بھی برتا گیا ہے اردو میں بھی غزل کا موضوع مختلف مضامین رہے ہیں۔ میر نے اسے ایک صدا لئے درد ناک بنایا، خواجہ میر درد نے

اسے عرفان و آگہی کا درس دیا۔ جرأت نے اسے "چوما چاٹی" انشا نے کھل کھیلنے کا انداز اور مومن نے شوخی اور شرارت سکھائی۔ غالب نے اسے تفکر اور تعمق سے آشنا کیا اور اسے ایک نیا اسلوب اور نیا لہجہ دیا۔ جس کی تکمیل اقبال کے ہاں ملتی ہے۔ غرضیکہ غزل کا کوئی روپ کبھی بھی قائم نہیں رہا۔ وہ ہر عہد میں اپنے دامن کو تازہ پھولوں سے بھرتی رہی اور روح عصر کو غزل کے سانچے میں ڈھالتی رہی ہے اگر وہ ایسا نہ کرتی، تو زمانے کے زبردست ہاتھ نے کبھی کا اسے موت کی گہری نیند سلا دیا ہوتا۔ اس کی زندگی اس کا ثبوت ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیتی رہی ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ نقاد اس کے ہر نئے روپ کو دیکھ کر اسے پہچاننے سے انکار کرتے رہے ہیں چنانچہ نقادوں کے لئے بارہویں اور تیرہویں صدی کی متصوفانہ غزل کو تسلیم کرنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ بیسویں صدی کی تنقید کے لئے اقبال کی عمرانی غزل کو غزل کہنا۔ غور کا مقام ہے اگر عشق مجازی کے بعد عشق حقیقی کو غزل کا مضمون تسلیم کیا جا سکتا ہے تو ایک تیسری قسم کے عشق[۱] (جسے پروفیسر حمید احمد خاں نے عشق انسانیت کہا ہے) کے بیان سے غزل کیوں غزل نہیں رہتی ——— بالخصوص اس صورت میں جب اس نئے عشق کا بیان بھی جذبے کی اسی شدت سے کیا جائے جو غزل کی روایت ہے۔

اب تک غزل انفرادی تجربات کو رمزی اور علامتی اسلوب کے ذریعے بیان کرتی رہی تھی لیکن اقبال نے اس میں نفسِ اجتماعی کی نفسیاتی کیفیتیں بیان کی ہیں، فرد کی طرح جماعت بھی تخیل اور جذبہ رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ افراد ہی کا مجموعہ ہے اور اس لئے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس کا اظہار غزل میں نہ ہو سکے۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں یہ غزل کا نیا روپ ہوگا، جس کی ترقی کے امکان کی کوئی حد نہیں۔" اقبال کی غزل کا یہ نیا روپ ترقی کے ان

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تصورِ عشق

لامحدود امکانوں کا اشارہ ہے جس کی طرف ہم نے ابھی پوری توجہ نہیں کی دیکھئے ان اشعار میں اقبال نے غزل کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام — اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں
متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی — یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی
نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی — تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا — میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں
زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا — طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی
اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا — مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں! — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

آپ نے دیکھا اقبال اپنی مینائے غزل میں نئی شراب کس طرح پیش کی ہے، زلف و گیسو، مے و میخانہ، عشق و جنوں، کوہکن و پرویز وغیرہ جیسے بے جان استعارے اور علامتیں اقبال کے ہاں ایک نئی زندگی پاتے ہیں۔ اقبال قاری کی نئی نئی یادوں کو تازہ کرنے کے لئے ان میں نئے نئے مضموں بڑی خوبی سے پیدا کرتا ہے۔

سطورِ بالا کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی۔ کہ غزل کے لئے مضمون کی قید کبھی نہیں رہی اور جب مضمون بدل جائے، تو اسلوب کا بدل جانا قدرتی بات ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ تغزل کے لئے مضمون اور اسلوب سے زیادہ کسی اور شے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ شے کون سی ہے، "اردو غزل" کے مصنف کی زبان سے سنیئے۔

" شعر کی خوبی کا معیار نہ اسلوب میں نہاں ہے، نہ موضوع میں بلکہ شعریت

ان دونوں سے بالاتر ہے۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ شعریت تخیلی فکر اور جذبے کی ہم آمیزی کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی اور یہی دونوں تغزل کی جان ہیں "

بال جبریل کی غزلوں کے مطالعے سے یہ حقیقت بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ ان غزلوں میں جذبے کی شدت اور والہانہ کیفیت، جذب و مستی، تخیل کی بلندی اور فکر کی گہرائی میں اردو کا کوئی شاعر بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ فلسفہ کو شعر بنا دینا کسی اور کے بس کی بات نہیں فلسفہ اقبال کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اور تغزل ان کے مزاج میں اس طرح بس گیا ہے وہ دونوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے ان کی فلسفیانہ نظموں میں غزل اور غزلوں میں فلسفہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ زندگی کے متعلق ان کی نظر نہایت وسیع ہے اور ان کا مخصوص فلسفہ حیات بھی ہے اس لئے ان کے رمز و کنائے میں ایک جہان معنی پوشیدہ ہوتا ہے معنی کے علاوہ کلام کے ظاہری محاسن کا استعمال بھی ان غزلوں میں فن کارانہ طریق پر ملتا ہے صنائع لفظی و معنوی ان کے کلام میں بے تکلف چلے آتے ہیں۔ بن بلائے مہمان کی طرح نہیں کہ جس کی آمد ناگوار ہوتی ہے۔ کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ صنعت کو محض صنعت کی خاطر استعمال کیا گیا ہے۔

اقبال انسانیت کا شاعر ہے اور اس کو انسانیت کے درخشاں مستقبل پر پورا یقین ہے، اس کے نزدیک انسان لامحدود قوتوں کا مالک اور تسخیر کائنات کا اہم کام کرنے کا اہل ہے۔ اقبال کا انسانیت کی عظمت پر یہ یقین ان کے کلام میں رجائیت کا عنصر پیدا کر دیتا ہے اس کے سوز میں ساز اور غم میں نشاط کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی آواز میں مستی اور والہانہ کیفیت ہوتا ہے، جسے سن کر بے اختیار پکار اٹھتے ہیں۔

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

اقبال کی غزل میں قوت اور توانائی کا احساس ہوتا ہے جو ان سے پہلے کی غزل میں مفقود ہے، یہ قوت یا توانائی ان کے نصب العینی عشق یا عشق نصب العین کی پیدا کردہ ہے اقبال سے پہلے اردو غزل کا عاشق بے کسی اور بے چارگی کا مجسمہ ہوتا تھا۔ وہ کبھی محبوب کی دیوار کے سائے تلے پڑا نظر آتا ہے۔ اور کبھی راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کی گلی کا چکر لگاتا ہے کبھی صحرا میں گریباں چاک اور سر پر خاک ڈالے نظر آتا ہے۔ کبھی کوچۂ رقیب میں سر کے بل جاتے ہوئے دکھائی دیتا ہے وہ گالیاں کھا کے بے مزہ نہیں ہوتا بلکہ نہایت لجاجت اور رحم طلب نگاہوں سے محبوب کو دیکھتا رہتا ہے رنج والم اور درد وغم کے اس لہجے کی آواز میں درد و سوز نرمی و سکینی، بے کسی و بے چارگی کا پیدا ہو جانا لازمی امر تھا اسی کو مولانا نے نرم، شیریں، اور لوچدار زبان کہا ہے، لیکن اقبال کا عاشق بے کسی و بے چارگی اور حسرت و یاس نہیں سیکھتا بلکہ اس سے تو غلاموں پر اسرار جہانگیری کھلتے ہیں، اقبال کا عاشق کبھی آتش نمرود میں بے خطر چھلانگ لگاتے ہوئے نظر آتا ہے تو کبھی ایک ہی جست میں زمین و آسماں کی بے کرانی کو ختم کر دیتا ہے۔ وہ جب کائنات کی وسعتوں کو اپنے لئے ناکافی سمجھتا ہے تو یزداں گیری کے منصوبے باندھتا ہے۔ جب دونوں نظریہائے عشق میں اتنی پستی، اتنی بلندی ہو تو پھر انداز بیاں میں کیوں نہ فرق پیدا ہو۔ پہلے جہاں میں نرمی، شیرینی لطافت تھی وہاں دوسرے میں عظمت تازگی اور وقار ہے اسی سے دونوں کے لہجے میں فرق پیدا ہوتا ہے پہلے میں نرمی اور سکینی تھی تو دوسرے میں قوت اور توانائی ملتی ہے۔

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں   غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

بال جبریل کی پہلی غزل ہمارا یہ پہلا شعری ہمیں اقبال کے مخصوص لہجے سے آشنا کرتا ہے اس غزل اور اس طرح کی دوسری غزلوں میں قوت اور توانائی اور لہجے کی تیزی کا جو احساس ہوتا ہے وہ اردو غزل کے لئے ایک بالکل نئی چیز ہے یہاں حریر و پرنیاں کی نرمی اور فولاد کی سختی دونوں ملتی ہیں، اقبال کے فلسفہ کی طرح اقبال کی شاعری بھی جلال و جمال کی آمیزش سے بنتی ہے۔ اور یہاں شاعری ساحری کی منزل سے گذر کر پیغمبری کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔

اقبال اور ہم

من اے میر امم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند!

آج ہم سب یہاں اس شخص کا دن منانے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں جو نہ صرف بحیثیت شاعر کے عظیم ہے بلکہ جو پاکستان کے تصور کا خالق بھی ہے جو ایک مفکر اور فلسفی بھی ہے اور قائد اور رہنما بھی۔ اگر وہ صرف شاعر ہوتا تو میں آپ کے سامنے اس کے کلام کے محاسن پیش کر دیتا۔ دوسرے حضرات اس کی شاعری پر مقالے لکھتے اور یوں ہم سب اپنے فرائض سے عہدہ برا ہو جاتے لیکن اقبال صرف شاعر نہیں بلکہ حکیم الامت بھی ہیں اس لئے جب مجھ سے کہا گیا کہ میں یوم اقبال پر مقالہ پڑھوں تو میرا جی چاہا کہ میں اقبال کی شاعری کے محاسن گنوانے کے بجائے آپ سے چند باتیں کروں اور اپنے دل میں پیدا ہونے والے ان خیالات کو آپ تک پہونچا دوں جو مجھے بے چین کئے ہوئے ہیں۔

آپ جانتے ہیں یوم اقبال پاکستان میں منایا جاتا ہے اور اب تو جلسوں کی بھرمار کا یہ عالم ہے کہ اپریل کے پورے مہینے میں شاعر مشرق کی یاد میں جلسے ہوتے رہتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف جلسے کر دینے سے ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے

ہیں؟ یہ درست ہے کہ یوم اقبال مناکر ہم ایک مفید کام کرتے ہیں کیونکہ اقبال کے افکار کی ترویج کا ایک ذریعہ یہ جلسے بھی بنتے ہیں لیکن کسی شخص کی یاد کو منانے کا بہترین ذریعہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اس کی تعلیمات پر عمل کیا جائے آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ اگر کوئی آپ سے یہ کہے کہ وہ آپ کی بے حد عزت کرتا ہے اور آپ کو اپنا قومی ہیرو مانتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ شخص قول و فعل کے اعتبار سے آپ کی بتائی ہوئی راہ پر نہ چلے تو کیا آپ اسے اپنا چاہنے والا ماننے پر تیار ہوں گے؟ میرے خیال میں کوئی ذی ہوش انسان بھی اس طرح کی عقیدت کو پسند نہیں کرتا۔ غور فرمائیے جو چیز آپ اپنے لئے پسند نہیں کرتے اسے ایسی مقتدر اور قابل احترام ہستیوں کے لئے جائز سمجھنا کہاں کا انصاف ہے! یوم اقبال بھی اب نمائشی بن گیا اور اس سے لوگ اپنا اقبال بلند کرنے کا کام لیتے ہیں نمائش کا زہر ہمارے رگ و ریشے میں سرایت کر گیا ہے اور ظاہر ہے کہ نمائش کا کوئی فائدہ نہیں قومی زندگی میں یہ بڑے خطرناک نتائج پیدا کرتی ہے اس نمائشی رجحان کی وجہ سے ہی ہم نے روح کو چھوڑ کر صرف جسم سے رشتہ جوڑا ہے ہمارے روزے قربانی حج اور دوسرے اجتماعات سب نمائشی ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ مسلمان روز بروز قعر مذلت میں گرتے جارہے ہیں اسی لئے تو علامہ اقبال نے کہا تھا۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے — مسلمانوں میں خون باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں سجدہ بے ذوق — کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

ان اشعار سے علامہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نماز، روزہ اور قربانی کی ضرورت نہیں ہے اور ضرور منائیے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ان چیزوں میں جذب اندروں کا موجود

ہونا ضروری ہے جو انسان کو زندگی عطا کرتا ہے۔ جب تک یہ موجود نہ ہوگا صرف اجتماع سے کوئی فائدہ نہیں۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کسی بھی شخص کا دن منانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی تعلیمات پر عمل کیا جائے اور اس منزل کو پانے کی کوشش کی جائے جس کے لئے وہ ساری عمر کوشاں رہا۔ علامہ اقبال ساری زندگی عمل کی تلقین کرتے رہے لیکن ہم بے عملی کے رسیا ہیں اقبال نے ہمیں اتحاد کا درس دیا اور ایک ہو جانے کی تلقین کی، مگر ہم ابھی تک من و تو کے جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہم جتنا خیال اپنے مغل، مرزا، خواجہ، افغان اور سید ہونے کا کرتے ہیں۔ اتنی اہمیت اسلام کو نہیں دیتے۔ یہ سوال آج بھی طلب ہے کہ:

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو!
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

اقبال نے تسبیح کے ان دانوں کو ایک لڑی میں پرونا چاہا مگر یہ آج بھی اسی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ اس نے ان کو نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر کی خاک تک یک جان کرنا چاہا، مگر ان میں اب بھی وہی اختلاف ہے۔ جو پہلے تھا اقبال نے جس اتحاد کا درس دیا تھا۔ ہم نے اس کو پس پشت ڈال دیا اور اپنی جمعیت کو پریشان کر دیا اس نے فرد کی بقا کے لئے ربط ملت کو ضروری قرار دیا تھا، مگر آج ملت کا وجود ہی خطرے میں ہے۔ کیونکہ ملت کی جمعیت مذہب سے ہے اور ہم روز بروز مذہب سے بیگانہ ہوتے چلے جاتے ہیں مغرب کی نقل کا بھوت ہمارے سر پر سوار ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری نجات مغرب کی تقلید میں ہے ہم نے علامہ مرحوم کا یہ فرمودہ بھلا دیا۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

ہم نے مذہب سے منہ موڑا اور مسجد کی بجائے کلب اور ہوٹل آباد کئے۔ نماز پر ڈانس کو ترجیح دی اور اس طرح ملت اپنے مرکزِ ثقل سے ہٹ گئی۔ آج چوری ڈاکے، زنا اور جھوٹ کی بادشاہی ہے۔ کوئی اخبار اٹھا کر دیکھیے وہ ہمارے اخلاقی انحطاط پر ماتم کرتا نظر آئے گا۔ اس کے صفحات اس بات کے گواہ ہیں کہ ہم انسانیت کے بلند درجے سے گر گئے ہیں اور حیوانیت کی ہوس نے ہم پر قابو پا لیا ہے ہم نے ان اسلامی اصولوں کو نظرانداز کر دیا جن کی ترویج کے لیے علامہ اقبال ساری عمر کوشاں رہے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن !
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن !

ہم بغیر قرآن کے زندہ رہنا چاہتے ہیں جو علامہ کے نزدیک ممکن نہیں ان قرآنی اصولوں کو انھوں نے اس طرح شعر کا جامہ پہنا دیا کہ وہ شعر بھی رہے اور پیغام بھی اس طرح شاعری پیغمبری کے حدود میں داخل ہو گئی۔ اب کسی افلاطون کو یہ ضرورت نہ رہی کہ وہ شاعری کو اپنی ریاست سے نکال باہر کرے اور ہم ہیں کہ ابھی تک گھٹیا ادب اور فلمی گانوں پر جان دیتے ہیں۔

جس ملک کا علامہ نے خواب دیکھا تھا اور جس کی تعبیر قائداعظم کے ہاتھوں ہوئی اس کے عوام کی جو حالت ہے اس کا وہ تصور بھی نہ کرتے تھے۔ انھوں نے تمام تر مساعی اس لئے صرف نہ کی تھی کہ اس ملک کے بسنے والوں میں تمیزِ آقا و بندہ قائم رہے اور فسادِ آدمیت کا باعث بنے۔ سرمایہ دار حیلہ گر مزدورِ سادہ کو دیتا رہے۔ خواجہ بلند بام اور بندہ کوچہ گرد رہے

خدا کی اس خدائی میں مزدور کے اوقات تلخ ہوں اور دولت صرف چوبیس گھرانوں میں مقید ہو جائے. کیا یہ سب اقبال کی تعلیمات کے مطابق ہے؟ اقبال تو کہتا ہے۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اس کی روح آج بھی پکار پکار کر کہہ رہی ہے
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ!

اقبال نے تن کی دولت کی مذمت کی کہ یہ چھاؤں ہے جو آتی جاتی رہتی ہے لیکن ہم اسی چھاؤں کے پیچھے بھاگتے رہے۔ ہم جو چند پیسوں کے عوض اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دیتے ہیں اور کرسی اقتدار کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی بجائے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ آج قلندر کی یہ بات کہ

تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

جو اقبال کو پانی پانی کر گئی تھی۔ ہماری پیشانی پر عرق انفعال کا ایک قطرہ بھی نہیں لا سکتی۔ اقبال نے خودی کو بلند کرنے کا درس دیا اور ہم نے جھک جھک کر رفعتیں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ علامہ نے جس دولت کو ٹھکرا دیا ہم نے اس کے لیے اپنے آپ کو بیچ دیا۔ ہم نے اس کے لیے آپ کو بیچ دیا۔ ہم نے وہ سب کچھ کیا جو خودی کے لیے زہر قاتل ہے۔

اقبال نے تو افرنگی صوفوں، کا گلہ کیا تھا۔ مگر اب تو زبان تک افرنگی ہے جب انگریز یہاں تھا تو انگریزی کے تسلط کی وجہ سمجھ میں آسکتی مگر اس کے جانے کے بعد بھی گیسوئے اردو کا منت پذیر شانہ ہی ہمارا انگریز کی ذہنی غلامی کی یاد دلاتا ہے۔ وہ انگریز جس کی تہذیب پر علامہ نے اپنے ترکش کے سب سے زہریلے تیر چلائے ہیں لیکن ہماری

ہمت کی داد دینی چاہیے کہ ہم آج بھی اپنی تہذیب پر اسی انگریز کی تہذیب کو اور اپنی زبان پر اسی انگریز کی زبان کو ترجیح دیتے ہیں۔

میں نے یہ سب کچھ آپ سے اس لئے کہا ہے کہ آپ اقبال کے شیدائی ہیں اگر آپ اقبال کے شیدائی نہ ہوتے تو اس وقت اس جلسے میں موجود نہ ہوتے اقبال کے شیدائی ہونے کے حیثیت سے آپ پر جہاں یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان کی یاد میں یوم اقبال منائیں وہاں یہ فرض بھی آپ ہی کا ہے کہ لوگوں کو اقبال کی تعلیمات عمل پیرا کرنے کے لئے کوئی ٹھوس قدم اٹھائیں۔ مجھے معلوم ہے کہ :

کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

اس لئے میں ان سے مایوس بھی نہیں ہوں۔ صرف اقبال کے پیغام کو ایک تحریک کا درجہ دینے کی ضرورت ہے یہی وجہ ہے کہ :

مجھے خلوت نوا پہ پے بہ پے مجبور کرتی ہے
کہ ابھی محفل میں ہے شاید کوئی درد آشنا باقی

ممکن ہے آپ کی طبیعت پر میری یہ باتیں گراں گزریں لیکن میں ان کے کہنے کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں اور میں نے کہہ بھی دی ہیں۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ ان پہ غور کریں کیونکہ :

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر!
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی!

(یہ تقریر یوم اقبال کے موقع پر پڑھی گئی)

ایک آرزو

دورِ اوّل کی نمائندہ نظم

ہر شاعر کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہی ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ اس کے کلام کی خصوصیات تک رسائی حاصل کر سکیں اس کے لئے ہم کو اس کے ہر شعر، ہر غزل اور نظم کو گہری نظر سے دیکھنا پڑتا ہے۔ تب گوہر مقصود ہاتھ لگتا ہے یہ بات بہت کم شاعروں کے یہاں پائی جاتی ہے کہ ان کی ایک نظم ان کے کسی خاص دور یا ان کی تمام خصوصیات کلام کی حامل ہو اقبال ہی ایک ایسا شاعر ہے جس کے کلام کے ہر دور کی امتیازی خصوصیات اس کی اس دور کی ایک مخصوص نظم میں نظر آتی ہیں چنانچہ ان کے دور اول میں کی نمایاں خصوصیات کی طرف ان کی نظم ایک آرزو میں واضح اشارے ملتے ہیں۔

جیسا کہ ان کی نظم کے عنوان سے ظاہر ہے علامہ نے اس میں اپنی ایک آرزو کا ذکر کیا ہے ان کی یہ آرزو ان کے ابتدائی دور کے کلام کی خصوصیات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ اقبال جو کچھ محسوس کرتے سوچتے اور چاہتے ہیں اس کو نہایت ایمانداری اور

صداقت سے اپنے کلام میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے احساسات وخیالات الفاظ کا جامہ
پہن کر اس طرح نمودار ہوتے ہیں کہ ہمیں اقبال کی شخصیت کے خطوط مرتب کرنے میں
کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ جذبہ اور خلوص کی بے پناہ شدت ان کے اشعار کو تاثیر
سے مملو کرتی ہے۔ اور وہ شاعر کے احساسات وخیالات کے ترجمان بن جاتے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ ان کے محسوسات اور خارجی خیالات کے ردعمل نے ایک آرزو کی شکل
اختیار کرلی ہے اور اس چھوٹی سی نظم میں ان کے ابتدائی کلام کی نمایاں خصوصیات۔۔۔
جو بانگ درا کے صفحات پر بکھری پڑی ہیں۔ سمٹ کر آگئی ہیں۔

علامہ کے ابتدائی دور کی خصوصیات میں ان کی مناظر قدرت کے ساتھ جذباتی وابستگی
حب وطن اور اس کے نتیجہ میں اپنے ہم وطنوں کی خدمت اور اہل وطن کے لئے دردمند
بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال کے اس دور کے لئے دردمند دل بنیادی
حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال کے اس دور کے کلام کے سرسری مطالعہ
سے جو چیز نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ ہے ان کا استفہامی انداز۔ وہ اپنے گرد و پیش سے چاند سے
سورج سے ہمالہ سے اور اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان سے اپنے
درد کا درماں دریافت کرتے ہیں۔ ایک حیرت واستعجاب کی کیفیت ان پر چھائی رہتی
ہے وہ اپنے ملک وقوم کی ناکامیوں کا علاج دریافت کرنے میں ناکام رہے ہیں اگرچہ بعد
میں ان کے کلام میں ملک وقوم کے کہنہ امراض کا علاج نظر آتا ہے۔ جس نے ایک مربوط
فلسفہ کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اس لئے ایک اور بے چینی ہے۔ جس نے ان کے
کلام میں ملک وقوم کے کہنہ امراض کا علاج نظر آتا ہے۔ جس نے ایک مربوط فلسفہ کی
صورت اختیار کرلی ہے۔ اس لئے ایک خلش اور بے چینی ہے۔ جس نے ان دردمند دل

کو پریشان کر رکھا ہے۔ وہ جب اپنے گردوپیش پر نظر ڈالتے ہیں تو اپنے ہم وطنوں کی بے بسی کو دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ وہ اس کے اسباب و علل کا تجزیہ کر کے کوئی علاج دریافت نہیں کر سکے اس لئے کبھی ماضی کے اوراق کی ورق گردانی کرتے ہیں کہ شاید یہیں سکون قلب کا کوئی سامان ہو چنانچہ ہمالہ سے کہتے ہیں۔

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکن آبائے انساں جب بنا دامن تیرا

اور کبھی "گل رنگیں" سے اس کے سینہ میں مستور راز کا پتہ چلانا چاہتے ہیں۔

سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے
راز وہ کیا ہے تیرے سینے میں جو مستور ہے

اور پھر یکایک انھیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی منزل سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ وہ خود:

میری صورت تو بھی اک برگ ریاض طور ہے
میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے

اور کبھی "خفتگان خاک" سے پوچھتے ہیں۔

جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا
واں بھی انساں ہے قتیل ذوقِ استفہام کیا

یہی حیرانی اور سرگردانی شاعر کو زندگی کے ہنگاموں سے فرار پر مجبور کرتی ہے۔ اور وہ پکار

اٹھتا ہے ؎

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب

کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

چنانچہ وہ اپنے لئے ایک ایسی جگہ پسند کرتا ہے جہاں کوہسار کا دلفریب نظارہ ہو ندی کا شفاف پانی ہو۔ سبزہ نورستہ ہو۔ گل ہو، بلبل ہو، چڑیوں کے چہچے ہوں، کتنا دلکش اور سہانا منظر ہے۔ جی چاہتا ہے ہم بھی شاعر کی طرح ایک ایسی ہی دنیا بسالیں لیکن اقبال کا دردمند دل اسے کہاں چین لینے دیتا ہے اس دنیا کے شور و شغب اور ہنگاموں سے دور رہ کر بھی حب وطن اور خدمت انسانی کا جذبہ ٹھنڈا نہیں پڑتا۔ اور وہ کسی تھکے ہوئے مسافر کی امید کا آخری سہارا بن جاتے ہیں۔

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم

امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو!

بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے

جب آسمان پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو!

اس نظم میں اگر یہ اشعار موجود نہ ہوتے تو اعتراض پیدا ہو سکتا تھا کہ اقبال جو ہر وقت خدمت اہل وطن کا درس دیتا ہے۔ اس نظم میں اپنی ایک الگ تھلگ دنیا بسائے بیٹھا ہے جہاں کسی اور کا گذر ممکن نہیں۔ لیکن یہاں بھی اقبال کے دل میں کسی بھولے بھٹکے مسافر کی خدمت کا جذبہ کارفرما ہے۔ یہی نہیں بلکہ انسانوں سے دور رہ کر بھی اس کا حساس دل اپنے ہم وطنوں کی غفلت پر بیتاب ہے اور اپنے دلگداز نالوں سے انھیں خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتا ہے۔

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر درد مند دل کو رونا مرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

کون ہے جو نظم کے اس آخری شعر میں شاعر کے دل کی کسک کو محسوس نہ کرے اور درد و غم کے تاریک بادلوں کو جو اہل وطن کی مدہوشی / بے ہوشی اور بے عملی کی وجہ سے ان کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔ نہ دیکھ سکے۔ وطن اور اہل وطن سے بے پناہ محبت

مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے اس زمانے میں دوسرے شعراء رسمی طور پر وطن کی محبت کے گیت گا رہے تھے اور سوائے چکبست کے کسی شاعر نے بھی شدت جذبہ سے مغلوب ہو کر حب وطن کی نظمیں نہیں لکھیں۔ لیکن چکبست بھی ہندوؤں کے ماضی میں گم ہو جاتے ہیں۔ ان کا تخاطب صرف ہندو قوم سے ہے اور وہ ہندوؤں ہی کی مذہبی روایات کے ترانے گاتے ہیں اور ان میں وطن کی محبت کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ برخلاف اس کے اقبال کا تخاطب کسی خاص فرقے یا قوم سے نہیں ان کی نظمیں ہر ایک کو متاثر کرتی ہیں۔ چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا عیسائی۔ اقبال جو کچھ محسوس کرتے ہیں اس کا گہرا تاثر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں بے پناہ تاثیر ہوتی ہے۔ اور ناممکن ہے کہ کوئی پڑھے یا سنے اور متاثر نہ ہو۔ حب وطن کی بہترین عکاسی ان کی نظم "نیا شوالہ" کرتی ہے جس میں وہ دیر و حرم کی بجائے ایک نیا شوالہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس نظم میں وہ دیر و حرم دونوں کا احسان اٹھانے سے انکار کرتے ہیں اور ان کی جدت پسند طبیعت اپنے لئے ایک مخصوص راستہ تلاش کر لیتی ہے۔

کانوں پہ ہو میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو نالہ مری دعا ہو

یہ رونا اور آہ وزاریاں کس لئے ہیں اپنے ہم وطنوں کے لیے جو خواب غفلت میں بے ہوش پڑے ہیں اور شاعر انھیں اپنے نالہ و بکا سے ہوشیار کرنا چاہتا ہے اس ہیں مند کسی کی تخصیص نہیں۔

حالی اور آزاد نے مناظر قدرت کی شاعری کی طرف لوگوں کی توجہ منعطف کرائی تھی۔ اور اقبال کے زمانہ میں شعراء وطن کی محبت میں سرشار ہو کر مناظر قدرت پر نظمیں لکھ رہے تھے۔ مناظر قدرت میں سے علامہ کو پانی کی روانی سے خاص الفت ہے اسی لئے ہمالہ والی نظم میں سب سے خوبصورت اور دلکش بند ندی کے بہتے ہوئے پانی ہی کے متعلق ہے ؎

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

زیر مطالعہ نظم میں بھی اقبال نے مناظر فطرت سے اپنی دلبستگی کا اظہار کیا ہے وہ اس دنیا کی شورشوں اور سازشوں سے الگ کہیں اپنا مسکن بنانا چاہتے ہیں۔ اور چونکہ انھیں قدرت کے حسین اور دلفریب نظاروں سے بے پناہ محبت ہے اس لئے وہ ایک ایسی وادی میں رہنا پسند کرتے ہیں جہاں ؎

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو!

ہو ہاتھ کا سرھانا، سبزہ کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو!

درختوں، پھولوں اور سبزہ کا تذکرہ کرتے کرتے وہ ندی کے "صاف پانی" کا ذکر شروع کرتے ہیں۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ علامہ کو دریا یا ندی کے بہتے ہوئے پانی سے ایک خاص لگاؤ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ندی کے پانی کا وہ سرسری تذکرہ کر کے نہیں گزر جاتے بلکہ اس چھوٹی سی نظم میں بھی تین شعر اور کہہ جاتے ہیں جو خوبصورتی اور دلکشی میں اپنا جواب نہیں رکھتے

ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کے اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو!!

علامہ کو بہتے ہوئے پانی سے اتنی محبت اس لئے ہے کہ اس کی روانی عمل پیہم کا سبق دیتی ہے۔ جو ان کے پیغام کا بہت بڑا حصہ ہے اور خودی کے تصور کی ابتدائی شکل ہے اس کے بعد کے شعر میں شام کے وقت کا منظر کس حسن سے بیان کیا ہے۔

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو!

اقبال کی یہ نظم اس لحاظ سے بھی دور اولیں کی نمائندہ نظم ہے کہ اس دور میں اقبال اپنی نظموں پر اکثر نظر ثانی فرماتے ہیں[1]۔ اور ان میں حک و اضافہ کر کے انھیں فنی اعتبار سے زیادہ خوبصورت بنانے پر اپنی توجہ صرف کرتے رہے۔ ایک آرزو ۱۹۰۲ء مخزن میں شائع ہوئی تھی اقبال نے بانگ درا کی اشاعت کے وقت اس پر بھی تنقیدی نظر ڈالی۔ شروع میں اس نظم کے دو بند تھے، انھوں نے نظر ثانی کے وقت دوسرا بند پورے کا پورا اور پہلے بند کے پانچ شعر حذف کر دیئے۔ پہلے بند کے مندرجہ ذیل شعر قلم زد ہوئے۔

---

[1] بانگ درا کی اکثر نظمیں اقبال کی نظر ثانی کی مرہون منت ہے۔

پتوں کا نظارا میری کتاب خوانی | دفتر ہو معرفت کا جو گل کھلا ہوا ہو
یوں وادیوں میں آکر ٹھہرے شفق کی سرخی | جیسے کسی لگی ہیں کوئی شکستہ پا ہو!
پچھم کو جا رہا کچھ اس طرح سے سورج | جیسے کوئی کسی کے دامن کو کھینچتا ہو
ظلمت جھلک رہی ہو کچھ اسطرح چاندنی میں | جوں آنکھ میں سحر کی سرمہ لگا ہوا ہو
دل کھول کر بہاؤں اپنے وطن پر آنسو | سرسبز جن کی نم سے بوٹا امید کا ہو

اور دوسرا بند یہ ہے۔

سمجھیں مرے سخن کو ہندوستان والے | موزون ہو گئے ہیں نالے سخن نہیں ہے
شمشاد گل کا بیری گل یاسمین کا دشمن | ہو آشیاں کے قابل یہ وہ چمن نہیں ہے
اپنوں کو غیر سمجھوں اس سرزمیں میں رہکر | میں بے وطن ہوں کوئی میرا وطن نہیں ہے
وہ مے نہیں کہ جس کی تاثیر تھی محبت | ساقی نہیں ہے باقی وہ انجمن نہیں ہے

در محفلے کہ یاراں شراب مدام کردند
چوں نوبتے بہ ماشد آتش بہ جام کردند!

ظاہر ہے کہ ان اشعار کے حذف کر دینے سے نظم کا مرتبہ بلند ہو گیا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے شروع میں ہی زبان و بیان پر بڑی توجہ دی ہے اور اپنی بات کو دلکش اور موثر انداز میں پیش کرنے کے لئے خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے۔
اس نظم میں حسین تشبیہوں اور دلکش استعاروں سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً سورج کا شام کی دلہن کو مہندی لگاتا۔ گل کی ٹہنی کا جھک جھک کر پانی کو یوں چھونا جیسے کوئی آئینہ دیکھ رہا، سبزے کا زمین کی آغوش میں سوتا۔ گل کی کلی پہ چٹک کر پیغام رسانی کرنا وغیرہ نادر تشبیہیں ہیں۔ اقبال نے تشبیہات اور استعارات کو استعمال کرتے ہوئے اس بات کا خاص

خیال رکھا ہے کہ وہ موقع و محل کے مطابق ہوں اور اتنے بعید از قیاس نہ ہوں کہ قاری ان سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔ وہ تو اپنے قرب و جوار کے حسین مناظر سے ہی تشبیہات حاصل کر لیتے ہیں تاکہ پڑھنے والا محظوظ بھی ہو اور آسانی سے ان کے پیچھے چھپے ہوئے معانی کو بھی تلاش کر لے۔ جوش اور روانی اقبال کے مزاج سے ہم آہنگ ہے خلوت میں بیٹھ کر بالا بیٹھتے رہنا ان کے مسلک کے خلاف ہے اس لئے جب وہ یہ آرزو کرتے ہیں کہ وہ دنیا کی محفلوں سے کنارہ کش ہو کر پہاڑ کے دامن میں الگ تھلگ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو کچھ تعجب سا ہوتا ہے مگر یہ تعجب جلد ہی رفع ہو جاتا ہے کیونکہ وہ یہاں بھی قوم کی بھلائی کے غم میں گھلے جا رہے ہیں۔ ہر وقت لوگوں کو آرام پہنچانے اور راستہ دکھلانے کا خیال ان پر مسلط رہتا ہے وہ بھولے بھٹکے مسافروں کے لئے رات بھر دیا جلائے رکھیں گے تاکہ ان کو راستہ تلاش کرنے میں آسانی ہو اور یہ کٹیا ان کے لئے پناہ گاہ بن جائے۔ کنج تنہائی میں بھی وہ اپنے دردناک نالوں سے قوم کو جگانا چاہتے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ شروع میں ایسی جگہ رہنے کی تمنا ظاہر کرتے ہیں جو شورش سے دور ہو اور جہاں سکوت کی حکومت ہو وہ خاموشی پر مرتے ہیں مگر جس جگہ وہ اپنا مسکن بناتے ہیں جب اس کی منظر نگاری کرتے ہیں تو وہ خاموشی سے کوسوں دور دکھائی دیتی ہے وہاں چڑیوں کے چہچے ہیں اور چشمے کی شورشوں میں باجا بج رہا ہے اور ظاہر ہے! اس شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی ہو گی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ انسانوں کے ہنگاموں سے دور جانا چاہتے ہیں۔ مگر جب وہ آخر میں کہتے ہیں کہ:

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

تو انسانوں کے وجود کا احساس بھی ہونے لگتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اقبال خواہش کے باوجود نہ تو دنیا سے کنارہ کر سکتے ہیں اور نہ سکوت، سکون اور خاموشی کی دنیا میں رہ سکتے ہیں۔ آگے چل کر ان کے مزاج کی اسی خصوصیت نے ان کو شاعر انقلاب اور عمل کا پیغامبر بنا دیا تھا۔

خضرِ راہ

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ جستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

اس نظم کا نام خضرِ راہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس میں علامہ اقبال حضرت خضر سے ملاقات کرتے ہیں اور زندگی کے مسائل کا حل پوچھتے ہیں اس نظم میں گیارہ بند ہیں مگر ہر بند میں شعروں کی تعداد مختلف ہے۔ ایک خیال کو ادا کرنے کے لئے جتنے شعروں کی ضرورت تھی اتنے ہی رکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد وہ قافیہ ظاہر کیا گیا ہے۔ یہاں شاعر نے ردیف اور قافیہ کو اس لئے بدل دیا ہے کہ اب وہ اس کا ساتھ نہیں دے سکتے اور صرف قافیہ کو نباہتے رہنے سے نظم کی روانی میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ آٹھ بندوں میں صرف قافیہ ہے اور تین ردیف کا بھی التزام کیا گیا ہے۔ ہر بند کے آخری شعر میں قافیہ کے ساتھ ردیف بھی موجود ہے اور پہلا قافیہ بھی بدل گیا ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں ایک بند ختم ہو گیا ہے۔ ہر بند کے آخری شعر میں علامہ نے مسلمانوں

سے خطاب کیا ہے اور پہلے اشعار میں کہی گئی بات سے نتیجہ اخذ کر کے مسلم خوابیدہ کو جگانے کی کوشش کی ہے اور کوئی نہ کوئی سبق دیا ہے مگر یہ بات پہلے دو بندوں میں نہیں ہے کیونکہ یہ حضرت خضر کی زبان سے نہیں بلکہ شاعر کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ ان دو بندوں کے آخری شعر بھی باقی بندوں کے آخری اشعار سے مختلف ہے۔ پہلے دو بندوں میں اقبال حضرت خضر سے مخاطب ہیں اور ان سے ملت اسلامیہ کی پستی اور زندگی کے راز دریافت کرنا چاہتے ہیں چونکہ شاعر کے دل میں اس وقت ہنگامہ محشر بپا ہے اس لئے کلام میں جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر یہ جوش شاعر نے قابو میں رکھا ہے اس کے برعکس حضرت حضرت خضر کا لہجہ بڑا سنجیدہ ہے اور اس میں جوش و خروش کو مطلق دخل نہیں۔ اقبال کو اس بات کا احساس تھا کہ حضرت خضر کا لہجہ جوش کی بجائے حکیمانہ ہونا چاہئے[1] چنانچہ انھوں نے سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں اس کا بھی ذکر کیا ہے۔

"خضر راہ پر جو نوٹ آپ نے لکھا تھا اس کے لئے شکریہ قبول فرمائیے جوش بیان کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے صحیح ہے مگر یہ نقص اس نظم کے لئے ضروری تھا (کم از کم میرے خیال میں) جناب خضر کی پختہ کاری ان کا تجربہ اور واقعات و حوادث عالم پر ان کی نظر —— ان سب باتوں کے علاوہ ان کا انداز طبیعت جو سورہ کہف سے معلوم ہوتا ہے، اس بات

---

[1] اس نظم کی بحر بھی ٹھہری ہوئی اور سنجیدہ ہے۔ یہ نظم بحر رمل مثمن محذوف (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) میں لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جو نظمیں انہوں نے اس بحر میں لکھی ہیں وہ بڑی سنجیدہ ہے مثلاً "سید کی لوح تربت پر" اور خفتگان خاک سے استفسا اور رخصت اے بزم جہاں۔

کا مقتضی تھا کہ جوش بیان اور تخیل کو ان کے ارشادات میں کم دخل ہو، اس نظم کے بعض بند میں نے خود نکال دیئے اور بعض اس وجہ سے کہ ان کا جوش بیان بہت بڑھا ہوا تھا اور جنابِ خضر کے انداز طبیعت سے موافقت نہ رکھتا تھا“ [1]

اگرچہ اقبال نے بقول ان کے حضرت حضرت خضر کی زبان سے ادا کئے گئے اشعار میں تخیل کو کم از کم استعمال کیا ہے اور بات کو سیدھے سادھے انداز میں کہنے کی کوشش ہے مگر پھر بھی چونکہ یہ شاعری ہے اس میں تخیّل کی کارفرمائی موجود ہے۔ خوبصورت تشبیہوں استعارات اور تلمیحات سے اندازِ بیان کو دلکش بنادیا گیا ہے۔ زندگی کی حقیقت کو کوہکن کی تلمیح سے بیان کرنے کی وجہ سے اس میں حسن اور دلکشی پیدا ہو گئی ہے اور اس شعر میں تغزل کا جادو نظر آتا ہے۔

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی!

جوئے شیر نصب العین ہے۔ تیشہ عمل و حرکت اور کوشش کی علامت اور سنگ گراں وہ مشکلات ہیں جو نصب العین کے حصول میں سنگ راہ ہوتی ہیں اسی طرح مغرب کی جمہوریت میں پوشیدہ خطروں کو بیان کرنے کے لیے اسے دیو استبداد کا نام دیا گیا ہے جس نے جمہوریت کی قبا پہن رکھی ہے اور نظام نیلم پری نظر آرہا ہے۔ اور لوگ اس کو نیلم پری سمجھ کر دیوانے ہو رہے ہیں۔ انھیں نہیں معلوم کہ یہ پری نہیں دیو ہے اور ان کو کھا جائے گا۔

---

[1] اقبال نامہ

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اقبال نے اسی طرح ساری نظم میں مختلف حربوں سے کام لے کر اسے حسن بخشا ہے اقبال کے ذہن میں جن خیالات نے ہلچل مچا رکھی تھی ان کے جوابات دینے کیلئے حضرت خضر سے زیادہ موزوں اور کوئی شخصیت نہ ہو سکتی تھی۔ حضرت خضر ایک مثالی رہنما ہیں جو بھولے بھٹکوں کو جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں تو راستہ دکھا کر منزل مقصود پر پہونچا دیتے ہیں۔ مسلمان قوم بھی اپنی منزل کھو چکی ہے ایک گم کردہ راہ مسافر کی طرح اسے بھی حضرت خضر کی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ اقبال نے قوم کو درپیش مسائل کا حل پیش کرنے کے لئے حضرت خضر کے کردار سے مدد لی ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت خضر کے سامنے حضرت موسیٰ کا علم بھی کوئی چیز نہ تھا اور ان کی نگاہیں ہزار پردے پردہ اٹھا سکتی تھیں۔ چنانچہ حضرت خضر سے ان سوالات کا جواب طلب کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حضرت خضر کی ذات ایک اور اعتبار سے بھی اہم ہے۔ حضرت خضر مسلسل عمل میں مصروف رہتے ہیں ان کو ایک جگہ قرار نہیں۔ وہ شہروں کی تن آسانی کو چھوڑ کر سمندروں اور صحراؤں کی سخت کوشش زندگی کو اپنائے ہوئے ہیں اس سے پہلے بھی وہ حضرت خضر کو کوشش ناتمام کا پیکر پیش کر چکے ہیں اور ان کی مثال سے راز حیات کو آشکارا کر چکے ہیں۔

راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

چنانچہ حضرت خضر کی ذات اپنے اندر ایک سبق رکھتی ہے۔ اور سبق ہے عمل پیہم اور سخت

کوشی کا۔ جب اقبال حضرت خضر کی صحرانوردی پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں تو ان کو حضرت خضر یہ جواب دیتے ہیں۔

کیوں تعجب ہے مری صحرانوردی پر تجھے
یہ تگاپوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل

اور پھر صحرائی زندگی کی خوبیاں گنوانے کے بعد یہ درس دیتے ہیں:

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی

مسلمان اگر مسلسل عمل کو اپنائیں۔ اور گردش روزگار سے گھبرانے کی بجائے اس سے الجھنا سیکھیں تو وہ زندگی میں کامرانیوں سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔ اسی سے ان کی خودی ان پر آشکار ہو سکتی ہے۔ ساقی نامے میں انھوں نے گردش روزگار کا مقصد یہ بیان کیا ہے کہ اس سے خودی بیدار ہوتی ہے۔

یہ ہے مقصد گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

حضرت خضر سے زندگی کے راز دریافت کرنے کے لئے انھوں نے باقاعدہ ڈرامائی فضا پیدا کی ہے۔ وہ اپنی نظموں میں ڈرامائی عناصر سے بڑا کام لیتے ہیں اور اس سے ان کی نظموں کی تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ حضرت خضر چونکہ دریاؤں اور صحراؤں میں رہتے میں رہتے ہیں اس لئے انھوں نے ان سے ملاقات کے لئے دریا کے کنارے کا انتخاب کیا ہے۔ ایک رات وہ دریا کے کنارے محو نظر تھے کہ ان کی ملاقات اچانک حضرت خضر سے ہو جاتی ہے۔ مگر اس ملاقات سے پیشتر وہ دریا کے ساحل کی منظر کشی کرتے ہیں۔

دریا کا کنارہ اور رات کا سماں بڑا دلکش ہے۔ نظم کا آغاز بڑا فطری ہے

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب

اور اس کے بعد ساحلِ دریا کی منظر نگاری شروع ہو جاتی ہے۔

شب سکوت افزا ہوا آسودہ دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب

جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار
موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب

رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجم کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب

تشبیہوں اور استعاروں کی مدد سے اقبال نے بڑا دلکش منظر تخلیق کیا ہے جب کبھی اقبال زندگی کے حقائق پر سے پردہ اٹھانا چاہتے ہیں، تو جس پس منظر میں وہ ان افکار کو کا بیان کرتے ہیں، وہ عموماً دریا کا کنارہ ہوتا ہے۔ ساحلِ دریا اقبال کا بڑا پسندیدہ اور محبوب مقام ہے۔ وہ اپنے دل میں جہانِ اضطراب چھپائے اکثر یہیں گھومتے ہوئے ملتے ہیں۔ مسجد قرطبہ ان کی بہترین نظموں میں سے ہے۔ اس کی تخلیق دریائے کبیر کے کنارے ہوتی ہے۔ دریائے کبیر کے کنارے بھی شام ہی کا وقت ہے۔ اور یہ شام بھی بڑی حسین ہے۔ ایک طرف سورج غروب ہو رہا ہے اور جاتے ہوئے لعلِ بدخشاں کے ڈھیر آسمان پر چھوڑ کر جا رہا ہے تو دوسری طرف دخترِ دہقاں کا سادہ اور پر سوز گیت کشتیِ دل کو ہچکولے دے رہا ہے۔ اس حسین ماحول میں ہی ان پر زندگی کے حقائق کا نزول ہوتا ہے اور وہ آنے والے زمانے کا خواب دیکھنے لگتے ہیں۔

وادیِ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

سادہ و پر سوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت
کشتیِ دل کے لئے سیل ہے عہدِ شباب

آب رواں کبیر تیرے کنارے کوئی   دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

اور جب وہ جاوید نامے میں زندگی کے اسرار و رموز کی تلاش نکلتے ہیں اور سوئے افلاک روانہ ہوتے ہیں تو اس وقت بھی غروب آفتاب کا وقت ہوتا ہے اور وہ دل کی آسودگی کے لئے دریا کے کنارے کھڑے ہوتے ہیں جس طرح خضر راہ میں حضرت خضر اچانک ان کو مل جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کی ملاقات پیر رومی سے ہوتی ہے جاوید نامے کے ان اشعار میں وہ ساحل دریا کی اہمیت کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ وہ اکثر دریا کے کنارے اس لئے نظر آتے ہیں کیونکہ عشق کی پرورش کے لئے شہر کے شور و غوغا کی بجائے ساحل دریا کا خاموش اور دلکش مقام زیادہ موزوں ہے یا پھر صحرا اور دشت و کہسار کی خلوت اس کو سازگار آتی ہے۔

عشق شور انگیز بے پروائے شہر   شعلہ میرد ز غوغائے شہر
خلوتے جوید بدشت و کوہسار   یا لب دریائے ناپیدا کنار
من کہ در یاراں نہ دیدم محرمے   بر لب دریا بہ آسودم دمے
بحر و ہنگام غروب آفتاب   نیلگوں آب شفق لعل آب
کور را ذوق نظر بخشد غروب   شام را رنگ سحر بخشد غروب
با دل خود گفتگو ہا داشتم   آرزو ہا جستجو ہا داشتم

خضر راہ اس اعتبار سے جاوید نامے کی ابتدائی شکل ہے کہ اس میں بھی وہ ایک رہنما کی مدد سے زندگی کے اسرار و رموز پر سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ جاوید نامے میں ساحل دریا پر غروب آفتاب کے وقت ان کی ملاقات پیر رومی سے ہوتی ہے۔ اور خضر راہ میں دریا کے کنارے شب کے سکوت میں وہ حضرت خضرؑ سے ملتے ہیں اور ان سے

غروب آفتاب کے وقت ان کی ملاقات پیر روم سے ہوتی ہے اور خضر راہ میں دریا کے کنارے شب کے سکوت میں وہ حضرت خضرؑ سے ملتے ہیں اور ان سے رہنمائی طلب کرتے ہیں۔ جاوید نامے میں بڑی وسعت ہے اور وہ ان کی شاعری کا شاہکار ہے اور حضرت خضر اس کے مقابلے میں کمتر بھی ہے اور اس کا کینوس بھی چھوٹا ہے مگر دونوں میں زندگی کے مسائل کا حل تلاش کیا گیا ہے۔ جاوید نامے میں کئی کردار ہیں اور کئی مقام ہیں مگر یہاں دو کردار اور ایک مقام ہے جاوید نامے میں بے شمار مسائل سامنے آتے ہیں مگر خضر راہ میں صرف چند کا ذکر ہے۔

جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں خضر راہ کے پہلے دو بند اقبال یا شاعر کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ ان میں سے پہلے بند میں منظر نگاری ہے اور حضرت خضر کا ظہور ہوتا ہے دوسرے بند میں اقبال حضرت خضر سے ان سوالوں کے جوابات پوچھتے ہیں جنہوں نے ان کے جہان دل میں محشر بپا کر رکھا ہے۔ اقبال نے جو سوالات حضرت خضر سے پوچھے وہ یہ ہیں۔

۱۔ حضرت خضر کی صحرا نوردی کا باعث کیا ہے۔

۲۔ زندگی کا راز کیا ہے۔؟

۳۔ سلطنت کیا چیز ہے؟

۴۔ سرمایہ و محنت میں کیسا خروش ہے

۵۔ دنیائے اسلام کی زبوں حالی کے اسباب اور ان کا علاج کیا ہے؟

حضرت خضرؑ نے ان پانچ سوالات کا جواب نو بندوں میں دیا ہے۔ پہلا سوال خود خضر کی ذات کے متعلق ہے۔ اس کا جواب انھوں نے تیسرے بند میں دیا ہے۔ پہلا

سوال خود حضرت خضر کی ذات کے متعلق ہے۔ اس کا جواب انھوں نے تیسرے بند میں دیا ہے۔ جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

دوسرا سوال زندگی کے متعلق ہے جس کا جواب چوتھے اور پانچویں بند میں دیا گیا ہے چوتھے بند میں انھوں نے زندگی کی حقیقت کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ زندگی سود و زیاں سے برتر ہے اور اسے امروز و فردا کے پیمانوں سے ناپا نہیں جا سکتا کیونکہ یہ ہر دم رواں دواں ہے۔ پھر انھوں نے جوئے شیر، تیشہ اور سنگ گراں کی مثال سے اس کی وضاحت کی ہے۔ زندگی آزادی کی فضاؤں میں پھیلتی پھولتی اور پھولتی اور بڑھتی ہے حتی کہ بحرِ بے کراں بن جاتی ہے۔ غلامی اس کے حق میں زہرِ قاتل ہے۔ یوں تو زندگی انسان کی ذات میں پوشیدہ ہے مگر اس کی قوت تسخیر سے آشکارا ہوتی رہتی ہے۔ ساقی نامے میں بھی اقبال نے دو بند زندگی کی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے وقف کئے ہیں۔ ساقی نامے کی بحر رواں ہے اور اس میں تیزی ہے مگر خضرِ راہ کی بحر میں ٹھہراؤ ہے۔ وہاں بھی زندگی کے متعلق انھوں نے یہی نظریہ پیش کیا ہے مگر انداز انداز مختلف ہے۔[1] زندگی کے متعلق انھوں نے یہی نظریہ خاص طور سے ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کو سامنے رکھ کر اور عام طور پر تمام ملتِ اسلامیہ کے لئے پیش کیا ہے۔ مسلمان غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور اقبال کے نزدیک غلامی میں زندگی کا بحرِ بیکراں سکڑ کر جوئے کم آب رہ جاتا ہے۔ لہٰذا زندگی کی حقیقت کو جاننے کے لئے غلامی کی زنجیروں کو توڑنا بے حد ضروری ہے چنانچہ پانچویں بند میں وہ مسلمان کو زندگی کی حقیقت پہچان کر ایک زندہ قوت بن جانے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ کہتے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ "ساقی نامہ" والا باب

ہیں کہ زندگی سے کام لے کر انسان کو عمل کے ذریعے تسخیر کائنات کا فریضہ سرانجام دینا چاہیئے ۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

اقبال کا تیسرا سوال سلطنت کی حقیقت کے متعلق تھا اور چھٹے بند میں حضرت حضرت اس کا جواب دیتے ہیں ۔

آبتاؤں تجھ کو رمز آیۂ ان الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

اقوام غالب اپنی ساحرانہ چالوں سے کمزوروں کو سلائے رکھتی ہے ان چالوں میں ایک جمہوریت کی تعلیم پری کا فریب بھی ہے ۔ اقبال مغربی جمہوریت کو بھی ملوکیت کی ہی ایک شکل سمجھتے ہیں ۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

ان کا یہ نظریہ آخر تک قائم رہتا ہے چنانچہ اپنی تصنیف ارمغان حجاز میں انھوں نے ابلیس کی زبان سے اس کی حقیقت یوں ظاہر کیا ہے ۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خودنگر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

اقبال کا چوتھا سوال سرمایہ اور محنت کے متعلق تھا ۔ حضرت خضر نے اس کا جواب ساتویں اور آٹھویں بند میں دیا ہے ۔ خضر راہ اس لحاظ سے بڑی اہم نظم ہے کہ اس میں

پہلی بار علامہ اقبال نے سوسلزم کے متعلق کھل کر اظہار خیال کیا ہے ۔ انھوں نے روس کے انقلاب کی تعریف کرتے ہوئے اسے آفتاب تازہ سے تشبیہہ دی ہے انھوں نے مزدور کی سادگی پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور سرمایہ داری کی چالاکی کی مذمت کی ہے چنانچہ اس نظم میں مزدور کی حالت زار کا نقشہ کھینچ کر اسے خواب سے بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

بندہ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر — شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی — اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش — اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

علامہ اقبال نے روس سوسلزم اور مزدوروں کے متعلق اپنی بعد کی کتابوں میں بھی تفصیل سے لکھا ہے اس سلسلے میں جاوید نامہ ارمغان حجاز، ضرب کلیم، پیام مشرق اور مثنوی پس چہ باید کرد کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے ۔ اقبال نے اس نظم سوسلزم کا خیر مقدم کیا ہے ۔ مگر اس کے فلسفہ حیات پر پوری تنقید نہیں کی آگے چل کر اگرچہ مزدور سے ان کی ہمدردیاں برقرار رہتی ہیں اور روس کے انقلاب کو بھی وہ اچھی نظروں سے ہی دیکھتے ہیں نیز سوشلزم کے اقتصادی پہلو کو اپنانے پر بھی زور دیتے ہیں مگر سوشلزم میں پوشیدہ لادینیت کو قبول نہیں کرتے اور اس پر کڑی تنقید کرتے ہیں ان کے نزدیک اسلام خود بہت بڑا سوشلزم ہے اور سوشلزم کی خرابیوں سے پاک بھی ہے ۔ ہم نے اقبال کے سوشلزم کے متعلق نظریات کو ایک علیحدہ باب میں جگہ دی ہے اور وہاں ان کا تفصیلی جائزہ لیا ہے ۔

اقبال کا پانچواں اور آخری سوال دنیائے اسلام کی زبوں حالی کے متعلق ہے اس کا آخری جواب تین بندوں یعنی نویں، دسویں اور گیارہویں میں دیا گیا ہے۔ مغرب نے اپنی حکمت عملی سے مسلمانوں کو مغلوب کر لیا ہے تثلیث کے فرزند میراث خلیل پر قابض ہو گئے ہیں۔ اور انھوں نے مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا ہے۔

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی | ٹکڑے ٹکڑے جسطرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو !! | مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

کید مغرب نے وطنیت کا سبق پڑھا کر مسلمان کو دین سے بیگانہ کر دیا اس سے ہر ملک کے مسلمان الگ الگ حصوں میں بٹ گئے۔ نفاق کا بیج بو کر مغربیوں نے اپنی حکمرانی کے لئے راستہ صاف کر لیا چنانچہ حضرت خضر کے نزدیک جب تک وہ متحد نہیں ہوتے اور امتیاز رنگ و خوں میں مبتلا ہیں اس وقت تک غلامی کی زنجیروں کو نہیں توڑ سکتے ساری دنیا کے مسلمان ایک ملت بن جائیں تو ان کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ جب کہ ان کے پاس ایسا نسخہ کیمیا بھی موجود ہے جس سے ہر بیماری کا علاج ہو سکتا ہے

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات | ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو | ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے | نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر
جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائیگا | ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی | اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گذر

اقبال ہمیشہ مسلمانوں کے مستقبل سے پر امید رہے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کسی نہ کسی دن مزدور دین کے حصار میں داخل ہوں گے کیونکہ یہ ذرا کم کوش ہیں بے ذوق نہیں ہیں۔

اس کشت ویراں سے وہ کبھی ناامید نہیں ہوئے۔ اس کی زرخیز مٹی ضرور کسی دن نم حاصل کر کے بہار کا سماں پیدا کرے گی۔ چنانچہ آخر میں حضرت خضر پیشین گوئی کرتے ہیں کہ اسلام ایک بار پھر سربلند ہوگا۔ یہ جہاں ختم ہو جائیگا جہاں مسلمان غلام ہیں اور آزادی کا اک نیا جہاں پیدا ہوگا۔ علامہ اقبال نے اپنی کئی نظموں میں مغرب کی تباہی کی پیش گوئی کی ہے۔ آج وہ زندہ ہوتے تو دیکھ لیتے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو الگ وطن مل گیا ہے اور مسلمان ممالک ایک ایک کر کے غلامی سے آزاد ہو رہے ہیں۔ مگر ابھی علامہ کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔ جب ساری دنیا کے مسلمان ایک ملت بن جائیں گے اس وقت اقبال کی روح کو چین آئے گا۔ اب اس کے آثار بھی پیدا ہو رہے ہیں پہلی بار دنیا مسلمان سربراہ سر جوڑ کر بیٹھے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں احساس پیدا ہو گیا ہے کہ جب تک وہ متحد نہیں ہوتے عالم اسلام کی رسوائی ختم نہیں ہوتی۔ اقبال نے خضر راہ میں اس طرف بہت پہلے اشارہ کر دیا تھا۔

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر عشق کی تاثیر دیکھ

تو نے دیکھا سطوت رفتار دریا کا عروج
موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

اپنی خاکستر سمندر کو ہے ساماں وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان پیر دیکھ

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

خضر راہ علامہ اقبال کی پہلی نظم ہے جس میں کئی مسائل کے علامہ اقبال کا نقطہ نظر پہلی بار سامنے آیا ہے۔ اس لحاظ سے اس نظم کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

طلوعِ اسلام

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

طلوعِ اسلام نو بندوں پر مشتمل ہے۔ خضرِ راہ کے برعکس اس نظم کے ہر بند میں آٹھ شعر ہیں۔ اس لحاظ سے یہ نظم مسجدِ قرطبہ سے ملتی جلتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس میں طلوعِ اسلام کی نسبت ایک بند کم ہے۔ مسجدِ قرطبہ کے ہر بند کے اشعار میں صرف قافیہ استعمال ہوا ہے اور ردیف کا استعمال صرف بند کے آخری شعر میں ہوا ہے جب کہ طلوعِ اسلام کا آخری بند سارے کا سارا فارسی اشعار پر مشتمل ہے۔ شمع اور شاعر کا پہلا بند جو پانچ شعروں پر مشتمل ہے، فارسی زبان میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب اقبال فارسی کی طرف مائل ہو رہے ہیں فارسی سے ان کے لگاؤ کی وجہ سے ان کے اردو اشعار میں بھی فارسی تراکیب کثرت سے استعمال ہوئی ہیں بلکہ بعض پورے کے پورے مصرع ہی فارسی میں ہیں۔ طلوعِ اسلام کے پہلے ہی بند میں ایک مصرع ہے۔

شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

اگر پہلا مصرع اردو میں نہ ہوتا تو ہم اس مصرع کو کسی فارسی شعر کا حصہ تصور کرتے اقبال کی نظم میں بہت کم شعر ایسے ہوں گے جن میں فارسی تراکیب استعمال نہ ہوئی ہوں فارسی کا یہ گہرا اثر ان کی ساری شاعری پر ہے۔ بال جبریل کی مشہور نظم مسجد قرطبہ میں بھی فارسی تراکیب کی زیادتی ہے فارسی تراکیب کے اس فراخدلانہ استعمال کی وجہ سے ان کی زبان مشکل ہو گئی ہے۔ البتہ ان فارسی تراکیب کا استعمال اتنا ماہرانہ ہے کہ پڑھتے ہوئے ہمیں کہیں ٹھوکر نہیں لگتی۔ اور روانی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

خضر راہ کے آخری تین بند دنیائے اسلام کے متعلق تھے۔ اور ان میں مسلمانوں کی پستی کے اسباب کا ذکر کر کے ان کو خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کی تھی اور آخر میں اس طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ مسلمان قوم ایک بار پھر اصلیت کی طرف لوٹے گی۔ اس کے آثار نظر آ رہے ہیں کہ مسلمان بیدار ہو رہے ہیں۔ جہاں سے خضر راہ ختم ہوئی تھی۔ یہیں سے طلوع شروع ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اس نظم کو خضر راہ کا تتمہ کہہ سکتے ہیں نظم کا نام طلوع اسلام ہے "مسلمانوں کی بیداری کی طرف اشارہ کر رہا ہے چنانچہ نظم کے شروع میں ہی مسلمانوں کی بیداری کا ذکر موجود ہے۔

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی — افق سے آفتاب ابھرا گیا دور گراں خوابی
عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا — سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے — تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

مسلمانوں میں حرکت اور عمل کے جو آثار پائے جاتے ہیں ان کا ذکر اقبال نے دوسرے بند میں بھی کیا ہے۔

مگر تنک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا | خلیل اللہ کے دریا میں ہونگے پھر گہر پیدا
کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے | یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اور اس بات کا ذکر کرنے کے بعد کہ اب مسلمان کے تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا ہونے والا ہے اقبال اس بند کو اس شعر پر ختم کرتے ہیں۔

تیرے سینے میں پوشیدہ راز زندگی کہدے
مسلماں سے حدیث سوز و ساز زندگی کہدے

اور اگلے بند میں اسی حدیث سوز و ساز زندگی کا ذکر ہے یعنی مسلمانوں کو بتایا جاتا ہے کہ وہی اس جہاں کا معمار ہے اور خدا کا آخری پیغام ہے لہذا اس کو جہاں بانی اور جہانگیری کے فرائض انجام دینے ہیں جب تک مسلمانوں میں یہ احساس پیدا نہ ہوگا کہ انھوں نے نیابت الٰہی کا فریضہ ادا کرنا ہے اور ان میں اتنی قوت موجود ہے کہ کائنات کو تسخیر کر لیں، اس وقت تک وہ بلندی کی طرف پرواز شروع نہ کر سکیں گے اور ساتھ اقبال ان کو یہ یقین بھی دلاتے ہیں کہ نصرت الٰہی بھی ان کے ساتھ ہے۔ کیونکہ وہ خدا کے دست قدرت کی زبان ہیں۔

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے | یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی | ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں فانی ازل تیرا ابد تیرا | خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
یہ نکتہ سرگذشت ملت بیضا سے ہے پیدا | کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے

اس کے بعد دو بندوں میں وہ مسلمانوں کو بتلاتے ہیں کہ کس طرح وہ اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ اقوام ایشیا کے پاسباں بن جائیں۔ سب سے پہلی ضرورت ان میں

اتحاد کی ہے اور رنگ و نسل کے بتوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جاتا ہے۔

بتان رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

وہ انہیں یاد دلاتے ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد قیصر و کسریٰ کے استبداد کو مٹانے پر اس لئے قادر ہو سکے تھے کہ ان میں حضرت علی رضؓ کا زور، حضرت بوذر کا فقر اور حضرت سلمان فارسی کا صدق موجود تھا۔ غلامی سے نجات پانے کے لئے شمشیر سے زیادہ ذوق یقین کی ضرورت ہے اگر ایمان پختہ نہ ہو تو تلوار کچھ بھی نہیں کر سکتی مومن ہو تو سپاہی بغیر اسلحہ کے بھی لڑ سکتا ہے۔ مومن کی نگاہ میں ہی اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ تقدیروں کے فیصلے کر سکتی ہے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

مومن کا ذکر کرتے ہیں تو انہیں قرون اولیٰ کے مسلمان یاد آجاتے ہیں۔ کیونکہ وہ اسلام کا سچا نمونہ تھے اور ان میں ایمان کی پختگی موجود تھی۔ مگر اب مسلمانوں میں ایمان کی حرارت نہیں اس لئے ان میں وہ قوت بھی نہیں اب وہ رہنما نہیں۔ بلکہ غبار راہ بن گئے ہیں۔ اقبال ان کی بربادی پر آنسو بہاتے ہیں اور پھر مسلمانوں کو اپنی اصلیت پہچاننے کی نصیحت کرتے ہیں۔ وہ انہیں یاد دلاتے ہیں کہ دنیا میں بلند مقام حاصل کرنے اور نیابت الٰہی کا فریضہ ادا کرنے کے لئے انہیں خودی کے راز سے آگاہی حاصل کرنی چاہیے۔

تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

اور چونکہ یہاں ملت اسلامیہ سے خطاب ہے اس لئے وہ انھیں پھر یاد دلاتے ہیں کہ خودی کی حفاظت اتحاد سے ہی ہو سکتی ہے۔ کوئی ملت جو پارہ پارہ ہو اور افغانی، ایرانی اور ترکی ہونے کو اہمیت دیتی ہو۔ وہ اپنی اجتماعی خودی کی تکمیل نہیں کر سکتی۔ جغرافیائی حدود کو اہمیت دینا ملت کے لئے بے حد خطرناک ہے خودی کی تعمیر محبت کے جذبے سے ہوتی ہے اور وطن کا نظریہ انسانوں کو ایک دوسرے کا دشمن اور قاتل بنا دیتا ہے۔ یہ ان میں نفرت کی آگ لگاتا ہے جو بالآخران کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے چنانچہ وہ آئندہ بند میں اسی روح فرسا حقیقت کو آشکارا کرتے ہیں مغربی اقوام نے وطنیت کے اس جادو سے انسان کو نوع انسان کا دشمن بنا دیا ہے۔ اس نے انسان کو ہوس کار بنایا اور اب وہ اپنے ہی بھائیوں کا گلا کاٹنے سے دریغ نہیں کرتا۔ وطنیت کے اس تصور کے ساتھ ساتھ انھوں نے سرمایہ داری کے نظام کو رائج کیا۔ جو چند افراد کے لئے پوری قوم کو تباہ کر دیتا ہے اس کی فطرت میں ہی تیز نیرہ وآدا موجود ہے جو فساد آدمیت کا باعث ہے۔ اقبال نے جہاں مسلمانوں کو بیداری کا پیغام دیا ہے۔ وہاں تہذیب مغرب کے خلاف بھی ضرور لکھا ہے کیونکہ وہ مغربی تہذیب کو مسلمانوں کی روح کا قاتل سمجھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اقوام مغرب نے اسلامی دنیا کو غلامی کے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے اس لئے بھی وہ ان کے خلاف اپنے ترکش کے سب سے زہریلے تیر چلاتے ہیں:

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خرد مندان مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا!
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

یہ نظم مسلمانوں کی بیداری سے شروع ہوئی تھی اور اسی بات پر ختم ہوتی ہے کہ بہار آنے والی ہے اور خزاں کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ علامہ اقبال کی نظمیں عموماً اچھے دنوں کی امید اور ان کے آنے کے یقین پر ختم ہوتی ہیں۔

خضر راہ میں علامہ اقبال نے حضرت خضر سے چند سوال پوچھے تھے اور انھوں نے ان سوالات کا جواب دیا تھا۔ چنانچہ خضر راہ کے مختلف بندوں کا ربط ان سوالات کے جوابات میں پنہاں تھا۔ طلوع اسلام ایک ہی موضوع کو بیان کرتی ہے۔ اس لیئے اس میں شروع سے آخر تک ایک خاص ربط موجود ہے ایک بند سے دوسرا بند ارتقا کی کڑیوں سے جڑا ہوا ہے۔ اور ہم آسانی سے ایک بند سے دوسرے بند کی طرف سفر کرتے رہتے ہیں۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ طلوع اسلام خضر راہ کا تتمہ ہے اس لیے اس کی حیثیت بھی خضر راہ سے تتمہ ہے۔

طلوع اسلام میں بڑی غنائی اور پر اثر نغماتی تاثیر سے بھرپور بحر استعمال کی گئی ہے بحر ہزج مثمن (مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن مفاعیلن) میں حد درجہ کی غنائیت پائی جاتی ہے اس بحر کا مزاج تاثراتی ہے۔ اور اگر شاعر اس کا ماہرانہ استعمال کرے تو بڑے دلکش اشعار تخلیق کر سکتا ہے۔ غنائیت سے بھرپور ہونے کی وجہ سے اس بحر کا مزاج غزل کا مزاج ہے۔ لہذا اس نظم کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے اشعار زبان زد خاص و عام ہو گئے ہیں اور انھوں نے شہرت عام کی سند حاصل کر لی ہے میں یہاں ایسے ہی چند شعر درج کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

سبق پڑھ پھر صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا!!
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر نکلے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی!
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

مسجدِ قرطبہ

اے حرمِ قرطبہ عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

یہ غیر فانی نظم جیسا کہ علامہ نے خود واضح کر دیا ہے انھوں نے سیاحت ہسپانیہ کے دوران جامع مسجد قرطبہ کے بعد لکھی تھی۔ یہ مسجد صدیوں سے محروم اذان ہونے کے باوجود آج بھی شان و شوکت اور وسعت میں تمام دنیا کی مساجد کی سرتاج ہے اس کا طول ۲۲۸ فٹ اور عرض ۴۴۰ فٹ ہے یعنی دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے اس کی تعمیر پر ۲½ کروڑ سے زائد روپیہ خرچ ہوا تھا اس کی تعمیر سلطان عبدالرحمٰن الداخل نے جامع مسجد دمشق کے نمونہ پر شروع کی تھی لیکن تکمیل سے پیشتر ہی موت کے بے رحم ہاتھوں نے اسے ہمیشہ کی نیند سلا دیا اس کے جانشین ہشام نے ۱۸۰ھ / ۷۹۶ء میں اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا اور اس کے بعد آنے والوں نے مسجد کی توسیع اور زیبائش پر کثیر رقوم صرف کیں۔ اس کا منبر خالص ہاتھی دانت کا تھا اس میں بہت سے جواہرات لگے ہوئے تھے۔ اس عظیم الشان مسجد میں ۱۴۲۷ سنگ مرمر کے ستون ہیں جن کے نقش و نگار کمال فن کی دلیل ہیں اور جن سے

مسجد کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ علامہ نے اس شعر میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

تیری بنا پائیدار تیرے ستون بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل!

شام کے وقت اس میں دس ہزار جھاڑ فانوس روشن ہوتے تھے ۔ وسط میں سب سے بڑے تین جھاڑ خالص چاندی کے تھے ۔ باقی سب پیتل کے تھے ان میں سے ہر ایک میں ۰۰ ۴۸ پیالے تھے جن میں ۳۶ سیر تیل جلتا تھا ۔ تین سو فراش اس کی صفائی پر متعین تھے مسجد کا نظارہ کرنے والوں کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ساری مسجد کو نور کی چادر چڑھا دی گئی ہو ۔

تیرے در و بام پر وادی ایمن کا نور!
تیرا منار بلند جلوہ گہ جبریل

یہی نہیں اس کے حسن کی نظیر ساری دنیا میں نہیں ملتی ۔ حسن وجمال میں اگر کوئی اس کا ثانی ہے تو وہ قلب مسلماں ہی ہے کیونکہ وہ بھی نور ایزدی منور ہے ۔

ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلب مسلمان میں ہے اور نہیں ہے کہیں

مسلمان کا دل اگرچہ حسن وجمال میں اپنی نظیر نہیں رکھتا لیکن اس کے رعب و داب اور قوت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ شیران خونخوار بھی اس کی نگاہ گرم کی تاب نہیں لا سکتے ۔ پہاڑ اس کی ہیبت سے رائی ہو جاتے ہیں اور اس کی ایک نظر سے تقدیروں کے فیصلے بدل جاتے ہیں ۔ یعنی وہ جلال وجمال کا حسین مرقع ہے جلالی اور جمالی صفات

کامرکب کہیں اور دیکھا ہو تو وہ مسجد قرطبہ ہے۔

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل

جلال و جمال کی یہی آمیزش فن کو دوامی زندگی عطا کرتی ہے۔ مسجد قرطبہ فنی لحاظ سے ایک بلند مقام کی حامل ہی نہیں ہے بلکہ کعبہ ارباب فن کا درجہ رکھتی ہے۔

کعبہ ارباب فن اسطوت دین مبیں!
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں

اس سے علامہ کے دل میں ذوق و شوق اور محبت کے جو جذبات متلاطم میں ان کی عکاسی ہوتی ہے انھوں نے مسجد قرطبہ کی بدولت سرزمین اندلس کو "حرم" قرار دیا ہے مسلمانوں کی عقیدت کعبہ سے ظاہر ہے۔ علامہ کو وہی مقدس عقیدت اس مسجد کی وجہ سے اندلسیوں سے بھی ہو جاتی ہے زمانہ کے حوادث کا مقابلہ کر کے صرف وہی چیز زندہ رہ سکتی ہے جو عظیم ہو کیونکہ زمانہ کم عیار چیزوں کے لئے فنا کا پیغام لاتا ہے۔

سلسلہ ہائے روز و شب صیرفی کائنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ
موت ہے تیری برات موت ہے میری برات
تو ہو اگر کم عیار میں ہوں اگر کم عیار

مسجد قرطبہ نے زمانے کے تھپیڑوں کا مقابلہ کیا ہے اور اس کی تباہ کاریوں سے محفوظ ہے اسی میں اس عظمت ہے لیکن آئی کہاں سے ؟ خود علامہ کی زبان سے سنیے!

جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام
ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام

لیکن مرد خدا کا یہ لافانی نقش صدیوں سے ویران ہے۔ ۱۴۹۲ء کے بعد سے یہ اذان تک سے محروم ہے کیوں کہ اب وہاں کوئی اذان دینے والا ہی نہیں رہا۔

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں

آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

تمام دنیا انقلابات کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے اور کہنہ نشانات مٹ رہے ہیں۔ جرمنی میں لوتھر کی تحریک نے پیر کنشت کی عظمت کو حرف غلط ثابت کر دیا ہے اور پاپائے روم اپنے مذہبی تقدس سے محروم ہو گیا ہے اس کا صدیوں پرانا نظام زمانے کی تند و تیز آندھی کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ فرانس میں شاہی کا خاتمہ ہو گیا ہے اور روم نے بھی اپنے اندر "لذت تجدید" سے ایک نئی قوت پیدا کر لی۔ لیکن مسلمانوں میں ابھی تک انقلابی روح پیدا نہیں ہوئی۔ نہ معلوم کب عشق بلاخیز کا قافلہ اس سنسان وادی میں پہنچے گا۔ اور ملت اسلامی کو ہنگامہ سے آشنا کرے گا۔

کونسی وادی میں ہے کونسی منزل میں ہے

عشق بلاخیز کا قافلہ سخت جاں

لیکن اقبال ناامید نہیں ہیں انھیں یقین ہے کہ اس خزاں رسیدہ چمن میں ضرور بہار آئے گی۔ وہ اپنی باطنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ قرطبہ کی یہ ویران مسجد پھر کسی دن آباد ہو گی اور مسلمانوں کا پرچم ایک مرتبہ پھر دنیا کے گوشے گوشے پر لہرائے گا۔ انھیں علم ہے کہ روحِ مسلماں مضطرب ہے اور یہ اضطراب انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب

رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!

آبِ روانِ کبیر انھیں یاد دلاتا ہے کہ جس طرح اس کا پانی ساکن نہیں اور ہر لحظہ متحرک ہے۔ اس میں ہر لحظہ ایک نئی شان پیدا ہوتی ہے۔ اسی مسلمانوں پر سیاسی غلامی کا یہ دور

ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے۔ ان میں حرکت پیدا ہو چکی ہے اس خیال کے ساتھ ہی وہ مسلمانوں کے خوش آئندہ مستقبل کا خواب دیکھنے لگتے ہیں ؎

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب۔

(۲)

جب شاعر کسی خاص چیز پر شعر لکھتا ہے تو وہ پہلے اس سے جذباتی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر یا اس کے تصور سے اس کے سینہ میں جذبات ہیجان پیدا کرتے ہیں اور یہ شدتِ جذبہ اشعار کی شکل اختیار کر لیتی ہے شاعر کبھی کسی چیز کو سائنس داں کی طرح بیان نہیں کرتا۔ ایک سائنسداں جب تاج محل پر کچھ لکھے گا۔ تو وہ اس کا درست طول و عرض اور میٹریل کی کیفیت بیان کرے گا۔ جس کا جذبات سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا بیان قاری کو معلومات تو بے شک پہونچائے گا۔ لیکن متاثر نہیں کر سکتا اور نہ نفرت یا محبت کے جذبات پیدا کر سکتا ہے۔ اقبال نے مسجد قرطبہ پر اپنی نظم میں شاعرانہ طریق سے روشنی ڈالی ہے مسجد کو دیکھ کر علامہ بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنے تاثرات کو اشعار کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے گذشتہ سطور میں علامہ نے نظم میں براہ راست جو کچھ مسجد کے متعلق کہا ہے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے نظم کا بڑا حصہ علامہ کے فلسفہ اور ان کے اہم خیالات کا آئینہ دار ہے۔ نظم کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کی تمام اہم خصوصیات کو اس ایک نظم میں جمع کر دیا ہے اور اس طرح یہ نظم ان کی نمائندہ نظم کی حیثیت اختیار کر گئی ہے دراصل

علامہ نے مسجد قرطبہ کو اپنا موضوع ہی اس لئے قرار دیا کہ اس کی مناسبت سے وہ اپنے اہم خیالات کو جو انھوں نے مختلف مواقع پر اور مختلف پیرا ور مختلف نظموں اور غزلوں میں بیان کئے ہیں یکجا کر سکیں گے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے شعوری طور پر ایسا نہ کیا ہو مگر نظم کا غائر مطالعہ ہمیں اس نتیجے پر پہونچنے پر مجبور کرتا ہے۔ اب ہم اس نظم کا جائزہ اس حیثیت سے لیتے ہیں کہ واقعی اس کو ان کی نمائندہ نظم قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس نظم کے پہلے بند میں علامہ نے زمانہ کی ماہیت اور حقیقت کے متعلق چند اشارے کئے ہیں۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہ تھی مسجد کو دیکھ کر جو خیالات ان کے دل میں موجزن ہوئے ان کے اظہار کے لئے یہ اشعار ناگزیر تھے ان سے ان کے تصور زمان کے کئی گوشے منور ہوتے ہیں زمانہ پر بہت سے فلسفیوں نے غور و فکر کیا ہے اور اپنی فلسفیانہ موشگافیوں سے اسے اور دقیق بنا دیا ہے۔ اقبال نے بھی اس موضوع پر نظم لکھی ہے جس کا عنوان ہی "زمانہ" ہے۔ بال جبریل کے علاوہ انھوں نے اپنے خطبات اور جاوید نامہ میں بھی اس پر اظہار خیال کیا ہے زمانہ کے متعلق علامہ کا خیال ہے کہ اس کی دو اقسام ہیں ایک زمان حقیقی اور دوسرا زمان خارجی یا تسلسلی۔ پہلا موضوعی اور دوسرا معروضی، معروضی میں جبر ہے اور موضوعی جبر سے آزاد ہے۔ زمان خارجی یا معروضی کے متعلق انھوں نے "زمانہ" میں اس طرح وضاحت کی ہے۔

میری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں

میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

ساقی نامہ میں کہتے ہیں:

زمانہ کہ زنجیر ایام ہے   دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

اور مسجد قرطبہ میں اسے "سلسلہ روز و شب" کا نام دیا ہے۔

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات سلسلہ روز و شب اصل حیات و ممات

سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلہ روز و شب ساز ازل کی فغاں جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات

بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ زمانے کے اس تصور سے اقبال نے انسانی اختیارات اور ذات باری تعالیٰ کے ابدی خلق میں توافق پیدا کیا ہے، ماضی حال مستقبل حال میں ہر لحظہ مبدل ہوتا رہتا ہے ان کو علیحدہ علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔ اس لامتناہی تسلسل سے انسان کے اعمال وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اور انسان اپنے اعمال سے نیکی یا بدی کا مرتکب ٹھہرتا ہے، زمان خارجی کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کھرے اور کھوٹے کو پرکھتا ہے اور جو کوئی اس کی کسوٹی پر پورا نہ اترے یا اقبال کے الفاظ میں "کم عیار" ہو اسے فنا کر دیتا ہے۔ لیکن زمان حقیقی کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے ! اور چشم بینا کے بغیر اسے سمجھنا مشکل ہے۔ زمان خارجی کو جاننے کے لئے خارجی آنکھیں اور حواس کافی ہیں لیکن زمان حقیقی کو سمجھنے کے لئے باطنی آنکھوں کا وا ہونا ضروری ہے! اپنی نظم زمانہ میں انھوں نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

میرے پیچ و خم کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہدف سے بیگانہ تیر اس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ

زمان حقیقی میں دن اور رات نہیں ہوتے بلکہ ایک رو ہے جو مسلسل چلی جارہی ہے، ماضی اور حال اور مستقبل کا وجود یہاں نہیں۔ مسجد قرطبہ میں اقبال کہتے ہیں۔

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا! ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

زمان حقیقی میں شب و روز کے نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ داخلی ہے اور انسان

کے اندر ہے۔ اسی لئے اس کی حقیقت کو جاننے کے لئے دل میں غوطہ لگانا ضروری ہے۔

نغمۂ خاموش دارد ساز وقت　　　غوطہ در دل زن کہ بینی راز وقت

اور زندگی کا راز معلوم کرنے کے لئے بھی یہی طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

ع　اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

(غزل بالِ جبریل)

لہٰذا معلوم ہوا کہ زندگی اور زمانہ ایک ہی چیز ہیں ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ممکن نہیں۔ زندگی زمانہ میں پوشیدہ ہے۔ اور زمانہ زندگی میں

زندگی از دہر و دہر از زندگی است

اسی لئے علامہ نے کسی دوسری جگہ اس حقیقت سے نقاب کشائی کی ہے کہ زمانے کی اصلیت کو سمجھے بغیر حیاتِ جاوداں کا راز پانا ناممکن ہے۔

تو کہ از اصلِ زماں آگہ نہ

از حیاتِ جاوداں آگہ نہ

اس بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زمانہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے اسی لئے علامہ نے اس نظم میں زمانہ کے متعلق چند اشارے کرنے مناسب سمجھے چونکہ زندگی اور زمانہ آپس میں یوں جڑے ہوئے ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کو سمجھنا مشکل ہے آیئے دیکھیں زندگی کیا ہے۔ ساقی نامہ میں علامہ نے زندگی کی حقیقت اس طرح بیان فرمائی ہے

دما دم رواں ہے یمِ زندگی !　　　ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی　　　عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی

کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور　　　کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور

بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے

ہوا جب اسے سامنا موت کا
کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا

اتر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں

اب بانگِ درا میں عشق اور موت کا مقابلہ ملاحظہ کیجئے۔

سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی
ہنسی اس کے لب پر ہوئی آشکارا

گری اس تبسم کی بجلی اجل پر
اندھیرے کا ہو نور میں کیا گزارا

بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ
قضا تھی شکارِ قضا ہو گئی وہ

مسجد قرطبہ میں اسی حقیقت کو انہوں نے ایک مصرعہ میں ادا کر دیا ہے۔

ع عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

اسی نظم میں اب عشق کی دوسری خصوصیات ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ زندگی اور عشق میں کتنی مشابہت ہے۔

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

عشق فقیہہ حرم عشق امیر جنود!
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

ان اشعار سے زندگی اور عشق کے باہمی تعلق پر روشنی پڑتی ہے۔ دونوں میں کئی باتیں مشترک ہیں اولاً یہ کہ عشق اور زندگی دواں ہیں اور قیام ان کے حق موت کا حکم

رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ دونوں کی بدولت کائنات میں ہنگامہ رونق اور ارتقا کار فرما ہے۔ تیسرے یہ کہ دونوں کی بدولت کائنات میں ہنگامہ رونق اور ارتقا کارفرما ہے تیسرے یہ کہ موت سے ڈرنے کی بجائے اس کی گھات میں رہتے ہیں۔ عشق اور زندگی کا تعلق ظاہر کرنے کے بعد اب زندگی اور خودی کا تعلق ملاحظہ ہو۔

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے (ساقی نامہ)

زندگی کی نکھری ہوئی شکل عشق ہے اور عشق کا جوہر خودی ہے۔

ع جوہر زندگی ہے عشق، جوہر عشق ہے خودی

اس بحث سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ زندگی اور عشق میں گہرا تعلق ہے اور ایک کا وجود دوسرے کا مرہون منت ہے لیکن ان سب میں عشق کی اہمیت زیادہ ہے کیوں کہ زندگی کے ولولے عشق ہی کی بدولت ہیں۔

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم

زندگی میں یہ سب تیزی اور شاہبازی عشق کی وجہ سے ہے اور عشق کا جوہر خودی ہے اس لئے عشق کو علامہ کے افکار میں مرکزی مقام حاصل ہے یہی سبب ہے کہ اس نظم میں بھی ایک پورا عشق کی حقیقت اور صفات کو بیان کرنے کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی تمام تکالیف کا مداوا عشق ہے۔ لیکن کون سا عشق؟ وہ عشق نہیں جس کا چرچا صدیوں سے ہماری شاعری میں ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ عشق میر اور غالب کے عشق سے مختلف ہے۔ میر صاحب اولین عاشق کو سنیس دیتے ہیں اور غالب اسے دماغ کا خلل قرار دیتے ہیں۔ لیکن اقبال کا عشق اپنے اندر خدائی

صفات رکھتا ہے وہ خدا کا رسول بھی ہے اور خدا کا کلام بھی۔

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

(مسجد قرطبہ)

اقبال عشق سے اطاعت الٰہی اور رسول خدا سے بے پناہ محبت مراد لیتے ہیں جس کے بغیر دنیا میں ترقی کرنا ناممکن ہے۔ آج مسلمانوں کی ذلت اور رسوائی کا باعث بھی یہی امر ہے کہ وہ عشق کی لذت سے محروم ہیں۔ ساقی نامہ میں اسے دوسرے انداز سے پیش کیا ہے۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

مسجد قرطبہ کی عظمت اور جلال و جمال کا باعث ان مردان حق کی ذات ہے جنہوں نے عشق رسول سے سرشار ہو کر اس کی تعمیر پر کمر ہمت باندھی اور اپنے جذبہ عشق سے اس مسجد کو لافانی کر دیا۔

اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

علامہ نے عشق کے لفظ کو نئے معانی و مطالب عطا کئے ہیں اور اس کثرت سے اس پر لکھا ہے کہ کسی شاعر کے ہاں اتنی کثرت اور اس انداز سے اس کا تذکرہ نہیں آیا چونکہ عشق عموماً عقل کا حریف سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے علامہ نے بھی عقل و عشق کا جا بجا موازانہ بھی کیا ہے اور مقابلہ بھی لیکن ان کے نزدیک زیادہ اہم اور ناگزیر عشق ہی ہے۔ عقل جب تک عشق کے تابع نہ ہو اس کی رسائی مقصود تک نہیں ہو سکتی۔ جاوید نامہ میں اس شعر میں اسی کی حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔

عقل چوں از عشق برخوردار نیست ۔۔۔ جز تماشا خانۂ افکار نیست

چونکہ عقل بہت عیار ہے اور مختلف روپ دھار کر انسان کو گمراہ کر سکتی ہے۔ اس لئے انھوں نے اس کی مذمت بھی کی ہے۔

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے

عشق بے چارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

عقل انسان کو اللہ کی راہ میں تن من اور دھن قربان کرنے سے روکتی ہے اور مفلسی اور مستقبل کے تاریک ایام کا تصور دلا کر اسے کار خیر سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے اگر خلیل اللہ عقل کو رہنما بناتے تو آتش نمرود کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کبھی چھلانگ نہ لگاتے۔ کیوں کہ عقل کے نزدیک آگ میں کودنے کا منطقی نتیجہ جل کر خاکستر ہو جانا چاہیے ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق ۔۔۔ عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

(غزل)

اس حقیقت کے باوجود کہ علامہ عقل پر عشق کی برتری کے قائل ہیں۔ وہ عقل کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے لیکن راہوار زندگی کی باگ کلی طور پر عقل کے ہاتھ میں دینے کے مخالف ہیں کیوں، کہ عشق جہاں تک پہونچ سکتا ہے۔ عقل کے ہاتھ میں دینے کے مخالف ہیں کیونکہ عشق جہاں تک پہونچ سکتا ہے عقل کی رسائی وہاں تک نہیں ایک خاص منزل تک عقل رہنمائی کر سکتی ہے لیکن اس سے آگے عشق کا دامن تھامے بغیر چارہ نہیں۔

عقل کو آستاں سے دور نہیں ۔۔۔ اس کی تقدیر میں حضور نہیں

اسی بات کو ایک رباعی میں اس طرح کہا ہے۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل کی اہمیت اسی قدر ہے کہ اس کی روشنی میں راہ آسانی سے طے کی جا سکتی ہے لیکن منزل کو پانے کے لئے عشق کی رہنمائی اختیار کرنی پڑتی ہے اور جب عشق کو رہبر بنا لیا جاتا ہے تو صدیوں کی مسافت لمحوں میں طے ہو جاتی ہے آسمانوں کی وسعتیں سمٹ کر مرد مومن کے دامن میں آجاتی ہے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

(غزل)

اگرچہ عقل کی بدولت اس عالم رنگ و بو کی الجھنوں کو سلجھایا جا سکتا ہے لیکن اگر عقل کو عشق کا تابع نہ بنایا جائے تو وہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے اور انسان کو ایسی بھول بھلیوں میں پھنسا دیتی ہے جہاں سے نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ اسی لئے عقل اور دل کا ساتھ ضروری ہے۔ علامہ پیر روم کے اس قول کو پورے ہم نوا ہیں۔

علم گر بر تن زنی مارے بود!
علم گر بر دل زنی یارے بود!

علم و فن (اور علم و فن عقل کے مرید ہیں) کی اہمیت اقبال کی نظر میں کبھی کم نہیں ہوئی اور انھوں نے اس کا اظہار کئی موقعوں پر کیا ہے۔

قوت افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

علم از سامان حفظ زندگی است
علم از اسباب تقویم خودی است

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عقل اور عشق دونوں کی اہمیت

مسلم ہے اور اس کائنات کو مسخر کرنے اور روحانی منازل کے طے کرنے کے لئے دونوں کا ساتھ ضروری ہے ان کا حسین امتزاج ہی مرد کامل کی پیدائش میں ممد ثابت ہو سکتا ہے۔ انھوں نے مسجد قرطبہ میں اسی حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ مرد مومن کا پیکر جمیل تیار ہوتا ہے۔

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمی محفل ہے وہ

مرد مومن اقبال کا مثالی انسان ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ بلند مرتبہ کا حامل ہے ان کے خیال میں اس کی معراج رسول اکرم کی ذات گرامی میں پائی جاتی ہے چونکہ حقیقت محمدی ہر زمانے میں مختلف افراد میں جلوہ گر رہتی ہے اس لئے انسان کامل بھی سوسائٹی میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اس کے بغیر ارتقا کا عمل جاری نہیں رہ سکتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اقبال کا مرد مومن نطشے کے فوق البشر کا مماثل ہے لیکن یہ غلط ہے کہ وہ اس سلسلے میں اسلامی مفکرین خاص طور پر عبد الکریم جیلی سے متاثر معلوم ہوتے ہیں ان کے مرد مومن اور عبد الکریم جیلی کے انسان کامل کی صفات بڑی حد تک مشترک ہیں لیکن نطشے کے فوق البشر سے اقبال کا مرد مومن بہت مختلف ہے ان میں وہی فرق ہے جو ہٹلر اور فاروق اعظم میں ہے۔ نطشے اندھی قوت کا پجاری ہے اور خدا کا منکر ہے اقبال تو خود نطشے کو مومن بنانے کی فکر کرتے ہیں وہ بھلا اس کے مقلد کیسے ہو سکتے

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں   تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

اقبال کا مرد مومن لا سے الا کی طرف بھی آتا ہے جب کہ نطشے لا کی بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ نطشے کا فوق البشر قوت کا پیکر جو اخلاق کے ضابطوں سے

آزاد ہے۔ وہ قانون قوت کے علاوہ کسی اور ضابطے کا پابند نہیں اقبال بھی قوت کے اس لئے قائل ہیں کہ کمزوروں کے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے اور جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہے اسی طرح طاقتور انسان کمزوروں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیتے ہیں اور انھیں دنیا میں زندہ رہنے کا حق بھی نہیں دیتے

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

(ابوالعلامعری)

جو شخص بھی زمانے کے تقاضوں کو پورا نہیں کرے گا اور اس کی کسوٹی پر پورا نہیں اترے گا وہ زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ قانون اس بات کا مقتضی ہے کہ اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہی باقی رہیں۔ کمتر بہتر کے لئے جگہ خالی کرتا رہے اس نظم میں بھی اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔

تو ہے اگر کم عیار میں اگر کم عیار

موت ہے تیری برات موت ہے میری برات

اقبال کے مرد مومن کی قوت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے اس لئے اس میں جسمانی قوت ہی نہیں روحانی قوت بھی بے اندازہ پائی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی ایک نظر تقدیروں کے فیصلے کر سکتی ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں (طلوع اسلام)

اقبال صرف جسمانی طاقت اور جسم کی فربہی کے قائل نہیں اور نہ وہ چہرے کی سرخی

کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں کیونکہ یہ تو غازہ اور ساغر و مینا کی کرامات بھی ہو سکتی ہے اور آب و نان کی بیشی کا نتیجہ بھی۔ وہ تو جان پاک کے خواہاں ہیں جس کا حامل صرف مرد مومن ہی ہو سکتا ہے اور یہیں سے ان کی راہ ہٹتے ہٹتے سے الگ ہو جاتی ہے۔

وہ شے کچھ اور ہے کہتے ہیں جان پاک جسے
یہ رنگ و نم یہ لہو آب و نان کی ہے بیشی

جسم میں لہو کی فراوانی آب و نان پر منحصر ہے لیکن جان پاک اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عشق رسول میں شدت سے حاصل ہوتی ہے اور جب بندہ اطاعت الٰہی کو اپنا شعار بنا لیتا ہے تو اس کی مرضی خدا کی مرضی ہو جاتی ہے اور اس کا خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

(مسجد قرطبہ)

لیکن دنیاوی جاہ و جلال اور شوکت و حشمت میں بھی وہ یکتا ہوتا ہے اس کی سلطنت کی سلطنت کی وسعت بے کراں ہوتی ہے۔ جب وہ شمشیر بکف نکلتا ہے تو کائنات میں کوئی چیز اس کے مقابلہ میں نہیں ٹھہرتی۔ وہ سیف اللہ بن جاتا ہے اور پہاڑ اس کی ہیبت سے رائی ہو جاتے ہیں۔ مرد مومن کے اس پہلو کو بھی "مسجد قرطبہ" میں بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔

اس کی زمیں بے حدود اس کا افق بے ثغور — اس کے سمندر کی موج دجلہ و دنیوب و نیل
اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب — عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل
ساقی ارباب ذوق فارس میدان شوق — بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اس کی اصیل

مردِ سپاہی ہے اس کی زرہ لاالٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لاالٰہ

اقبال مجرد قوت کے پرستار نہیں ہیں وہ جلال و جمال کا امتزاج چاہتے ہیں مومن گرمی اور خنکی، سختی اور نرمی، غفاری و قہاری کا مجموعہ ہوتا ہے۔ تبھی وہ تسخیر کی قوتوں کو بروئے کار لاکر اور کائنات کو مسخر کرکے بنی نوع انسان کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر وہ صرف جلالی اور قاہری صفات کا مجموعہ ہو تو دنیا کے لئے رحمت نہیں بن سکتا بلکہ زحمت بن جاتا ہے اور خیر و برکت کی بجائے تباہی و بربادی کا پیغامبر ثابت ہوتا ہے لیکن اقبال کا انسان کامل تو خیر و برکت اور رحمت خداوندی کا مظہر ہے اسی لئے اس جلالی اور جمالی دونوں قسم کی صفات پائی جاتی ہیں۔ وہ جوئے خوش خرام کی مانند ہے جس میں سختی کوشی اور نرمی کی آمیزش ہے۔ اگر اس کی راہ میں چٹانیں حائل ہوں تو اس کا سینہ چیر کر گذر جاتی ہے لیکن راہ میں چمن زار آجائے تو نغمہ خواں ہو جاتی ہے۔ یہی حال مردِ مومن کا ہے کہ جب وہ اپنا نصب العین حاصل کرنے کی خاطر میدانِ دعا میں کودتا ہے تو قیامت برپا کر دیتا ہے۔ لیکن بزمِ احباب میں شل پرنیاں ہو جاتا ہے۔ "مسجد" میں اقبال نے مردِ مومن کے ان دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اسکی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق اسکا نیاز اس کا ناز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو ! !
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اقبال کا مردِ مومن جس طرح عشقِ الٰہی سے سرشار ہے اسی طرح دنیاوی علوم و فنون سے بھی آراستہ ہے۔ یہ [illegible] صفات اس میں اپنی انتہائی شکل میں پائی جاتی ہیں۔

تیرے علم و محبت کی نہیں انتہا کوئی!
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

اسی حقیقت کو انھوں نے اپنی اس غیر فانی نظم میں نہایت بلیغ انداز میں پیش کیا ہے۔

عقل کی منزل ہے عشق کا حاصل ہے وہ
حلقہ آفاق میں گرمی محفل ہے وہ

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری میں مردِ مومن کی جو صفات بیان کی ہیں ان کا خلاصہ انھوں نے اس ایک نظم میں نہایت بلیغ انداز میں پیش کر دیا۔

اقبال کے مردِ مومن میں ہمیں انفرادیت کی تکمیل کا نمونہ ملتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انھوں نے اجتماعی زندگی کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا انھوں نے انفرادیت کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کی تکمیل کا بھی خیال رکھا ہے اس کے برعکس مغربی فلسفیوں نے یا تو صرف اجتماعی زندگی کو سب کچھ قرار دیا ہے یا پھر فرد کی صلاحیتوں پر اجتماعی نظام کو قربان کر دیا ہے۔ سرمایہ داری نظام نے انفرادی آزادی کے فروغ کیلئے سازگار ماحول پیدا کیا۔ جس میں فرد جس طرح چاہے دولت و ثروت اور قوت حاصل کر سکتا ہے۔ اس کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ کو برداشت نہیں کیا جاتا۔ اس کے برخلاف اجتماعی نظام کے علمبرداروں نے فرد کو سوسائٹی کے بالکل تابع کر دیا ہے۔ اور وہ ہر کام کے لیے اجتماعی نظام سے ہدایات کا طالب ہوتا ہے۔ متوسط ازمنہ یورپ میں جو نظام رائج تھا اس میں فرد اتنی پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا کہ اس کی انفرادی

ترقی کے مواقع مفقود ہو گئے تھے۔ اقبال فرد کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے حامی ہیں۔ اور اس کے ارتقا کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا مرد مومن انفرادی ارتقا کی معراج ہے لیکن وہ فرد کو بے پناہ قوت کا حامل بنانے کے ساتھ ساتھ اجتماعی نظام حیات کے تقاضوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ وہ اپنے وجدان کی بدولت اجتماعی اور انفرادی قوتوں میں تطابق پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ فرد کی ترقی میں جماعت ممد ثابت ہوتی ہے اور وہ ارتقائی منازل کو طے کرنے کے لئے اجتماعی نظام کا مرہون منت ہے۔ جماعت کے بغیر فرد کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا ہے

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اقبال کے خیال میں فرد کی انفرادی قوتوں اور ارتقا کو اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ کسی قوم کی اجتماعی ترقی افراد کی انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک شخص کوئی چیز ایجاد کرتا ہے اور دوسرے اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ ایک شخص ہی قوانین کا خالق ہوتا ہے۔ جس کی پابندی جماعت کرتی ہے لیکن جماعت کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں جس کو پورا کرنا فرد کے لئے لازمی ہے۔ فرد کا تجریدی وجود لایعنی ہے اور جماعت کی مدد کے بغیر اس کی ترقی ناممکن ہے۔ فرد اپنے سے پہلے گزرے ہوؤں کے افکار و خیالات سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے بعد آنے والوں کے لئے ان میں اضافہ کر کے چھوڑ جاتا ہے۔

فرد اور جماعت کا یہ امتزاج اقبال کو اسلامی نظام حیات میں نظر آتا ہے اسلامی تمدن ایک طرف اگر فرد کی انفرادی صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کرتا ہے

ہے تو دوسری طرف جماعتی پابندیاں بھی عائد کرتا ہے اور اس طرح ایک صالح نظام وجود میں آتا ہے جس کا ہر فرد خیر و برکت کا مجسمہ ہوتا ہے اقبال نے اسلامی نظام کی انہی خوبیوں کو ہمیشہ سراہا ہے ۔ اور اس بات کا ماتم کیا ہے کہ اب وہ اعلیٰ تمدن موجود نہیں جو دنیا کے لئے رحمت کا باعث تھا اور جس کے افراد حامل خلق عظیم تھے جن کی بدولت آج یورپ خرد کی گتھیاں سلجھا رہا ہے اور جس کی تربیت سے مغربیوں کو یہ مقام بلند نصیب ہوا ہے ۔ اقبال نے اسلامی نظام کی خصوصیات کا ذکر اپنی شاعری میں اکثر کیا ہے "مسجد قرطبہ" میں بھی اس نظام کی صفات کے متعلق بلیغ اشارے کئے گئے ہیں ۔ اسلامی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کی آنکھ نمناک ہو جاتی ہے اور ان کی زبان سے بے اختیار آہ نکل جاتی ہے ۔ دیکھئے ذیل کے اشعار میں اسلامی نظام تمدن کی برکات بیان کرتے ہوئے شاعر کا درد بھی نمایاں ہے ۔

آہ وہ مردان حق! وہ عربی شہسوار　　حامل خلق عظیم! صاحب صدق و یقین
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب　　سلطنت اہل دل فقر ہے شاہی نہیں
جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب　　ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی　　خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں

ان اشعار سے علامہ اقبال کی ماضی سے دلچسپی ظاہر ہوتی ہے ۔ لیکن وہ ماضی پرست ہرگز نہیں ہیں بلکہ ماضی کی بنیادوں پر نئی عمارتیں استوار کرنی چاہتے ہیں ۔ ماضی سے ان کی یہ دلچسپی انھیں اسلامی تاریخ کے ورق پلٹنے پر مجبور کرتی ہے ۔ اس نظم میں انھوں نے مسلمانان اندلس کے متعلق بلیغ اشارے کئے ہیں اور اس طرح ان کی چھ سو سالہ تاریخ کو ان اشعار میں سمو دیا ہے ۔ وہ جہاں موقع پاتے ہیں مسلمانوں کے ان کے شاندار ماضی کی طرف

متوجہ کرتے ہیں تاکہ ان میں اسلاف کا سا جوش اور ولولہ پیدا ہو جس سے عمل کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ ماضی کے واقعات ہماری زندگی میں بے حد اہمیت رکھتے ہیں ہم ان سے بصیرت حاصل کرتے ہیں اور عبرت بھی اسی لیے قرآن حکیم میں رسول اکرم سے پیشتر کے انبیا اور اقوام کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ مسلمان ان کے نیک اعمال کو مشعل راہ بنائیں اور برائیوں سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کریں۔ اقبال نے دیگر موضوعات کی طرح یہاں بھی قرآن حکیم کی تقلید کی ہے۔ اور مسلمانوں کو ان کے ماضی سے باخبر رکھنے کی سعی کی ہے۔ کیونکہ کوئی قوم اپنے ماضی سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ماضی کی روایات بالفاظ دیگر ہماری تاریخ سے اجتماعی خودی فروغ حاصل کرتی ہے۔ اور اس سے سبق حاصل کر کے ہی اجتماعی زندگی کو بہتر اور اعلیٰ معیاروں کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے زیر مطالعہ نظم میں بھی انھوں نے مسلمانوں کو اپنی تاریخ سے بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے یہی بلکہ دیگر اقوام میں جو انقلابات وقوع پذیر ہوئے ہیں ان کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ لوتھر کی تہذیبی تحریک جس نے یورپ کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ فرانس کا انقلاب جو جمہوریت کا نقیب ہے اور رومیوں کی انقلابی کوششوں کا تذکرہ بھی وہ اس لئے کرتے ہیں تاکہ اس سے مسلمانوں کو اپنی اجتماعی زندگی اور اپنے تمدن کو بہتر بنانے میں مدد ملے۔

دیکھ چکا المنی شورش اصلاح دیں — جس نے نہ چھوڑے کہیں نقش کہن کے نشاں
حرف غلط بن گئی عصمت پیر کنشت — اور ہوئی فکر کی کشتی نازک رواں
چشم فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب — جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملت رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر — لذت تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں

(مسجد قرطبہ)

جس طرح فرد کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ اپنی خودی کی تربیت کرے اور قوائے جسمانی کو کمزور نہ ہونے دے اور اپنی روحانی اقدار کو نہ مٹنے دے اسی طرح قوموں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ تجدید واصلاح پر عامل رہیں۔ اور اپنی خودی کی حفاظت کرتی رہیں۔ اگر ان میں زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہ رہے تو ان کا مٹ جانا ایک یقینی امر ہے قوموں پر انقلاب آتے رہتے ہیں لیکن وہ قومیں جن میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو وہ انقلابات زمانہ کو جھیل جاتی ہے اور ہر انقلاب کے بعد ان کی رگوں میں نیا خون گردش کرنے لگتا ہے ان میں نئی روح پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے نئے عزم اور ولولے کے ساتھ راہ عمل میں گامزن ہو جاتی ہیں دیکھئے اقبال نے اس حقیقت کی نقاب کشائی اس نظم میں کس طرح کی ہے۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

اگر قومیں اپنا محاسبہ کرتی رہیں اور انقلابات زمانہ کا مقابلہ کرنے کے لئے کمربستہ ہوں تو وہ زندگی دوام پا سکتی ہیں۔ کیونکہ قوموں کی زندگی افراد کی طرح محدود نہیں ہوتی۔ ان کی زندگی اخلاقی ہوتی ہے جو الفیس قوانین فطرت سے ماورا کرتی ہے لیکن نیابت الٰہی اور نتیجۃً زندگی دوام اسی قوم کو مل سکتی ہے جو اپنے آپ کو اس مرتبہ کا اہل ثابت کردے اور ہر وقت اپنے عمل کا حساب دینے کو تیار ہو۔

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب (مسجد قرطبہ)

ملت اسلامیہ کے ذکر کے ساتھ فرنگیوں کے تذکرہ اقبال کے لئے ناگزیر ہو جاتا

ہے۔ اہل یورپ عالم اسلام کے لئے مستقل خطرہ رہے ان کے ہاتھوں مسلمان ذلت و پستی کے عمیق گڑھے میں اگرے رہے۔ اسی لئے جب کبھی ان اقوام کا تذکرہ علامہ کرتے ہیں۔ تو ان کے لہجہ میں تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ شبلی بھی اہل فرنگ سے نفرت کرتے تھے۔ لیکن اقبال کی نفرت شدید تر ہے۔ وہ مغربیوں سے کیوں اس قدر متنفر تھے اور ان کو ملت اسلامیہ کے حق میں زہر قاتل سمجھتے رہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہوتا ہے۔

یہ زائرین حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے | ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں
غضب ہے یہ "مرشدان خود بیں" خدا تیری قوم کو بچائے | بگاڑ کر تیرے مسلموں کو اپنی عزت بنا رہے ہیں!

لیکن اقبال جانتا ہے کہ ان کی یہ عزت دائمی نہیں ان کے چہروں کی سرخی اصلی نہیں نقلی ہے۔ یہ تو غازہ اور ساغر و مینا کی کرامت ہے اس لئے زردی کی پیشیر دا ہے وہ ان کے انجام سے باخبر ہے۔ اسے علم ہے کہ ملت اسلامیہ کی روح میں اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہ اضطراب کسی وقت کوہ آتش فشاں کی مانند پھٹ پڑے گا۔ اگرچہ اس وقت اس "واویلے" کو فرنگی زخمہ ور کی تیز دستی نے دبا رکھا ہے لیکن زمانہ اب نئی کروٹ لے رہا ہے اور اپنے جلو میں اہل یورپ کے لئے تباہیوں اور بربادیوں کے سامان لئے ہوئے ہے۔ شاعر چونکہ خدا کے راز دانوں میں سے ہے اس لئے اسے قبل از وقت ہی فرنگ کے اس مشکل وقت کی خبر ہو چکی ہے۔

خبر ملی ہے خدا وندان بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگذر سیل بے پناہ میں ہے

اسی چیز کو انھوں نے "مسجد قرطبہ" میں ایک دوسرے انداز سے بیان کیا ہے یہاں رمز و ایما کے پردوں میں دلکش پیرایہ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ وہ اپنی بات اشارہ

کنایہ میں کہنا مناسب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ چہرہ افکار سے پردہ ہٹا دیں تو دانایان فرنگ جو عقل کے پرستار اور جذبۂ عشق سے عاری ہیں وہ اپنے مستقبل کے متعلق لیسے خیالات کو سننے کی تاب نہ لا سکیں گے۔

عالم نو ابھی پردۂ تقدیر میں ہے
میری نگاہوں میں ہے اسکی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

اور انقلاب کی نوید اس طرح سناتے ہیں۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

ہر عظیم شاعر کے کلام میں فن کا ایک نظریہ پایا جاتا ہے کبھی وہ اس کا اظہار براہ راست کرتا ہے تو کبھی اس کے پانے کے لیے نقاد کو تلاش و جستجو کرنی پڑتی ہے کیونکہ لبسا اوقات شاعر فن کے اسرار و رموز کو بھی حدیث دیگراں بنا کر پیش کر دیتا ہے۔ اقبال کے کلام میں بھی آرٹ کا ایک مخصوص نظریہ ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے تنقیدی نقطہ نظر کا اظہار رمز و کنایہ میں بھی کیا ہے اور صاف الفاظ میں بھی اس پر روشنی ڈالی ہے آرٹسٹ خارجی مظاہر سے چاہے وہ فطری یا انسانی فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ ان سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا ہے اور پھر ان نامکمل چیزوں کو اپنے تخیل کی دنیا میں بہتر اور مکمل صورت میں دیکھتا ہے اور وہ منازل جن کو فکر کی مدد سے طے کرنا مشکل ہوتا ہے۔ آرٹسٹ تخیل کی مدد سے آن واحد میں طے کر جاتا ہے لیکن تخیل کی پرورش جذبہ کرتا ہے۔ بادی النظر میں آرٹسٹ تخیل کی مدد سے آن واحد میں طے کر جاتا ہے لیکن تخیل کی پرورش جذبہ کرتا ہے بادی النظر میں آرٹسٹ کی تخیلی دنیا میں زندگی کا معمولی نظم و ضبط نظر نہیں آتا۔ اس لیے حقیقت کا شعور جذبے کی رہبری کے بغیر

ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے ہاں جذبے کی اہمیت پر زیادہ زور دیا گیا ہے جذبہ یا عشق کے بغیر کسی کام میں عظمت کا پیدا ہونا ناممکن ہے فن مصوری یا فن تعمیر موسیقی ہو شاعری خون جگر کی چاشنی شامل کئے بغیر ان میں بقائے دوام کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا عشق کے بغیر کوئی شخص کبھی منزل مقصود کو نہیں پا سکتا۔ جب تک اسے اپنے نصب العین سے جنوں کی حد تک عشق نہ ہو وہ اسے پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ صاحب ساز کے لہو کی آمیزش کے بغیر راگ کی تخلیق ناممکن ہے۔

خون دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو

جب تک مغنی دل کے اسرار و رموز سے آگاہ نہ ہو اسے کسب کمال حاصل نہیں ہو سکتا ——

جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

اسی حقیقت کو مسجد قرطبہ میں اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

اقبال کے نزدیک فنون لطیفہ میں زندگی کا تڑپ ہونا ضروری ہے اس کے بغیر کوئی فن کبھی لافانی نہیں ہو سکتا۔ لیکن زندگی کی تڑپ ذوق و شوق اور جنوں کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ وہ فن کار کو کبھی دل کی رمز سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ خون جگر کے بغیر فن کی نمود ہی ناممکن ہے۔ خون جگر یہاں عشق کا قائم مقام ہے جو سخت محنت اور ریاضت چاہتا ہے۔ ہر فن اپنی پیدائش کے لئے سخت کوشی اور ریاضت مقتضی ہے۔ میر صاحب کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ انھوں نے مدت تک پائیں باغ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور

اپنے کام میں اتنے منہمک رہے کہ گلستاں کی سیر کا خیال تک دل میں نہ آیا۔ اس سخت محنت نے ان کے ہاں فن کی شکل اختیار کرلی۔ مسلسل کوشش اور ریاضت کے بغیر فن کی تکمیل ناممکن ہے۔ اس حقیقت کا اظہار انھوں نے زیر نظر نظم کے ان اشعار میں کیا ہے۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود!

قطرۂ خون جگر سل کو بناتا ہے دل
خون جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

اگرچہ کوشش اور ریاض سے فنون لطیفہ میں کمال حاصل کیا جا سکتا ہے اور ایک حد تک ان میں عظمت بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن سیل حوادث سے محفوظ رکھنے اور اس میں دوامی صفت پیدا کرنے کے لئے ایمان کی بھٹی میں سے گزرنا ضروری ہے۔ دنیا میں صرف وہ فن پارہ زندہ جاوید ہو سکتا ہے جس کو کسی صاحب ایمان نے پایۂ تکمیل کو پہونچایا ہو کیونکہ اس کا عمل عشق سے قوت حاصل کرتا ہے۔ اور عشق پر موت حرام ہے۔

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کار جہاں بے ثبات کار جہاں بے ثبات

اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا!
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام
جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

اقبال کے ہاں حکمت وہ حقیقت ہے جس میں جذبے کا دخل نہ ہو اس میں سوز دل کی آمیزش ہو جائے تو وہ شعر کا روپ دھار لیتی ہے۔

حق اگر سوزے نہ دارد حکمت است

شعر می گردد چوں سوز از دل گرفت

یہ سوز دل فن کو تاثیر سے مملو کرتا ہے اور فن کار میں یہ قوت پیدا کرتا ہے۔

کہ وہ عوام کی زندگی کے خطوط متعین کرے اور ان کے ذوق اور اخلاق کی تربیت کرے لیکن اگر فن کا سینہ شوق الٰہی سے روشن نہ ہو تو یہ فن مرگ دوام کی حیثیت رکھتا ہے

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ فنونِ لطیفہ کے افادی پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔ یہ قوم کے لئے عین حیات ثابت ہوتے ہیں اور یا پھر مرگ دوام شاعر ان کے نزدیک دیدۂ بینائے قوم ہے اور شاعری اگر آدم گری کی صفت رکھتی ہو تو جزو بیست از پیغمبری ہے پیغمبر کی طرح شاعر بھی رہنمائی کے فرائض سر انجام دیتا ہے۔

محفلِ نظمِ حکومت چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگین نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

لیکن جب تک وہ کھری بات نہ کہے قوم کے حق میں مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور نہ انھیں صراط مستقیم پر چلا سکتا ہے۔

شاعرِ دلنواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری

کھری بات کہنے والا شاعر قوم کے جسد مردہ میں زندگی کی لہر دوڑا سکتا ہے لیکن یہ بے باکی صرف اس شاعر میں پیدا ہو سکتی ہے جو جذبۂ عشق سے سرشار ہو اور جس کا سینہ شوق سے فروزاں ہو۔ اور ذوق و شوق کا یہ جذبہ اقبال کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

شوق مری لے میں ہے شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے

(مسجد قرطبہ)

یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں یہ تاثیر ہے کہ وہ مسلمانوں کے دل میں تڑپنے پھڑکنے

کی آرزو پیدا کردے اور انھیں جذبہ سرفروشی سے سرشار کردے۔ وہ تاک ہزار سالہ کو
آمادہ کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔

اے کہ ز من مژدۂ گرمی آہ نالہ را | زندہ کن از صدائے من تاک ہزار سالہ را
غنچہ دل گرفتہ را از نفسم گرہ کشائے | تازہ کن از نسیم من داغ درون لالہ را!

اسی چیز کو انھوں نے "مسجد قرطبہ" میں دلوں کی "کشود" سے تعبیر کیا ہے۔

تیری نوا دل فروز میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود

اقبال کو اپنے ہر دور شاعری میں مناظر فطرت سے گہری وابستگی رہی ہے
بانگ درا میں تو مظاہر فطرت پر مستقل نظمیں مل جاتی ہیں۔ لیکن بعد میں جب اقبال کی
شاعری نے مربوط فلسفہ کی شکل اختیار کرلی اور ان کا مقصد اپنی شاعری سے ملت
اسلامیہ کے جسد مردہ میں نئی روح پیدا کرنا قرار پایا تو وہ مظاہر فطرت پر زیادہ توجہ نہ دے
سکے لیکن اس کے باوجود ان کی دلچسپی مظاہر قدرت سے برابر قائم رہی اور فطرت کے
حسین نظاروں کو بالکل نظرانداز نہ کر سکے۔ سکوت لالہ وگل سے کلام پیدا کرنے کی
خواہش ہر دور میں ان کے دل میں چٹکیاں لیتی رہی حتی کہ وہ اپنی غزلوں میں بھی فطرت
کے پرفریب نظاروں کا ذکر کیے بغیر نہ رہ سکے مثال کے طور پر بال جبریل کی وہ مشہور
غزل پیش کی جاسکتی ہے جس میں علامہ نے نہایت دلپذیر انداز میں من اور تن کا موازنہ
کیا ہے۔ اس غزل میں صرف نو شعر ہیں جن میں سے پہلے چار میں علامہ نے صحرائی موسم
بہار کی دلکش تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے اسی طرح بال جبریل کی دو مشہور نظموں۔ ساقی نامہ
اور ذوق وشوق اور مسجد قرطبہ کے ابتدائی بند فطرت کے دلکش نظاروں کے لئے وقف

کر دیئے ہیں لیکن مسجد قرطبہ میں چونکہ اس کا تفصیل کا موقع نہ تھا اس لئے صرف تین اشعار پر اکتفا کی گئی ہے لیکن یہ شعر بھی اپنی دلکشی اور خوبصورتی میں اپنا جواب نہیں رکھتے مناظر فطرت کے ساتھ علامہ کی یہ وابستگی ان کے دور اولین کے کلام میں ان کے جذبۂ حب وطن کی نشاندہی کرتی ہے لیکن بعد میں بھی مظاہر فطرت سے ان کی یہ وابستگی قائم رہی جیساکہ سطور بالا میں بیان کیا گیا ہے ۔ اس کے اسباب و علل کا تجزیہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔ اس دور میں علامہ کائنات کے مظاہر پر غور و فکر کرنے سے یہ نتائج اخذ کر کے اپنے فلسفہ کو تقویت پہونچاتے ہیں انھیں فطرت کے حسن میں حسن مطلق کی جھلک دکھائی دیتی ہے ۔ پھر یہ مقام جہاں خلوت میں جلوت کا نظارہ ہوتا ہے غور و فکر کے لئے بہت موزوں ہے ؎

حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کیلئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

ایک جگہ تو وہ صاف صاف اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ شعلۂ عشق کے لئے شہروں کے شور و شغب کی تند و تیز ہوائیں سازگار نہیں اس کے برعکس فطرت کے حسین مناظر عشق الٰہی میں اضافہ کا موجب بنتے ہیں ۔

عشق شور انگیز بے پروائے شہر
شعلہ میرد زغوغائے شہر

یہی وجہ ہے کہ کائنات اور فطرت کے عناصر سے ان کی وابستگی ہر زمانے میں قائم رہتی ہے اس بات کے ثبوت کے لئے ان کی تمام تصانیف شاہد ہیں ۔

اقبال کو مناظر فطرت میں سے آفتاب ، دریا کے پانی ، شفق اور شام کے منظر سے زیادہ الفت ہے ان چیزوں سے انھیں جذباتی وابستگی ہے ۔ اس لئے جب وہ ان پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کے اشعار میں بے حد دلکشی اور رعنائی پائی جاتی ہے اور قلم کا

بھی ایک خاص قسم کا تاثر قبول کرتا ہے۔ جسے الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ اقبال نے اپنی ان محبوب چیزوں کو "مسجد قرطبہ" کے صرف تین اشعار میں اکٹھا کر دیا ہے۔ یہ اشعار رمز وایما، اور تشبیہات و استعارات کی خوبصورتی کی وجہ سے اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں۔

وادی کہسار میں غرق شفق ہے سحاب ۔۔۔ لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

سادہ و پرسوز ہے دختر دہقاں کا گیت ۔۔۔ کشتی دل کے لئے سیل ہے عہد شباب

آب روان کبیر تیرے کنارے کوئی ۔۔۔ دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

ان میں سے پہلا شعر اپنے حسن و دلکشی میں اقبال کی منظریہ شاعری میں لاجواب ہے شام کے وقت سورج غروب ہونے کا منظر اقبال کو بہت مرغوب ہے اور یہ سماں ان کے جذبات میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔ انھوں نے مسجد قرطبہ کے علاوہ اور مقامات پر (مثلاً ایک آرزو اور بزم انجم میں) غروب آفتاب کا منظر بیان کیا ہے تینوں مقامات پر اقبال نے نئے انداز، نئی تشبیہوں اور استعاروں کے ساتھ اس خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ممکن نہیں۔ مسجد قرطبہ والا شعر آپ ملاحظہ فرما چکے۔ اب بزم انجم اور ایک آرزو کے اشعار بھی پیش خدمت ہے۔

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو ۔۔۔ طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے

پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور ! ۔۔۔ قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے

(بزم انجم)

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو ۔۔۔ سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو!

(ایک آرزو)

اردو شاعری میں شام کے حسین منظر کو اس دلکشی اور اختصار کے ساتھ کسی

اور شاعر نے بیان نہیں کیا ہے۔ تین مرتبہ اس موضوع پر ایک نئے انداز اور نئے زاویہ سے قلم اٹھانا اقبال جیسے قادر الکلام شاعر ہی کا کام ہے۔

اقبال کی نظمیہ شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی نظموں میں تغزل کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین کے قول کے مطابق "شعریت تخیلی فکر اور جذبے کی ہم آمیزی کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی اور یہی دونوں تغزل کی جان ہیں۔ اقبال کی نظموں میں تخیلی فکر اور جذبہ کی شدت اس طرح گھل مل گئی ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے مسجد قرطبہ کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے اقبال کی اپنے موضوع سے جذباتی وابستگی بھی ان کی نظموں میں تغزل کے اشعار پیدا کر دیتی ہے۔ دراصل اقبال کا مزاج غزل کا مزاج ہے وہ اپنے موضوع سے عشق و جنون کی حد تک لگاؤ رکھتے ہیں۔ اور جذبہ کی بے پناہ قوت ان کے کلام میں رمزی اور ایمائی کیفیت پیدا کر دیتی ہے کیونکہ جذبہ کا مکمل اظہار ممکن نہیں۔ تغزل کی یہ شان کم و بیش ان کی ہر اہم نظم میں پیدا ہو گئی ہے۔ اور مسجد قرطبہ میں تو غزل اور نظم کی خوبیاں کچھ اس طرح یکجا ہو گئی ہیں کہ ان کو علیحدہ کرنا ذوق سلیم پر ناگوار گزرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی اس نشانی کے ساتھ شدید جذباتی لگاؤ ہے۔ اس نظم کے ہر بند کو اگر غزل کا ایک شعر قرار دیا جائے تو یہ نظم آٹھ شعروں پر مشتمل ایک دلکش غزل کہی جا سکتی ہے۔

(۳)

مسجد قرطبہ سے پہلے بانگ درا کی نظموں میں فکر، جذبے اور تخیل کی آمیزش یکساں نہیں ہے۔ وہاں کبھی جذبے کی سطح بلند ہو جاتی ہے تو کبھی فکر کی اور بعض اوقات یہ دونوں تخیل کی بلندی کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ شکوہ میں شاعر پر شدید جذباتی کیفیت

طاری ہے تو خضر راہ میں فکر کا غلبہ ہے اور شمع و شاعر میں تخیل ان دونوں پر حاوی ہے۔ والدہ مرحومہ کی یاد میں یہ تینوں کیفیتیں الگ الگ بندوں میں ہیں لیکن "مسجد قرطبہ" میں یہ تینوں کیفیتیں ایک سطح پر ہیں اور ایک دوسرے سے اس طرح بغل گیر ہیں کہ ان کو الگ الگ کرنا ناممکن ہے۔ یہی توازن قاری کے دل اور دماغ کو بیک وقت متاثر کرتا ہے اور نظم کو عظیم بناتا ہے۔ اقبال اس سے پہلے وقتی موضوعات پر لکھتے رہے ہیں اور آفاقی مسائل کو بھی وقتی موضوعات کے آئینے میں دیکھتے رہے ہیں۔ لیکن اس نظم میں وہ ایسے مقام پر آپہونچے ہیں جہاں سے ان کی نظر آفاقی مسائل پر پڑتی ہے۔ چنانچہ وہ ان ہی مسائل کو چھیڑتے ہیں جن کا تعلق انسانیت کے عالمگیر اصولوں سے ہے وہ زمانے کی ماہیت پر اور پھر ماضی کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ وہ جذبہ عشق کو بیدار کرتے ہیں اور اس کی عظمت کا نقش ہمارے دل پر بٹھا دیتے ہیں۔ تہذیبی زندگی سے ادبیات اور تعمیرات کے فن سے تعلق رکھتے ہیں۔ قومیں محض سیاسی زندگی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتیں بلکہ ان کی تہذیبی زندگی بھی ان کے لئے بقائے دوام حاصل کرتے میں ممد ثابت ہوتی ہے۔ پھر زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں جذبہ عشق کے بغیر کامیابی حاصل کی جا سکے اسی لئے عشق اس نظم کا خاص موضوع ہے۔

اقبال نے یہ نظم بحر مدید میں لکھی ہے یعنی (فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن) مد کے معنی کشش اور کھینچاؤ کے ہیں۔ اس بحر میں لہر کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ علامہ نے اس نظم میں مد و جزر کی یہ حالت پیدا کر کے نظم کو دلکش بنا دیا ہے پھر جس طرح بحر دو ٹکڑوں میں منقسم ہے اسی طرح انھوں نے نظم کے ہر مصرعہ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اپنے فنی کمال کا ثبوت دیا ہے مثلاً مندرجہ ذیل شروع کے اشعار ہی دیکھئے ہر مصرعہ دو حصوں میں تقسیم

ہو گیا ہے۔

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات

سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات

سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ

جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

اسی طرح تمام نظم کو درمیان میں ایک لائن لگا کر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ نظم کی ایک خوبی یہ ہے کہ نظم کے ہر بند کا آخری شعر آنے والے بند کے پہلے شعر سے مربوط ہے۔ اور اس طرح ایک بند سے دوسرے بند کی طرف جاتے ہوئے کوئی ذہنی خلا محسوس نہیں ہوتا۔ مثلاً پہلے بند کا آخری شعر ہے۔

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

اس بتایا گیا ہے ہر چیز فنا ہونے والی ہے لیکن کچھ نقوش ایسے بھی ہیں جن تک فنا کا ہاتھ نہیں پہونچ سکتا۔ دوسرے بند کا پہلا شعر ہمیں ان نقوش کے بنانے والے کا پتہ دیتا ہے۔

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام

اور مرد خدا کا یہ عمل چونکہ عشق سے صاحب فروز ہے اس لئے ناقابل فنا ہے چنانچہ دوسرے بند میں عشق کی اہمیت کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔ اور تیسرا بند ہمیں بتاتا ہے کہ حرم قرطبہ بھی عشق کی وجہ سے ناقابل فنا ہے۔ اسی طرح ہر بند دوسرے بند سے اس طرح پیوستہ ہے کہ کہیں بھی خلا نظر نہیں آتا۔ مناظر فطرت کا یہ بیان نہایت حسین ہے۔ اور قاری کے لیے تمام منظر کا کام بھی دیتا ہے۔ لیکن کچھ یہاں بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے یوں

معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں بند کے خاتمے پر شاعر اپنا ذہنی سفر ختم کر چکا ہے اور یہ کہہ کر کہ

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا   گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

وہ اپنا اصلی کام ختم کر چکتا ہے لیکن اس کی مناظر فطرت سے دلبستگی اور یہ خیال کہ اس کا بیان واضح نہیں ہو سکا ہے ایک اور بند لکھنے پر مجبور کرتا ہے جو ہمارے خیال میں نظم کا لازمی جز نہیں ہے۔ پھر ساری نظم میں زندگی کو مخاطب نہ کر سکے تھے اور اس بند میں اس کے ذکر کا موقع بھی پیدا ہو گیا تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو نظم کا ارتقا ساتویں بند پر ختم ہو جاتا ہے۔ ساری نظم میں ایک اور موقع ایسا ہے۔ جہاں یہ محسوس ہوتا ہے کہ نظم مربوط نہیں رہی۔ اور یہ موقع پہلے بند میں پانچویں شعر کے بعد آتا ہے۔ پہلے بند کا چھٹا شعر ساتویں اور پانچویں شعر سے اور باقی پورے بند سے الگ نظر آتا ہے۔ سارے بند میں زمان مسلسل کا ذکر ہے پانچویں اور ساتویں اور پھر آٹھویں شعر میں زمانے کے اثرات کا ذکر ہے۔ لیکن چھٹا شعر زمان حقیقی کے بیان میں ہے اور یہ تسلسل پر بری طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ مگر ان خامیوں کی وجہ سے نظم کی اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور اسے ہم اقبال کی ایک لافانی نظم کہہ سکتے ہیں۔

ساقی نامہ

شراب کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا
مری خاک جگنو بنا کر اڑا

ساقی نامہ اقبال کی اہم ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ بال جبریل کی نظموں میں سے تین نظمیں فن اور موضوع کے لحاظ سے سب سے عمدہ ہیں یعنی مسجد قرطبہ ساقی نامہ اور مسجد قرطبہ ذوق و شوق سے بلند تر درجہ کی حامل ہیں مگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو بہتر قرار دینا ممکن نظر نہیں حالانکہ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے ایک دوسری سے بہت مختلف ہے مسجد قرطبہ میں مسجد کے حوالے سے زمانہ عشق مرد مومن اور فنون لطیفہ کے متعلق علامہ اقبال کے نظریات ملتے ہیں تو ساقی نامہ میں زندگی اور خودی کے دو بڑے موضوع بیان ہوئے ہیں۔ مسجد قرطبہ کا اسلوب بڑا دقیق ہے، اس میں جلال، جمال پر غالب ہے! ور ساقی نامہ کا اسلوب بڑا سادہ اور آسان ہے یعنی یہاں جمال، جلال پر غالب ہے! ور ساقی نامہ کا اسلوب بڑا سادہ اور آسان ہے، یعنی یہاں جمال جلال سے

زیادہ ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ساقی نامہ کو مسجد قرطبہ پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ فلسفیانہ افکار کو آسان اور سادہ زبان میں پیش کرنا بہت زیادہ مشکل ہے اقبال نے اس نظم میں اس مشکل کو آسان کر دیا ہے۔ ساقی نامہ پڑھ کر اس بات کا پختہ یقین ہو جاتا ہے کہ اقبال کو الفاظ کے ماہرانہ استعمال پر پوری قدرت حاصل ہے۔ اور وہ فن کے اسرار ورموز سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ مسجد قرطبہ کا اسلوب فارسی آمیز ہے اور یہ اسلوب ان کی نظموں کا عام رنگ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں وہ اپنی بہترین صورت میں ملتا ہے مگر ساقی نامہ کا اسلوب ان کے عام رنگ سے مختلف ہے یہاں آسان اور سادہ الفاظ سے فن کا جادو جگایا گیا ہے (یعنی فعولن، فعولن، فعولن، فعل)، یہ بحر بڑی رواں اور چلتی ہوئی ہے۔ چنانچہ میر حسن کی مثنوی میں بیان کا جو جادو پایا جاتا ہے۔ وہی ساقی نامہ کی بھی خصوصیت ہے۔ ایک ممتاز نقاد نے یہ خیال ظاہر کیا ہے۔ کہ مثنوی میں چونکہ ہر شعر میں قافیہ اور ردیف بدل جاتے ہیں۔ اس لئے یہ ایک مشکل صنف سخن ہے اور اقبال کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ایک مشکل صنف میں اپنے فلسفیانہ افکار بیان کیے ہیں۔ مجھے ان سے اس بات میں اختلاف ہے میرا خیال یہ ہے کہ مثنوی دوسری اصناف کی نسبت آسان ہے اور اس کی یہی وجہ ہے کہ یہاں قافیہ اور ردیف بدل جاتے ہیں اس لئے یہ ایک مشکل صنف سخن ہے۔ اور اقبال کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ایک مشکل صنف میں اپنے فلسفیانہ افکار بیان کئے ہیں۔ مجھے ان سے اس بات میں اختلاف ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ مثنوی دوسری اصناف کی نسبت آسان ہے اور اس کی یہی وجہ ہے کہ یہاں قافیہ اور ردیف ہر شعر کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اور شاعر کیلئے آزادی مہیا کرتے ہیں کہ وہ اپنے خیال کو مختلف قافیوں کی مدد سے آگے بڑھائے۔ بہت سے

اشعار میں ایک ہی قافیہ یا ردیف کا استعمال اس صنف کو مشکل بنا دیتا ہے۔ اس لحاظ سے قصیدہ بہت مشکل ہے۔ کیونکہ قافیہ کی تلاش اور مخصوص الفاظ میں ہی خیال کی ادائیگی شاعر کو مشکل پسندی کی طرف لے جاتے ہیں۔ چنانچہ مسجد قرطبہ میں اقبال کیلئے یہ دقت تھی کہ آٹھ اشعار میں ان کو ایک ہی قافیہ اور ردیف استعمال کرنا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کہ خضر راہ اور طلوع اسلام کی طرح یہاں بھی مشکل اور فارسی آمیز زبان اختیار کی ہے۔ ساقی نامہ میں اگر وہ مثنوی کی ہیئت استعمال نہ کرتے تو شاید وہ اس قدر آسان اسلوب اختیار نہ کر سکتے مگر مثنوی کی یہ آسانی اقبال کی عظمت کو کسی طرح کم نہیں کرتی۔ ان کے سامنے میر حسن سے زیادہ مشکل کام تھا۔ میر حسن کا انداز بیان بلا شبہ سادہ آسان اور دلکش ہے مگر ان کا موضوع ایک داستان تھی۔ اقبال کے سامنے زندگی اور خودی کے فلسفیانہ حقائق تھے مگر انھوں نے ان دقیق مسائل کو بھی میر حسن کے سے سادہ اور دلکش اسلوب میں بیان کر دیا ہے یہ اقبال کے فن کا اعجاز ہے کہ وہ آسان اور مشکل اسلوب پر یکساں قادر ہیں۔ اور موضوع، بحر اور موقع و محل کے مطابق اس کو بدل سکتے ہیں۔ اقبال نے ساقی نامہ لکھ کر ان لوگوں کے لئے مثال پیدا کر دی ہے جو کہتے ہیں کہ فلسفیانہ افکار کو آسان زبان میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کا اسلوب سادہ ہی نہیں بلکہ شاعرانہ بھی ہے ان کی اس نظم میں شعریت ہر جگہ موجود ہے اور خوبصورت تشبیہات اور دلکش استعارات کی یہاں کمی نہیں۔ چند تراکیب ملاحظہ فرمائیں جن میں تشبیہوں اور استعاروں کی جدت و ندرت قابل داد ہے۔

غزالان افکار کا مرغزار، گمانوں کا لشکر، عشق کی آگ، ہنگامہ رنگ و شوق، تنجاع چشم و گوش، طلسم زمان و مکاں، شوخی فکر و کردار، فاتح عالم، خوب و زشت، شمع نفس

جامۂ حرف تنگ، حقیقت آئینہ اور گفتار زنگ، نقش حیات، عناصر کے پھندے، صحبت آب و گل، پردۂ رنگ، صحبت آب و گل، بت خانۂ شش جہات، کاروان وجود، رگ سنگ میں لہو کی گردش، شہید ازل لالۂ خونیں کفن، کاروان بہار کا ارم بن جانا، خودی کا نشیمن اس طرح دل میں ہونا جیسے آسمان آنکھ کے تل میں، ساقی لالہ فام، زندگی کا موت کی گھات میں ہونا، جہان مکافات وغیرہ وغیرہ۔

مسجد قرطبہ کا اسلوب بوجھل اور دقیق ہے۔ اس لئے اس میں ٹھہراؤ ہے اسکی رفتار آہستہ ہے۔ چنانچہ ہم اس کو رک رک پڑھتے ہیں۔ اور بڑھ بڑھ کر رکتے ہیں مگر ساقی نامہ اس سے مختلف ہے۔ اس کی روانی اور تیزی ہمیں کہیں ٹھہرنے نہیں دیتی اور ہم تیزی سے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ مسجد قرطبہ ایک آہستہ خرام دریا کی طرح ہے جو میدانوں میں بہتا ہے مگر ساقی نامہ جوئے کہستاں کی طرح تیز رو ہے۔ اور اس میں بلا کی تیزی اور روانی ہے۔ ساقی نامہ کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔ دیکھئے ہماری رفتار آہستہ آہستہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔

ہوا خیمہ زن کاروان بہار	ارم بن گیا دامن کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن	شہید ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں	لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں
فضا نیلی نیلی ہوائیں سرور	ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی!	اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی!
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ	پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

اس نظم کے سات بند ہیں اور مسجد قرطبہ کے برعکس ہر بند میں شعروں کی تعداد

مختلف ہے ساقی نامہ کے بند مسجد قرطبہ کے بندوں سے زیادہ طویل ہیں۔ اس نظم کا نام "ساقی نامہ" اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس میں ساقی ازل یعنی خدا سے خطاب کیا گیا ہے۔

خدا کو ساقی قرار دینا اردو شاعری کی روایت بھی ہے مگر اقبال کا انداز اور خیالات یکسر جدید ہیں۔ چونکہ بہار کے موسم میں شراب کا لطف زیادہ آتا ہے اور ساقی کی ضرورت بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے اقبال نے نظم کا آغاز موسم بہار کی منظر نگاری سے کیا ہے۔ بہار کا یہ منظر کسی پہاڑی مقام کی یاد دلاتا ہے۔ اقبال کو شہر کی نسبت دست وکہسار کے نظارے زیادہ پسند ہیں۔ انھوں نے جاوید نامہ میں اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ شہروں میں عشق کا شعلہ سرد پڑ جاتا ہے۔ اس کی نشو ونما اور پرورش صحرا و دریا یا دشت و کوہسار میں ہوتی ہے۔ حضرت خضر نے اپنی صحرانوردی کی وجہ یہی بتائی ہے۔ اور ان اور تین والی مشہور غزل کے شروع میں بھی صحرائی بہار کا منظر ہے۔ ساقی نامہ کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔ پہلا ہی شعر ہمیں دامن کہسار میں لے جاتا ہے۔

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار! ارم بن گیا دامنِ کوہسار!
گل و نرگس و سوسن و نسترن شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
فضا نیلی نیلی ہوائیں سرور ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور!

ندی کا رواں پانی ان کے لئے ہمیشہ کشش کا باعث رہا ہے کیونکہ یہ مسلسل عمل کی علامت ہے اس لئے زندگی کو وہ ندی ہی سے تشبیہ دیتے ہیں بانگ درا اور

فلسفہ غم میں بھی زندگی کی ندی کی تشبیہہ سے ہی وضاحت کی گئی ہے چنانچہ ساقی نامہ میں بھی ندی کا ذکر موجود ہے۔ خضر راہ، مسجد قرطبہ اور جاوید نامہ میں دریا کا منظر ہے اور یہاں پہاڑی ندی کی روانی دکھائی گئی ہے۔ کیونکہ یہ زندگی کا پیغام سناتی ہے۔

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی — اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی — بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی!
ذرا دیکھ اے ساقی لالہ فام — سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

بہار کا موسم ہے اور خوبصورت مقام ہے۔ چنانچہ شراب پینے اور پلانے کا موزوں ترین وقت بھی ہے۔ اس لئے شاعر ساقی لالہ فام سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اسے شراب پلا دے۔ مگر یہ شراب وہ نہیں جو غالب پر بے خودی طاری کرتی ہے اور زندگی کے آلام سے نجات دیتی ہے۔ بلکہ یہ شراب نشاط آور ہے اور اس سے ضمیر حیات روشن ہو جاتا ہے اور ازل کے راز منکشف ہو جاتے ہیں یہ وہ شراب ہے جو ممولے کو شاہباز سے لڑنے کے قابل بناتی ہے۔

پلا دے مجھے وہ مے پردہ سوز — کہ آتی نہیں فصل گل روز روز!
وہ مے جس سے روشن ضمیر حیات — وہ مے جس سے ہے مستی کائنات
وہ مے جس میں ہے سوز و ساز ازل — وہ مے جس سے کھلتا ہے راز ازل
اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے — لڑا دے ممولے کو شہباز سے

یہاں پہلا بند ختم ہو جاتا ہے کیونکہ آئندہ بندوں میں اقبال ممولے کو شاہباز سے لڑانے والے نسخے کو بیان کرنے والے ہیں۔ وہ راز ازل پر سے پردہ اٹھا کر زندگی کی

لہ غالب کہتے ہیں۔ مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو؛ اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

زمانہ کی حقیقت بیان کریں گے مگر اس سے پہلے وہ موجودہ زمانے کے حالات پر اشاراتی انداز پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ تاکہ پتہ چل جائے کہ اس وقت دنیا کی حالت کیا ہے اور مسلمان کس صورت حال سے دوچار ہے اس اعتبار سے یہ بند مسجد قرطبہ کے اس بند سے ملتا جلتا ہے جس میں واقعات عالم پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ وہاں انھوں نے انقلاب فرانس، لوتھر کی اصلاح، دین کی تحریک اور ملت رومی نژاد لذت تجدید کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ساقی نامہ میں گراں خواب چینیوں کے سنبھلنے اور سرمایہ داری کے خاتمہ کا ذکر ہے انھوں نے خضر راہ کی طرح یہاں بھی میر و سلطان سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ مسجد قرطبہ میں انھوں نے چہرۂ افکار سے پردہ اٹھا دیا تو فرنگی اس منظر کی تاب نہ لا سکے گا۔ مگر ساقی نامہ میں وہ اعلان کرتے ہیں کہ فرنگیوں کا راز فاش ہو گیا۔ مگر خود فرنگی حیران ہے کہ دنیا اس کی حکمت عملیوں سے کس طرح واقف ہو گئی۔ فرنگیوں کی اس ذلت اور سرمایہ داری کے خاتمے پر اقبال بے حد خوش ہیں۔ ذیل میں دیئے گئے اشعار کے ہر لفظ سے خوشی اور مسرت پھوٹ رہی ہے۔

زمانے کے انداز بدلے گئے	نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش راز فرنگ	کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے	زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا	تماشہ دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے	ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

مگر اسی خوشی میں ایک غم کا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان کا دل ابھی تک

ا؎ پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

زنار پوش ہے اور وہ خرافات میں کھویا ہوا ہے۔ اس کی شریعت، اس کا تمدن اور اس کا تصوف سب عجمی اثرات کے تحت کھو چکے ہیں۔ خطیب کی تقریر منطق اور لغت کے بکھیڑوں میں الجھی ہوئی ہے مگر لذتِ شوق اس میں نہیں پائی جاتی۔ مسلمانوں کی پستی کا سبب یہ ہے کہ ان کے سینے میں عشق کی آگ بجھ چکی ہے اور اب وہ آرزو جستجو سے محروم ہو کر راکھ کا ڈھیر بن گئے ہیں ؎

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش | مگر دل ابھی تک زنار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام | بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی | یہ امت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب | مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد | محبت میں یکتا، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا | یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے | مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

مسلمانوں کی ناگفتہ حالت بیان کرنے کے بعد اقبال تیسرے بند میں پھر ساقی ازل سے پہلے بند کی طرح براہِ راست مخاطب ہوتے ہیں۔ پہلے وہ اپنے لئے دعا مانگتے ہیں کہ ان کو عشق کے لگا کر اڑا دے اور پھر یہی چاہتے ہیں کہ یہی عشق کی آگ تمام مسلمانوں کے سینے میں روشن ہو جائے۔

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے | میرا عشق میری نظر بخش دے

اگلے دو بندوں (یعنی چوتھے اور پانچویں میں) وہ زندگی کی حقیقت اور اس کی قوتِ پنہاں کو بیان کرتے ہیں انھوں نے خضرِ راہ میں حضرت خضر کی زبان سے بھی زندگی

کی حقیقت بیان کی تھی۔ مگر ایک تو یہاں ان کا اسلوب زیادہ آسان ہے اور دوسرے یہاں زندگی میں پنہاں بے پناہ قوت کا ذکر کیا گیا ہے زندگی کی حقیقت انھوں نے اس لئے بیان کی ہے تاکہ وہ مسلمانوں کو بتا سکیں کہ زندگی وہ نہیں جو وہ گزار رہے زندگی سکون و ثبات نہیں بلکہ ذوق پرواز ہے۔ وہ قیام و مقام کی بجائے سفر کی پسند کرتی ہے۔ یہ مشکلات سے ڈرتی نہیں بلکہ ذوق پرواز ہے وہ قیام کی بجائے سفر کی پسند کرتی ہے یہ مشکلات سے ڈرتی نہیں بلکہ ان سے الجھ کر ان کو سلجھانا چاہتی ہے مسلسل عمل کی وجہ سے زندگی میں اتنی قوت آجاتی ہے کہ موت سے ڈرتی نہیں بلکہ اس کی گھات میں رہتی ہے ساتھ ہی انھوں نے اس راز سے پردہ بھی اٹھایا ہے کہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ لافانی ہے۔

فریب نظر ہے سکون و ثبات تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی! فقط ذوق پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے
ہوا جب اسے موت کا سامنا کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اتر کر جہان مکافات میں ہی زندگی موت کے گھات میں
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقش حیات

زندگی کے لافانی ہونے کا ذکر "والدہ مرحومہ کی یاد میں" میں بھی موجود ہے:

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے ذوق حفظ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقش حیات عام اس کو یوں نہ کر دیتا نظام کائنات

ہے اگر ارزاں تو یوں سمجھو اجل کچھ بھی نہیں   جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

آہ غافل موت کا راز نہاں کچھ اور ہے   نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے

چنانچہ موت سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ موت کا ڈر نہ رہے تو انسان بہت سی ذلتوں سے محفوظ رہتا ہے اگر اسے یہ یقین ہو جائے کہ یہی زندگی نہیں ہے بلکہ اس دنیا کے بعد بھی انسان زندہ ہوگا اور اسے سزا اور جزا کا سامنا کرنا پڑے گا تو وہ برے کاموں سے بچا رہتا ہے اور نان حرام سے پرہیز کرتا ہے۔ جب مسلمان موت سے خوفزدہ نہ تھے اور آئندہ کی زندگی پر انھیں پختہ یقین تھا۔ تو ان کی قلیل تعداد نے اپنے سے کئی گنا بڑے لشکر دیا کو آشنا کر دیا تھا۔ اقبال چاہتے ہیں کہ مسلمان پھر اس حقیقت کو جان لیں اور دنیا میں بلند مقام حاصل کرنے کے اہل ہو جائیں زندگی کی حقیقت بیان کرنے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اس کا اور خودی کا تعلق یوں بیان کیا ہے ؎ جوہر زندگی ہے عشق، جوہر عشق ہے خودی۔

اور ساقی نامہ میں زندگی اور خودی کے تعلق کو ایک خوبصورت تشبیہ سے واضح کر دیا ہے

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے   خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

زندگی ایک تلوار کی مانند ہے اور خودی اس کی دھار ہے جب تک تلوار نہ ہو دھار کا وجود ناممکن ہے۔ اور اگر تلوار کی دھار نہ ہو تو اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں جتنی ہی دھار اچھی ہوگی اتنی ہی تلوار اچھی ہوگی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ زندگی کو حرکت پسند ہے اور وہ حضر کی بجائے سفر میں رہنا چاہتی ہے اسی طرح خودی کا انجام و آغاز بھی سفر ہی ہے۔

سفر اس کا انجام و آغاز ہے   یہی اس کی تقویم کا راز ہے

زندگی میں بے انتہا تیزی پائی جاتی ہے ازل سے ابد تک فاصلہ ایک لمحہ میں طے کر لیتی ہے

بڑی تیز جولاں بڑی زود رس   ازل سے ابد تک رم یک نفس

اسی طرح خودی میں بھی یہی تیزی اور وسعت موجود ہے۔

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

زندگی میں بڑی قوت ہے پہاڑوں کی طاقت کا یہی راز ہے اور جبریل دحور اس کے پھندے میں گرفتار ہیں۔ اس کی طاقت کی کوئی حد نہیں۔

کہیں اسکی طاقت سے کہسار چور
کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور

اسی طرح خودی میں بے انتہا طاقت پائی جاتی ہے۔

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگ رواں

زندگی اور خودی پائی بھی ایک ہی جگہ جاتی ہیں۔ جہاں زندگی ہے وہاں خودی ہے یوں بھی جب زندگی تلوار ہے اور خودی اس کی دھار ہے تو دونوں کا ایک جگہ موجود ہونا ایک لازمی امر ہے انسانوں کے علاوہ اور چیزوں میں بھی زندگی موجود ہے۔ چاند تارے اور سونے چاندی میں بھی زندگی ہی کی تجلی پائی جاتی ہے یہ ہر جگہ موجود ہے مگر اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی کیونکہ یہ ہر جگہ مختلف رنگوں میں موجود ہے۔

یہ ثابت بھی ہے اور سیار ہے
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر

یہ عالم یہ بت خانۂ شش جہات
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے
یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے

اسی کے بیاباں، اسی کے ببول
اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول

اسی طرح خودی بھی ہر جگہ موجود ہے۔ چاند کی کرن اور پتھر کا شرر سب خودی کی

بدولت ہی ہیں یہ ترقی کرتے کرتے آخر کار آدم کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ خودی اور زندگی دونوں ارتقائی منازل طے کرتی ہیں۔

کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں | یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں
اسے واسطہ کیا کم و بیش سے | نشیب و فراز و پس و پیش سے
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر | ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی علامہ اقبال کا بڑا محبوب موضوع ہے اور انھوں نے اس کی وضاحت بڑی تفصیل سے خاص طور پر اپنی مثنوی اسرار و رموز میں اور عام طور پر دوسری تصانیف میں کی ہے البتہ اسرار و رموز کے علاوہ کوئی نظم ایسی نہیں جس میں اتنی تفصیل سے خودی کا ذکر ہو جتنا کہ ساقی نامہ میں ہے۔ ساقی نامہ کو اسرار و رموز پر یہ فضیلت ہے کہ وہ شاعری کے اعلیٰ درجہ پر ہے جب کہ اسرار و رموز میں شعریت کم ہے۔ چنانچہ شاعرانہ اعتبار سے اسرار و رموز کا سلسلہ ساقی نامہ سے کم تر ہے مگر معلومات کے لحاظ سے اسرار و رموز کا درجہ بہت بلند ہے۔ ساقی نامہ میں خودی کی حقیقت کو اتنے دلپذیر انداز اور شاعرانہ تشبیہوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ چنانچہ جب وہ بیان کرتے ہیں کہ خودی جو کہ اتنی طاقت ور اور وسیع ہے اس کا مسکن انسان کا دل ہے تو خیال ہوتا ہے کہ اتنی بے پایاں اور بے اندازہ قوت کا مالک خودی کا نشیمن انسان کا چھوٹا سا دل کیونکر ہو سکتا ہے[۲] تو وہ ہماری اس مشکل کو ایک چھوٹی سی مثال سے واضح کر دیتے ہیں اور ہم مان جاتے ہیں کہ ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

---

[۱] ملاحظہ ہو فلسفہ خودی اور بیخودی [۲] دل کی حقیقت بھی بڑی گہری ہے امام غزالی نے روح انسانی کو دل کا نام دیا ہے۔ دل گوشت کا لوتھڑا نہیں ہے جو جسم کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے بلکہ یہ ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے اقبال کا خیال بھی ایسا ہی ہے چنانچہ وہ ایک شعر میں کہتے ہیں کہ موت سے ڈرنا نہیں چاہئے اگر دم چلا گیا ہے تو فکر نہیں

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے   فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

آنکھ کا تل ایک چھوٹی سی چیز ہے مگر اس میں آسمان کی وسعتیں سما جاتی ہیں اسی طرح زندگی کا مقام بھی دل ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ اقبال نے اپنی ایک مشہور غزل میں کہا ہے:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی   تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

اپنے دل کو پہچاننے کا مطلب یہ ہے کہ انسان خودی کا عرفان حاصل کر گیا اور خودی کے عرفان سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے اسی لئے علامہ اقبال نے آپ کو پہچاننے پر اتنا زور دیا ہے۔ عربی کے اس مقولہ میں بھی اسی صداقت کا اظہار کیا گیا ہے "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" جس نے اپنے آپ کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچانا۔

ساقی نامہ کے دو بندوں میں اگرچہ فلسفۂ خودی کا پورا بیان ممکن نہ تھا۔ مگر انھوں نے اس کے ضروری اجزا کا ذکر کر دیا ہے۔ خودی کا استحکام عمل پیہم ہے اس کو انھوں نے خودی کے سفر کا نام دیا ہے۔ اپنے عمل مسلسل کے ذریعہ انسان خودی کو اتنا بلند کر سکتا ہے کہ وہ اس عالم رنگ و صوت اور بت خانہ شش جہات کی وسعتوں کو پھلانگ جائے۔ گردش روزگار اور مصائب و مشکلات خودی کی تعمیر میں مددگار ہیں۔ شر کے بغیر خودی کی تکمیل ناممکن۔ اسی لئے آدم کو جنت کی بجائے اس دنیا کا مکین بنایا گیا تھا۔

(باقی صفحہ ۳۵۶ کا) کیونکہ دل تو باقی ہے:

مخور اے کم نظر اندیشۂ مرگ   دم رفت، دل باقی ست، غم نیست

لہ کیمیائے سعادت میں امام غزالی نے بھی اس مقولے پر اپنے فلسفے کی بنیاد رکھی ہے۔ امام غزالی اور اقبال کے افکار میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ چونکہ اس کے بیان کا یہ موقعہ نہیں۔ اس لئے ہم اسے کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکے جس طرح باد مخالف شاہین کے راستے کی رکاوٹ بننے کی بجائے اسے اور اونچا اڑاتی ہے یا جس طرح ندی کے سامنے بند باندھ دیا جائے تو وہ اور چڑھ جاتی ہے اسی طرح خودی بھی مشکلات سے اور بلند ہوتی ہے اور ان کو تسخیر کر لیتی ہے حتیٰ کہ ساری خدائی پر چھا جاتی ہے۔

بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر　　طلسم زمان و مکاں توڑ کر!
خودی شیر مولا جہاں اس کا صید　　زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود!　　کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا　　تری شوخیٔ فکر و کردار کا!
یہ ہے مقصد گردش روزگار　　کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار
تو ہے فاتح عالم خوب و زشت　　تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت

خودی کی طاقتوں کو بیان کرتے کرتے ان کو احساس ہوتا ہے کہ اگر اس سے آگے بڑھے تو شاید عام آدمی اس کو برداشت نہ کر سکیں اور اس حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کی ان میں سکت نہ ہو چنانچہ بڑے موثر انداز میں اپنا بیان یوں ختم کرتے ہیں۔

فروزاں ہے سینے میں شمع نفس　　مگر تاب گفتار کہتی ہے بس!
اگر یک سر موئے برتر پرم!　　فروغ تجلی بسوزد پرم!

اور یہیں نظم ختم ہو جاتی ہے۔ نظم کا خاتمہ بڑا فطری ہے۔ جونہی تاب گفتار ان کو بس کہتی ہے وہ قلم ہاتھ سے رکھ دیتے ہیں۔ علامہ اقبال نے خودی کے استحکام کے لئے ضرر رساں ہے وہ رزق حرام ہے جو خودی کی موت کا باعث ہے۔ اس سے پرہیز لازم ہے۔

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب ۔۔۔ وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب

ان کا ایک اور مشہور شعر ہے

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی ۔۔۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دوسری چیز جو خودی کی قاتل ہے وہ غلامی ہے جو انسان کو لا الہ کا منکر بناتی ہے اور کئی خداؤں کی تخلیق کا باعث ہے اور جس سے تن اور من دونوں کی دولت جاتی رہتی ہے ۔ اور ایک خدا کو نیک نیتی سے سجدہ کیا جائے تو بے شمار خداؤں سے نجات مل جاتی ہے ۔

وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام ۔۔۔ کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

خودی آزادانہ فضاؤں میں پرورش پاتی ہے اور بڑھتی ہے ۔ غلامی خوف اور مایوسی کی ماں جو خودی کے دشمن ہیں ۔

ساقی نامہ کے اس مختصر سے جائزے سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ یہ نظم نہ صرف شاعرانہ اعتبار سے بہت بلند ہے بلکہ افکارِ اقبال کے مطالعہ کے سلسلے میں بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔

زبانِ خلق

اس عنوان کے تحت ہم مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے اہم افراد کی رائے علامہ اقبال کے متعلق درج کر رہے ہیں تاکہ ان کی عظمت و اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

"اگر میں ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم ہوتے دیکھنے کے لئے زندہ رہوں اور اس وقت مجھ سے کہا جائے کہ تم اقبال کی تصنیفات یا اسلامی ریاست کے حاکم اعلیٰ بننے میں سے ایک چیز کا انتخاب کرو تو میں اول الذکر کا انتخاب کروں گا۔"

(قائد اعظم محمد علی جناح)

سر محمد اقبال کی موت نے ہماری ادبیات میں ایک ایسا خلا پیدا کر دیا ہے جو ایک مہلک زخم سے مشابہت رکھتا ہے اور جس کے پُر ہونے کے لئے لمبی مدت درکار ہے۔

(ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور)

"ان کی ذہانت اور ہندوستان کی آزادی سے محبت نے مجھے بہت متاثر کیا، ان کی موت سے ہندوستان ایک چمکدار اور تابندہ ستارے سے محروم ہو گیا ہے لیکن ان کی عظیم نظمیں آنے والی نسلوں کے دلوں میں ان کی یاد تازہ رکھیں گی اور انھیں فیض پہونچاتی رہیں گی۔

جواہر لال نہرو (THE POET OF THE EAST)

"اگرچہ اقبال میرے شاگرد ہیں مگر میں ان کی تحریروں سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہوں۔"
پروفیسر آرنلڈ۔ (اقبال از عطیہ)

"عہد حاضر کے ہندوستانی شعرا میں اقبال ایک نہایت رفیع درجہ رکھتے ہیں۔"
(ڈاکٹر نکلسن دی یونٹ آف دی ایسٹ)

"سر محمد اقبال اپنے زبردست علم و فضل اور وسیع مطالعہ و تحقیق کے باوجود ہرگز دوسروں کے خیالات کی بازگشت نہیں بلکہ امتیازی طور پر ایک اوریجنل مفکر اور مجتہد ہیں۔"
(مسٹر ٹامس آرنلڈ)

"وہائٹ مین (WHITEMAN) کا نصب العین اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ نظری نہیں بلکہ عملی ہے۔ صرف ایک ایسا شاعر ہے جس کے ہاں یہ چیز نظر آتی ہے اور وہ بھی ہماری نسل اور قوم سے نہیں۔ میری مراد محمد اقبال سے ہے۔ جن کی نظم اسرار خودی کا ترجمہ ڈاکٹر نکلسن نے کیا ہے! درمیکملن کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ ادھر ہمارے ملک کے شاعر تو کیگمی کے زمانہ کی پرانی ڈگر پر چلے جارہے ہیں اور ادھر لاہور میں ایک ایسی نظم شائع ہوئی ہے۔ جس نے ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں پر پوری طرح تسلط کر لیا ہے۔ ایک نوجوان مسلمان لکھتا ہے کہ اقبال اس عہد کا مسیح ہے۔ ایک نوجوان مسلمان لکھتا ہے کہ اقبال اس عہد کا مسیح ہے جس نے مردوں کو زندہ کر دیا ہے۔ تم پوچھو گے کہ اس میں کونسی ایسی ظاہری کشش ہے جس نے لوگوں کے دل اپنی طرف کھینچ لئے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معجزہ اس قسم کی ظاہری کشش کا مرہون منت نہیں جو مبلغوں اور دنیا کو نجات کا پیغام دینے والوں کے لئے مخصوص ہے۔ یہ اعجاز ایک نظم نے دکھایا ہے جس کے حسن و جمال کے آئینہ میں فلسفہ جدید کے اکثر پہلو منعکس نظر آتے ہیں۔ اس میں خیالات کی فراوانی ہے لیکن ان میں

اتحاد پایا جاتا ہے اور اس کی منطق کائنات کے لئے آوازِ غیب کا حکم رکھتی ہے۔

(ہربرٹ ریڈ)

میرے خیال میں اقبال کے ساتھ وہ لوگ بہت بے انصافی کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ محض اسلامی شاعر تھا۔ یہ کہنا اس کے دائرۂ اثر کو محدود کرتا ہے یہ ضرور ہے کہ اس نے اسلامی فلسفہ، اسلامی عظمت اور اسلامی تہذیب پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن کسی نے آج تک ملٹن کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ عیسائی مذہب کا شاعر تھا یا کالیداس کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ ہندو مذہب کا شاعر تھا، ان کے اثر کو محدود نہ کیا اور نہ اور مذہب کے لوگوں کے اس وجہ سے ان کی قدردانی میں کمی کی۔ (سرتیج بہادر سپرو)

اقبال کو جب پڑھتا ہوں تو خدا یاد آجاتا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو یا مولانا ابوالکلام کی نثر اس کے لئے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم۔

(سجاد انصاری)

اقبال ایسا ہے کہ اسے پڑھتے وقت کوئی اور نظر میں نہیں جچتا یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بس شاعری وہ ہیں۔ فکر اور شعر دونوں میں ہمہ گیر اور آفاقی۔

(فیض احمد فیض (افکار فیض نمبر)

میر غالب اور اقبال کا موازنہ حامد حسن قادری صاحب نے یوں کیا ہے۔

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے — جن کی فیضِ طبع نے اردو کو گنجِ زر دیا

اک اثر میں بڑھ گیا اک رفعتِ تخئیل میں — تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا

کائنات میں شاعری بس یہی دونوں کمال — تیسرے میں اسلئے دونوں کو یکجا کر دیا

وہ بیسویں صدی کے ہندوستان میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کا شاعر ہے اور اسلامی ہندوستان پر سب سے زیادہ پنجاب کے اس شرمیلے حیادار اور خلوت پسند بیرسٹر کا احسان مند ہے تمام اردو بولنے والے اس کے نام سے آشنا ہیں اور میں اس کا جاننے والا اور پرستار ہوں لیکن اگر اقبال سے میری اس محبت میں کوئی مجھ سے بڑھا ہوا ہے تو وہ میرا بھائی ہے جو اقبال کی شاعری سے اس قدر محبت کرتا ہے کہ اس کی تبلیغی تقریریں اقبال کی شاعری سے بھری ہوتی ہیں

(مولانا محمد علی جوہر)

(SLECTIONS FROM CAMRADE)

"میں اردو کا سب سے بڑا شاعر تو اقبال کو خیال کرتا ہوں لیکن اقبال شاعر کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کی کئی حیثیتیں ہیں اور اس کا مقام پوری اردو شاعری میں سب سے الگ ہے۔"

مالک رام (ہفت روزہ چٹان)

اقبال کی یہی خوبی ہے کہ اس کی بات سن کر آپ ناممکن کو بھی ممکن سمجھنے لگتے ہیں دل خوش ہوتا ہے، اپنی ہستی پر اعتبار آنے لگتا ہے۔ ہم توانا ہیں ہم اولوالعزم ہیں ہم ارادے مالک ہیں۔

جسٹس ایم آر کیانی (سنیدم شبے در کتب خانہ مق)

علامہ اقبال کی شخصیت جامع کمالات تھی۔ ان کی طبیعت میں جو ہمہ گیری تھی اس کی مثالیں تاریخ ادب میں کم ملتی ہیں

سید عبدالواحد (اقبال اور مغرب)

"ان کی شاعری اور فلسفہ دونوں عظیم ہیں۔" ایم ایم شریف

(IQBAL'S CONCEPTION OF GOD)

"بلادِ مشرق میں شاعری کو پیغمبری سے جو روایتی نسبت حاصل رہی ہے اس کا مظہر اتم ہندوستان میں یقیناً علامہ اقبال کی ذات گرامی صفات تھی۔"

پروفیسر حمید احمد خان (دیباچہ سیرت اقبال)

"حقیقت میں اقبال جس بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے وہ اس کا جائز حق ہے۔ اس کا پیغام فرزندان مشرق کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

مہاراجہ سر کشن پرشاد (خطبہ صدارت یوم اقبال ۱۹۳۸ء)

"علامہ شبلی مرحوم نے ۱۹۱۱ء میں دہلی میں اقبال کو ملک الشعراء کہا تھا۔

(سیرت اقبال از محمد طاہر فاروقی)

"کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اقبال ہم میں نہیں ہیں۔ جدید ہندوستان ان سے بڑا شاعر پیدا نہیں کر سکا۔ ان کی فارسی شاعری بھی جدید فارسی ادب میں اپنا مقام رکھتی ہے۔ ان کی موت صرف ہندوستان نہیں بلکہ پورے مشرق کا نقصان ہے۔

(ابوالکلام آزاد (THE POET OF THE EAST)

اقبال کو جو پاکستان کے لئے سرمایۂ افتخار ہے پورے عالم اسلام کا سرمایۂ افتخار سمجھا جاتا ہے بلکہ اس کا عظیم پیغام انسانی معاشروں کے لئے

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا سابق وائس چانسلر دانش گاہ ایران

(پیام بر حیات نو)

عصر حاضر خاصۂ اقبال گشت	واحدی کز صد ہزاران بر گذشت
شاعران گشتند جیشے تار و مار!	دیں مبارز کرد کار صد ہزار
ہیکلی گشت از سخن گوئی بپا	گفت "کل الصید فی جوف الفرا"

(ملک الشعرا بہار خراسانی)

(ترجمہ) موجودہ زمانہ خاص طور پر اقبال کا زمانہ ہے۔ اقبال تنہا لاکھوں سے بازی لے گیا۔ شاعر ایک پامال شدہ فوج کی مانند تھے، مگر اس جنگجو نے سینکڑوں سواروں کا کام کیا شاعری ایک ہیکل کی صورت میں نمودار ہوئی اور بولی (شاعروں کی تمام انواع و اقسام مجھ میں موجود ہیں۔)

ظاہراً طور پر علامہ اقبال کو پاکستان کے ایک فلسفی شاعر اور ماہر مند سخن ور کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کے حالات اور اس کے کلام کی طرف صحیح طور پر توجہ دی جائے۔ تو معلوم ہو گا کہ اقبال محض ایک مخصوص قوم یا ملک کا شاعر بلکہ عالمی شخصیت کا مالک اور عالم انسان کا رہنما ہے۔

(ڈاکٹر منوچہر اقبال چانسلر تہران یونیورسٹی (اقبال ایرانیوں کی نظر میں)

"دنیا کے سب سے کم سن مگر قدیم تمدن و علم کے حامل ملک پاکستان پر خورشید جیسا چہرہ جاہ و جلال سے چمک رہا ہے۔ آسمان پاک پر چمکنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی روشنی ایران پر ڈال رہا ہے اور یہ امر بالکل قدرتی ہے کیونکہ ایران پاکستان نزدیک اور دیوار بہ دیوار ہمارے ہیں اور آفتاب ہر دو گھروں کو ایک وقت میں روشنی دیتا ہے اس جہاں میں (روشنی) اور نور پھیلانے والا خورشید پاکستان کا عظیم الشان شاعر محمد اقبال ہے جو نو سو سال کے ہند و ایران کی فارسی روایات کا وارث ہے۔

پروفیسر سعید نفیسی (پاکستان ایرانیوں کی نظر میں، از خواجہ عبد الحمید عرفانی)

"ہم اٹلی میں ہر سال اقبال کا دن مناتے ہیں۔ ان مجلسوں میں اقبال کے اشعار پڑھے

جاتے ہیں اور اٹلی کے مشہور عالم اور دانشور اقبال پر تقریریں کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وٹیو سایئر نو سفیر اٹلی (اٹلی میں اقبال کا مطالعہ)

اقبال کے افکار و تاثرات کی گوناگونی اور بوقلمونی کی کوئی حد نہیں لیکن جس طرح کائنات کی کثرت میں ایک وحدت مضمر ہے اسی طرح اقبال کے افکار بھی اپنے اندر ایک وحدت نظر رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (فکر اقبال)

" اقبال کے کلام میں دنیا بھر کے تفکر کا ایسا امتزاج، ایسی ترکیب ہے جو شاید اس سے پہلے صرف دانتے نے قرون وسطی میں اور گوئٹے عصر حاضر میں حاصل کی۔

عزیز احمد (اقبال نئی تشکیل)۔

تنقیدی نقوش	ڈاکٹر عبدالقیوم	۵/-
دستِ صبا	فیض احمد فیض	۳/۵۰
حقوق القرآن	مولانا تھانوی	۵/۵۰
کلیاتِ اقبال	علامہ اقبال	۱۲/-
کلام حفیظ	حفیظ جالندھری	۱۰/-
کلیاتِ فانی	فانی بدایونی	۱۲/-
الفاروق	شبلی نعمانی	۱۰/-
غبارِ خاطر	مولانا آزاد	۱۲/-
تاریخ عرب	سر سید احمد	۸/-
کلیاتِ شکیل	شکیل بدایونی	۸/-
کلیاتِ فیض	فیض احمد فیض	۸/-
کلیاتِ جگر	جگر مرادآبادی	۱۰/-
بت تراش	یاقوتہ رحمان	۲۰/-
شمس و قمر	رضیہ بٹ	۶/۵۰
مریم	〃	۱۲/-
امانت	سلمیٰ کنول	۱۰/-
دشمن دامن	〃	۱۵/
سوکھے پتے	حمیدہ جبیں	۱۲/-